# رفقائے عظیم

یعنی

بعض مشاہیر عالم کے ناقدانہ تذکرے

مصنف

میکس ایسٹ مین

مترجم

(پروفیسر) محمد حامی الدین خاں ایم۔اے (علیگ)


اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

کراچی

First Edition This is an authorised Urdu translation
of "Great Companions" by Max Eastman
Copy right C 1942, 1959, by Max Eastman,
published by Farrar, Straus and Cudahy, New York

ناشر
سیّد الطاف علی بریلوی ڈائرکٹر اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
سعیدہ منزل۔ ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی
بہ اشتراک
موسّسۂ مطبوعات فرینکلن لاہور نیویارک



طابع
جاوید پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی



باراوّل سنہ ۱۹۶۳ء ———— تعداد۔ ایک ہزار
قیمت فی جلد Rs. 20

# فہرست مضامین

# تشریح

لفظ رفیق (ساتھی) کے معنی میں دوستانہ جذبات کی ایک ایسی لہر کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے جو عموماً دو سمت سے بہتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دو شخص کافی فاصلہ ساتھ ساتھ طے کر چکے ہیں یا زیادہ صحتِ لفظی کے ساتھ لیکن مفہوم کی ہمہ گیری کم کرتے ہوئے یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُن تمام مشاہیر کا جن کے حالات اس کتاب میں قلمبند کیئے گئے ہیں۔ باستثنائے ایک کے میں ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا ہوں یا کم از کم چائے اور بسکٹ کی خورد و نوش میں اُن کا شریک رہا ہوں۔ ان میں سے بعض میرے گہرے دوست رہے ہیں لیکن "رفقائے عظیم" سے میرا مفہوم یہ نہیں ہے۔ دراصل مجھے یہ الفاظ والٹ وہٹمین ( ) کی نظم شاہراہِ عام کا گیت" ( ) میں ملے۔ اقتباس"، ایلیمن۔

عظیم رفقا کے پیچھے چلو اور اُن سے رشتہ جوڑو، وہ بھی شاہراہ عام کے راہی ہیں، وہ تیز رفتار اور پر شکوہ مرد ہیں۔ وہ عظیم المرتبت خواتین ہیں"

اس اقتباس کا مفہوم یہ تو نہیں ہے کہ راہ و رسم دو طرفہ ہونا ضروری ہے؟

# تشریح

لفظ رفیق (ساتھی) کے معنی میں دوستانہ جذبات کی ایک ایسی لہر کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے جو عموماً دو سمت سے بہتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دو شخص کافی فاصلہ ساتھ ساتھ طے کر چکے ہیں یا زیادہ صحتِ لفظی کے ساتھ لیکن مفہوم کی ہمہ گیری کم کرتے ہوئے یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُن تمام مشاہیر کا جن کے حالات اس کتاب میں قلمبند کیئے گئے ہیں۔ باستثنائے ایک کے میں ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا ہوں یا کم از کم چائے اور بسکٹ کی خورد و نوش میں اُن کا شریک رہا ہوں۔ ان میں سے بعض میرے گہرے دوست رہے ہیں لیکن "رفقائے عظیم" سے میرا مفہوم یہ نہیں ہے۔ دراصل مجھے یہ الفاظ والٹ وٹمین کی نظم "شاہراہِ عام کا گیت" (                    ) میں ملے۔ اقتباس"، اپلیٹسن۔

عظیم رفقا کے پیچھے چلو اور اُن سے رشتہ جوڑو، وہ بھی شاہراہ عام کے راہی ہیں وہ تیز رفتار اور پر شکوہ مرد ہیں۔ وہ عظیم المرتبت خواتین ہیں۔"

اس اقتباس کا مفہوم یہ تو نہیں ہے کہ راہ و رسم دو طرفہ ہونا ضروری ہے؟

یہ اپنے ایسے ہمعصروں کے حالات بیان کرنے کا ایک انداز ہے جن سے ایک شخص واقف رہا ہو اور اُن کا بڑا مداح بھی ہو۔ مجھے طبعاً بڑے لوگوں کی مدّاحی پسند ہے۔ نو عمری میں میری بطل پرستی حد سے متجاوز ہو گئی تھی۔ اگر آپ مجھے صرف یہ اطلاع دیدیتے کہ فلاں شخص ایک عظیم شخصیت رکھتا ہے خواہ وہ شاعر ہوتا یا فٹ بال کا کھلاڑی تو میں اس کی تصویر اپنی خوابگاہ کی دیواروں پر لگا لیتا۔ مجھے خیال ہے کہ یہ اس لیئے نہ ہوتا تھا کہ میں اُس جیسا بننا چاہتا تھا بلکہ محض جامد اور بے مقصد ستائش کے طور پر ہوتا تھا۔ میں اب بھی موزارٹ (  ) کا ایک چھوٹا سا سفید پلاسٹر کا بنا ہوا نیم مجسمہ اپنی میز پر دیکھتا ہوں۔ وہ ایک "عظیم نغمہ نگار" تھا اور میں اس وقت اتنی لیاقت بھی نہ رکھتا تھا کہ اُس کے نغمے اور گھٹیا راگ میں تمیز کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے مجھے برگزیدہ اشخاص کی پرستش کے فن میں مہارت دی تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے اس جستجو میں دلچسپی ہو گئی کہ میں خود باوجود اپنے عجز و انکسار کے کیا بن سکتا تھا۔ میں اب بھی اپنے برگزیدہ قائدین کی مدح میں مسرّت محسوس کرتا ہوں لیکن اب میں نے اُنھیں تنقیدی نظر سے دیکھنا اور اُن کے حالات زیادہ مرعوب ہوئے بغیر بیان کرنا سیکھ لیا ہے۔

یہ امر معنی خیز ہے کہ والٹ وہیٹمین اپنی نظم کے مذکورہ بند کے اختتام سے پہلے ہی اپنے رفقائے عظیم میں ہر اُس شخص کو شامل کر لیتا ہے جو زندہ دلی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی زندگی بسر کرنا بلاشبہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ مفہوم ضرور نکلتا ہے کہ برگزیدہ اشخاص معمولی اشخاص سے یا

اُس سے جو معمولی اشخاص میں مضمر ہوتا ہے زیادہ مختلف نہیں ہوتے
میرے نزدیک ایسے شخص کے لئے جس میں مدّاحی کا مادّہ عیب کی حد تک
ہو جیسا کہ میرے اندر سمجھا جاتا تھا۔ مذکورہ قول یقیناً یاد رکھنے کے قابل ہے
میں اس جیسی کتاب اپنے بہت سے ایسے دوستوں کے بارے میں لکھ سکتا
تھا جنھوں نے کبھی اس سے زیادہ کوئی کامیابی حاصل نہ کی ہوتی کہ وہ
زندہ دلی کی زندگی بسر کر سکتے تھے اور تاریخ میں اُن کے نام کا باقی رہنا
ممکن نہ ہوتا۔ لیکن ایسی صورت میں دُنیوی شان و شوکت جس سے میں
بہت اثر لیتا ہوں کتاب میں موجود نہ ہوتی اور میرے ذاتی دنیوی
حوصلے بھی طاقِ نسیاں کے سپرد ہو جاتے۔ میں نے جو اِن یادگار
لفظی مرقعوں کی تیاری میں کوشش کی ہے اُس کی اچھی خاصی تعریف
یہ ہو سکتی ہے کہ میں نے "رفقائے عظیم" سے رشتہ جوڑنے یا (اس سے بہتر
الفاظ میں) اُن کا شریک حال بننے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام اتنا مشکل
نہیں ہے جتنا اپنی ذات کو کسی خاص مرتبہ تک پہونچانے کی کوشش
کرنا۔

# تعارف

اس کتاب کا مصنف میکس فوریسٹر ایسٹ مین Max Farrester Eastman. بجا طور پر ہمہ گیر ذہن و دماغ کا مالک کہا جاسکتا ہے۔ یہ شخص شاعر بھی ہے اور نثر نگار بھی۔ نظم و نثر میں اس کی تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس نے روسی زبان سے انگریزی میں کتابیں اور مضامین منتقل کرنے کا کام بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مقرر بھی ہے۔ چارلی چیپلن جیسا شہرۂ آفاق ایکٹر اور افسانہ نگار اس کی تقریر سے متاثر ہو کر اس سے ملنے کا خواہشمند ہوا تھا۔ سیاست سے اس کے شغف کا یہ عالم تھا کہ سنہ ۱۹۱۷ء میں بغاوت انگیز مضامین لکھنے کے الزام میں امریکی حکومت کی جانب سے اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کے رسالہ "ماسیز" (Masses) کا اجرا بند کیا گیا کیونکہ اس وقت وہ روسی انقلاب کا حامی اور اشتراکیت پسند تھا اور امریکی حکومت اشتراکیت پسندوں کو مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی۔

اس کی پیدائش سنہ ۱۸۸۳ء میں نیویارک اسٹیٹ کے موضع کینڈیگا Canahddiga ہوئی۔ اس کے والد اور والدہ دونوں باضابطہ پادری تھے۔ والدہ اپنی غیر معمولی ذہانت کے لئے ملک بھر میں مشہور تھی۔ والدہ کے فیضان تربیت کا وہ بہت مداح ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء

میں ولیمس کالج سے اس نے گریجوایٹ کی ڈگری حاصل کی اور مزید تعلیم کے لئے کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانہ میں اس نے عورتوں کے حق رائے دہندگی کی حمایت میں پہلی "مردوں کی انجمن" کی بنیاد ڈالی۔ مسلک کے اعتبار سے وہ اس کشمکش کی پیداوار ہے جو ایک عرصہ سے مغرب میں مذہب اور علم وعقل کے درمیان جاری ہے۔ اس کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ اس کا رجحان مذہب کی جانب سے قطعاً ہٹ گیا ہے اور وہ خالص عقل پرست ہے لیکن پسندیدہ اخلاق کا وہ گرویدہ ہے۔ اس نے اپنے دوست یوجین کے یہاں اس لئے جانا ترک کردیا کہ وہاں جانے سے اسے زیادہ شراب پینے کی ترغیب ہوتی تھی۔ اسے ریاکاری بالکل پسند نہ تھی۔ ڈاکٹر سنتیاین پر اسے یہ اعتراض تھا کہ خدا پر یقین نہ رکھنے کے باوجود وہ رومن کیتھولک چرچ کی جملہ رسوم ادا کرتا تھا۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت بے لاگ صاف گوئی ہے۔ اس نے ایک کتاب "لطفِ حیات" Enjoyment of Living. ۱۹۴۳ء میں لکھی جس میں اس کی زندگی کے ابتدائی تینتیس سال کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب میں جس صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ کتاب زیر نظر کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس نے اپنے عظیم رفقا کی کمزوریوں کی کتنی بیباکی سے نشاں دہی کی ہے۔

اس کی سب سے زیادہ کامیاب کتاب "لطف شعر وسخن" (Enjoyment of Poetry.) ہے جو ۱۹۱۳ء میں شایع ہوئی۔ یہ کتاب امریکہ کے بہت سے اسکولوں اور کالجوں میں ایک نصابی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے ۱۹۱۳ء میں اس کی دوسری کتاب "امیزن کا بچہ" (Child of Amazon.) شایع ہوئی اس نے

ایک فلمی کہانی بھی مرتب کی جس کا نام "زار سے لینن تک" (From Czar to Lenin) ہے۔ وہ اسٹیلن کے بالکل خلاف تھا اور مارکس ازم کو ایک غیر سائنسی مسلک اور مکمل اجتماعیت کو ایک ناکامیاب نظام سمجھتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً وہ روسی انقلاب کے زبردست حامیوں میں تھا۔ ۱۹۱۶ء میں اس نے اپنی دو تصانیف شائع کیں۔ ایک "اخبار نویسی اور فن کا تقابل" Journalism Versus Art. اور دوسری تفہیم جرمنی Understanding of Germany. ) ۱۹۱۸ء میں ایک نظم کی کتاب "رنگہائے زندگی" (Colours of Life. ) کے نام سے شایع کی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں اس کی مشہور منظوم کتاب "بذلہ سنجی" (Sense of Humour.) شائع ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں اس نے دو کتابیں "لینن کی وفات کے بعد" (Since Lenin died.) اور "لیون ٹراٹسکی" شائع کیں۔ ۱۹۲۶ء میں ایک ناول جس کا نام "مہم" (Adventure. ) ہے شایع کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایک نظم کی کتاب "اقسامِ محبت" (Kinds of Love. ) اور "ادبی دماغ" The Literary Mind. شائع ہوئیں۔ ۱۹۳۴ء میں دیگر دو کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام ہیں "فنکاران باوردی" (Artists in Uniform.) اور "فن اور فعالی زندگی" (Artists in Life of action) ۱۹۳۶ء میں اس کی دوسری نہایت مقبول کتاب "لطف تبسم" (Enjoyment of Laughter. ) شائع ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں "عظیم شخصیتیں جن سے میں ملا" (The Heroes I have known ) شائع ہوئی اور زیرِ نظر کتاب رفقائے عظیم (Great Companions.) جس کا ترجمہ اردو میں اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس شائع کر رہی ہے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

کتاب رفقائے عظیم بارہ نہایت عظیم المرتبت اشخاص کے سوانح حیات پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے بمصنف میکس ایسٹ مین کے بیان کے مطابق یہ مضامین کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں ریڈرس ڈائجیسٹ (Readers Digest.) اور بعض دیگر کتابوں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مصنف نے جن عظیم ہستیوں کے حالات پر مذکورہ مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کچھ احوال بطور تعارف سلسلہ وار درج ذیل ہے۔ سب سے پہلے مصنّف ای۔ ڈبلو اسکرپس (E. W. Cripps.) سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتا ہے۔ یہ کتاب کا پہلا باب ہے۔ اس میں اس نے بتایا ہے کہ مسٹر کرپس ایک معمولی حیثیت کے جرنلسٹ سے ترقی کر کے کروڑپتی کیسے بن گیا۔ اسکرپس نے اپنا پہلا اخبار ۱۸۷۳ء میں اپنے بھائی جارج سے کچھ رقم قرض لے کر نکالا تھا۔ اس کے کروڑپتی بننے کے اسباب میں مُصنّف تین باتیں خاص طور پر بیان کرتا ہے۔ اول اس کی غیر معمولی ذہنی استعداد دوم شروع ہی سے اپنا مقصد زندگی متعین کر لینا۔ سوم امریکی زندگی کے خاص حالات اس کی غیر معمولی ذہانت کے ثبوت میں مصنّف اس کی وہ ہدایتیں نقل کرتا ہے جو وہ اپنے ماتحتوں کو لکھ کر بھیجا کرتا تھا۔ ان میں سے تین نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں:۔

(۱) چالاکی اور مکر سے ایک شخص اپنے آپ کو پرخلوص اور خوش معاملہ ظاہر کر سکتا ہے لیکن یہ کام نہایت مشکل۔ محنت طلب اور خطرناک ہے۔

(۲) کسی سے نفرت نہ کرو کیونکہ نفرت کرنا اپنی دماغی اور اعصابی قوت کا بیکار صرف کرنا ہے۔

(۳) جتنا کام تم دوسروں سے لے سکتے ہو ضرور لو کیونکہ اس طرح اس کام کے لئے

جو تمھارے واسطے کوئی دیگر شخص نہیں کر سکتا۔ تمھیں زیادہ وقت مل جائے گا۔ اور تم اسے زیادہ قوت کے ساتھ کر سکو گے۔

دوسرے باب میں آئنسٹین سے مصنف کی تین ملاقاتوں کا ذکر ہے مصنف نے آئنسٹین کے بارے میں یہ سنا تھا کہ اگرچہ وہ انسانی شکل یا انسانی اوصاف رکھنے والے خدا پر یقین نہیں رکھتا پھر بھی وہ اپنے آپ کو ایک مذہبی انسان خیال کرتا ہے چنانچہ ان کی پہلی ملاقات میں اسی موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ مصنف نے آئنسٹین سے کہا "میرے خیال میں آپ کا اپنے آپ کو مذہبی کہنا غلط ہے۔ مذہب کا لفظ صرف اس عقیدے پر یقین رکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ خارجی دنیا میں کسی ایسی ہستی کا وجود ہے جو انسانی مفادات سے ہمدردی رکھتی ہے۔ آئنسٹین نے اسے تسلیم کر لیا لیکن کہا کہ مذہب اس سے اعلیٰ قسم کا بھی ہے جس میں خوف نہیں ہوتا اور اسے اخلاقیات سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ "وہ ہمہ گیر ہستی کی طرف عجز و انکسار کا ایک انداز ہے"۔ اس نے دعوےٰ کیا کہ کیپلر اور نیوٹن بھی اسی قسم کا مذہب رکھتے تھے۔ دوسری بات جو زیر بحث آئی وہ علت و معلول کا سلسلہ ہمہ گیر ہے اور انسان ہر اعتبار سے خارجی قوتوں کا پابند ہے۔ مصنف نے اس کے متعلق کہا "اگرچہ یہ اصول سائنسی تجربات میں ترک نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر اس کی عمومیت ہمہ گیر تصوّر کر لی جائے تو تمام سائنٹفک فیصلوں کی "صحت" ختم ہو جاتی ہے۔ اگر انسانی دماغ اسباب ماقبل سے مجبور ہو کر کسی فیصلہ پر پہنچتا ہے تو وہ فیصلہ ان معقول دلائل پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا جس پر اس کا مبنی ہونا فرض کیا گیا ہے"۔ اس بحث سے استفادہ کرنے کے لئے متن کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

دوسری ملاقات مذکورہ بحث جاری رکھنے کے لئے ہی کی گئی تھی۔ تیسری ملاقات میں سیاسیات پر گفتگو رہی۔ اس کے سیاسی خیالات کے متعلق مصنف لکھتا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں وہ ظالم ہٹلر کو فوجی قوت کے ذریعہ زیر کرنے کا حامی تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں اسٹیلن کی ظالمانہ آمریت کے بچاؤ کے لئے ہم اسے ہر وقت تیار پاتے ہیں۔ اسٹیلن کے زیادہ سخت اور اذیت رساں ظلم کے خلاف جو حملہ بھی ہوتا تھا آئیسٹن اس کی تردید کرتا تھا یا اسے ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ آئیسٹن کے خیال میں (اگرچہ یہ خیال غلط تھا) سویٹ روس نے ہٹلر کو شکست دے کر گویا یہودیوں کو اس کے ظلم سے نجات دلائی تھی۔ اس واقعہ سے مصنف ایک اخلاقی اصول اخذ کرتا ہے "ایک قطعی منطقی دماغ میں جیسا کہ آئیسٹین کا تھا مذکورہ قسم کے متعصبانہ جذبہ کا پیدا ہونا مجھے اور ان سب کو جو بطل پرستی کی جانب مائل ہیں یہ عبرت انگیز سبق دیتا ہے کہ عظیم سے عظیم شخصیت کی مدح میں ہمیں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ ہر شخص کی بحیثیت ایک فرد کے عزت کرنا مناسب ہے لیکن اسے دیوتا کا درجہ دینا زیبا نہیں ہے"

تیسرے باب میں ارنیسٹ ہیمنگ وے .Ernest Hemingway) کی خوبیوں اور خامیوں کا بیان ہے۔ مصنف ہیمنگ وے کو ایک عظیم انشاپرداز سمجھتا ہے۔ اس کی نمایاں ترین خصوصیت مصنف کے خیال میں اس کی بےباکانہ صاف گوئی اور واقعہ نگاری ہے۔ اس کی حیرت انگیز ترقی کا راز مصنف کے نزدیک اس کا غیر معمولی حافظہ تھا جس کی بدولت وہ ایک اخبار نویس کے مرتبہ سے ترقی کر کے تین سال کے قلیل عرصہ میں اعلیٰ درجہ کا انشاپرداز اور شاعر بن گیا۔ اس کی پہلی تصنیف

"چشموں کی تیز دھاریں" (Torrents of Spring.) ہے۔ اس کی دیگر تصانیف جن کا مصنف نے ذکر کیا ہے یہ ہیں "ہمارے وقت میں" In Our Time.) "سہ پہر کی موت" (Death in the Afternoon.) "سورج بھی طلوع ہوتا ہے" (The Sun also Rises.) اور "پیر مرد اور سمندر" (The Old Man and the Sea.)

"سہ پہر کی موت" نامی کتاب میں ہیمنگ وے نے سانڈوں کی لڑائی کو جو اسپین میں تفریحاً کرائی جاتی تھی بڑے لطف سے بیان کیا ہے مصنف نے اس کے جواب میں ایک مضمون لکھا جس کا نام "سہ پہر کا سانڈ" .Bull in the Afternoon رکھا اس مضمون کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایک ایسے فعل کو جس میں بے زبان جانوروں کے ساتھ بے رحمی برتی جاتی ہے تفریح سمجھنا اور اسے مزے لے لے کر بیان کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسی مضمون کے شایع ہونے پر مصنف اور ہیمنگ وے کے درمیان کشیدگی اور بدمزگی پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک موقع پر دست و پاسے باہمی جنگ کی نوبت پہونچی۔ اگرچہ اس جنگ میں مضروب کوئی نہیں ہوا لیکن اخباروں میں اس واقعہ کے متعلق بیانات عرصہ تک نکلتے رہے۔ اس باب کا باقی حصہ ان ہی بیانات اور حالات کے تذکرے سے پر ہے۔ اس باب میں ضمناً جرٹروڈ اسٹین (Gertrude Stein.) کا ذکر بھی آیا ہے جو ایک مشہور انشا پرداز خاتون ہیں اور جن کا دعوےٰ تھا کہ ہیمنگ وے کی انشا پردازی ان کے فیضان کی مرہون منت تھی لیکن مصنف کے نزدیک خاتون موصوف کا یہ دعوےٰ صحیح نہیں ہے۔

باب چہارم میں مصنف کی ایڈنا ملے (Edna Milley.!) سے دوستی کا بیان ہے۔ امریکی شعرا میں ایڈنا ملے کا بڑا مرتبہ ہے۔ طامس ہارڈی (Thomas Hardy.) کا قول ہے کہ امریکہ کی فلک بوس عمارتوں کے علاوہ میں وہاں کی جس چیز کا سب سے زیادہ مداح ہوں وہ ایڈنا ملے کی شاعری ہے اور مصنف بھی اس رائے سے قطعی متفق ہے۔ ایڈنا ملے کی کتاب "نسل انسانی کا کتبۂ مزار" (Epitaph of the Race of Man.!) کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے۔ اس کتاب کی معنوی عظمت و شوکت نیز اس کی فصاحت بے مثل ہے امریکی علم ادب میں کوئی چیز اس کے مقابل مجھے نظر نہیں آتی۔ اگرچہ یہ مختصر ہے لیکن ملٹن کے بعد انگریزی زبان میں تنہا یہی نظم اس مرتبہ کی ہے جس کا مقابلہ ڈینٹے اور لکریٹی اس (Dante and Lucretius.) کی نظموں سے کیا جاسکتا ہے۔" اس کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے "اس کا علم قوانین فطرت" زبان اور ہر اس چیز کے متعلق جو اس کے فن سے تعلق رکھتی تھی اتنا وسیع تھا کہ میں اکثر اس کے اظہار کے موقعوں پر حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔ فکری بلندی یا عقلیت کی کمی جسے جان کرو وریزم (John Crow Ransom.!) نے اس سے منسوب کیا ہے۔ اس کی شاعری میں قطعی نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک ایڈنا ملے ذہنی اور اخلاقی نظم وضبط کی جانب زیادہ مائل ہے۔ وہ درسگاہ کی ایک استانی جیسی خصلت رکھتی ہے۔ اور اس کے اسی وصف نے اس سے محبت کرنے کے میرے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔" اس کی تصنیف "سیکنڈ اپریل" کے بارے میں مصنّف کہتا ہے کہ اسے پڑھ کر ایڈنا کی عظیم شہرت کا سبب میری سمجھ میں آگیا اس کی ایک

اور کتاب "برف میں ہرنی" (The Buck in the Snow.) کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ یہ ہماری زبان کی بہترین غنائی نظموں میں سے ایک ہے۔ زیست اور موت کی اس میں جو تصویر کشی کی گئی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی اس کی سانٹ[1] "مہلک ملاقات" (Fatal Interview.) کو اس نے کلاسیکی نظم کہا ہے۔ ایڈنا ملے کی تصنیف "تیروں کو چمکاؤ" (Make Bright the Arrows.) کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے۔ یہ کتاب ایڈنا ملے نے عالمی جنگ دوم کے نازک موقع پر لوگوں کو جنگ کے لئے تیار کرنے کی غرض سے لکھی تھی۔ یہ چیز ایڈنا کی عظیم حب الوطنی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ایڈنا نے جنگ کو مقبول بنانے کے لئے پروپیگنڈے کے طور پر نظمیں لکھیں۔ ایک اعلیٰ معیار کے شاعر کا اس قسم کی شاعری کرنا بہت بڑے ایثار کا کام ہے۔ مصنف کے نزدیک اس قسم کی شاعری سے ایڈنا کی اعلیٰ قسم کی شاعری کرنے کی استعداد کو بہت نقصان پہونچا۔ ایڈنا کی سیرت پر مزید روشنی اس واقعہ سے پڑتی ہے کہ اس نے "امریکی شعرا کی اکیڈیمی" سے پانچ ہزار ڈالر سالانہ کا وظیفہ صرف اس وجہ سے لینا قبول نہیں کیا کہ وہ اکیڈیمی کے قواعد کو کسی قدر سخت سمجھتی تھی۔ حالانکہ روپیہ کی اسے اس زمانہ میں اس کے شوہر کی وفات ہو جانے کے باعث سخت ضرورت تھی۔ مصنف کے نزدیک اس واقعہ سے ایڈنا ملے کی اصول پرستی اور اس کی طبیعت کی ضد کا اظہار ہوتا ہے۔

پانچویں باب میں جارج سنتیاین (George Santayana.) کا بیان ہے۔ سنتیاین امریکہ کے عظیم ترین فلاسفروں میں سے ایک ہے۔ دوسرے دو جان ڈیوی اور ولیم جیمس ہیں۔ مصنف کہتا ہے کہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جارج

[1] انگریزی نظم کی ایک قسم جس میں ۱۴ مصرعے ہوتے ہیں۔

سنتیاین کی تصانیف پڑھ کر اس کے اس خیال کو تقویت حاصل ہوئی کہ یونانی فکر چرچ (گرجا) کی فکر سے بہتر ہے۔ اس کی پہلی کتاب جو مصنف نے پڑھی ہیں محبّت کا اعلےٰ معیار یہ دکھایا گیا ہے کہ محبت کرنے والا محبوب تک کبھی نہ پہونچ سکے اور اسے نہ چھو سکے۔ اس کتاب کا نام شاعری اور مذہب ہے۔ اس کے بعد سنتیاین نے ۲۹ کتابیں اپنے فلسفہ کی توضیح و تشریح کے لئے اور لکھیں۔ سنتیاین کے لکھنے کا انداز اتنا حسین ہے کہ مصنف اس کا گرویدہ ہو گیا حالانکہ کتابوں کے مطلب و مقصد سے اسے اتفاق نہ تھا۔ سنتیاین اگرچہ بحیثیت ایک فلاسفر کے مادیت کا قائل تھا لیکن کیتھولک چرچ کے رسوم اور رواجوں سے محبت رکھتا تھا۔ وہ کیتھولک مذہب کے غیر مدلل عقاید کو بھی پسند کرتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ حقیقت نہ تھے لیکن وہ ان اعلیٰ تصوّرات کا اس طرح اظہار کرتے تھے جن کی انسانی روح کو اس مادی دُنیا میں وقت گزارنے کے لیئے ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی مشہور کتابیں جن کا مُصنّف نے ذکر کیا ہے۔ یہ ہیں "حیاتِ عقلی" ( The Life of Reason. ) اس میں اخلاقیات کی بنیاد فطری جذبہ پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ بات اس وقت امریکی طرزِ فکر میں انقلاب انگیز سمجھی جاتی تھی۔ اس کی دوسری معرکۃ آرا کتاب "اقالیم وجود" ( The Realms of Being. ) ہے جس کی بنیاد جوہر یا روح کے عقیدہ پر ہے۔ تیسری کتاب "اقتدارات و اختیارات" Domination and Powers سنتیاین کے سیاسی تخیلات پر مبنی ہے۔ وہ تسلیم کرتا تھا کہ تمام مذہب اور اس کی رسوم انسانی تخیُّل کی پیداوار ہیں لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ انسانی تخیُّل کی پیداوار ہونے کے باعث وہ مذموم نہیں ہیں بلکہ مستحسن ہیں اور ان کے مقابلہ میں حقیقی دُنیا قطعی بے کیف و

بے لطف ہے۔ اس نے دو سوانح عمریاں لکھی ہیں"۔ اشخاص و مقامات Persons and Places. "اور درمیانی وقفہ" (The Middle Span.) اور ایک ناول جس کا نام "آخری پیوریٹن" (The Last. Puritan.) ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب "معاشری عقل" (Reason in Society.) ہے جس میں عشق و محبت کا بیان ہے۔

باب ششم میں پیبلو کیسلس (Pable Casals.) کی سحر کاریوں کا ذکر ہے۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ کیسلس دنیا کا عظیم ترین چیلو نواز ہے مصنف نے سنہ ۱۹۵۲ء میں اسے چیلو بجاتے سنا جبکہ کیسلس کی عمر ۷۰ سال کی تھی اور اس کا جسم بہت کمزور ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی چیلو نوازی پر اس کی ضعیف العمری کا کوئی اثر نہ تھا بلکہ اس کا بجانا پہلے سے زیادہ موثر تھا۔

باب ہشتم میں ان مشکلات کا ذکر ہے جو مصنف کو ٹراٹسکی (Trotsky.) کے ساتھ دوستی قائم رکھنے میں پیش آئیں۔ مصنف کہتا ہے کہ ان تمام مشہور اشخاص میں جن سے مجھے واقفیت ہے ٹراٹسکی کو میں نے سب سے زیادہ سادہ مزاج اور خود فراموش پایا۔ وہ کبھی اپنے یا اپنے کمالات کے بارے میں زبان نہیں کھولتا تھا۔ گفتگو کرنے میں وہ مخاطب کو بولنے کا موقع دیتا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ٹراٹسکی کے بارے میں لینن Lenin نے اپنی پارٹی کو آگاہ کیا تھا کہ وہ ٹراٹسکی کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی سے خبردار رہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ ٹراٹسکی کی کمزوری یہ تھی کہ جب اس کے یقینِ محکم کو کسی معاملہ میں دھکا پہونچتا تھا تو اس سے وہ بدحواس ہو جاتا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ شک و شبہ کو کس طرح برداشت کیا جاتا ہے مصنف

رفقائے عظیم

نے ٹراٹسکی کی کتاب "روسی انقلاب کی تاریخ" History of the Russian Revolution. کا ترجمہ کیا ہے جس سے اسے پتہ چلا کہ ٹراٹسکی اپنے اور لینن کے سوا کسی دیگر بالشویک کی رائے کو اہمیت نہیں دیتا۔ روس میں ٹراٹسکی کے رہنے کا مکان آسائشوں سے اتنا معرا تھا کہ جب مصنف وہاں قیام پذیر ہوا تو اسے کوئی آرام نہیں ملا جس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ٹراٹسکی اور اس کی بیوی دونوں میں خوش ذوقی نہ تھی۔ مصنف کو بعض معاملات سے متعلق ٹراٹسکی کے برتاؤ میں یہ نقص نظر آیا کہ اس نے مصنف کے مفادات کو خود غرضانہ طور پر نظر انداز کر دیا جب کہ مصنف نے کئی موقعوں پر اس کی امداد پر خلوص طور پر کی تھی۔ لیکن آخر میں مصنف اس تشریح کا اضافہ کرتا ہے کہ خود اس نے ٹراٹسکی کے عقیدوں کے خلاف بے تال بہت سی دلیلیں پیش کر دی تھیں اور اس امر کا لحاظ نہ رکھا تھا کہ ان سے اسے کتنی کوفت ہوگی۔ غالباً اسی وجہ سے ٹراٹسکی نے اس کے مفادات کی جانب بے اعتنائی کی ہوگی

باب ششم سگمنڈ فرائڈ کے نظریات اور ان سے مصنف کے اختلاف کے بارے میں ہے۔ فرائڈ ۱۸۵۶ء میں آسٹریلیا میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۲ء کے بعد وہ اعصابی امراض کا معالج بن گیا۔ لیکن سائنسی تحقیق میں اس کی دلچسپی بڑھی ہوئی تھی۔ ۱۹۰۲ء تک اس نے تحلیل نفسی (Psycho - Analysis.) پر کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھ دیں۔ ۱۹۱۰ء میں تحلیل نفسی سے متعلق پہلی بین الاقوامی ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ امریکہ میں فرائڈ کا داعی (Apostle.) ڈاکٹر اسمتھ جلیفٹ (Dr. Smith Ely Geliffe.) تھا۔ اس کے مشورہ سے مصنف نے فرائڈ کی کل تصنیفات پڑھیں اور ۱۹۱۵ء میں اس کے علاج کے اصولوں اور طریقوں سے متعلق ایک مضمون مصنف نے

ایوری ڈے میگزین (Everyday Magazine.) میں شایع کرایا اس طرح فرائیڈ سے ملنے کا اسے اشتیاق ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جب وہ وانا پہونچا تو فرائیڈ سے ملنے گیا۔ مصنف کو فرائیڈ کے ان خیالات سے جو وہ لاشعور کے متعلق رکھتا تھا اختلاف تھا۔ لہذا جب ان کی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تو مصنف نے بلا تامل یہ سوال پیش کر دیا:۔

"ایک بات ہے جو میں آپ سے پوچھنے کی عرصے سے خواہش رکھتا ہوں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ لاشعور کا ذکر ایک موجود شے کی حیثیت سے کیوں کرتے ہیں۔ جب ہم لاشعوری کی حالت میں ہوتے ہیں تو صرف ہمارا دماغ اور جسم باقی رہتا ہے۔ اس لئے اگر آپ لاشعور کا دماغ کی صفت کے طور پر ذکر کریں تو معاملہ بالکل صاف ہو جائے۔ لاشعور کو اسم کی حیثیت سے استعمال کرنے کے بجائے اسے بطور صفت استعمال کرنا یعنی "دماغ کی حالت لاشعور" کہنا صحیح ہوگا"

فرائڈ نے اس کا جواب دیا کہ لاشعور کوئی شے نہیں ہے بلکہ ایک تصور ہے جسے اپنے شعبۂ معالجات کے لئے ہم لازمی سمجھتے ہیں۔ مصنف نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "لاشعور کا تصور" ایک ایسا جزو جملہ (Phase) ہے جس کے معنی مشتبہ ہیں اور اس سے فرائیڈ کی طبیعت کے سائنسی رجحان اور افسانہ گوئی کے رجحان کے اندرونی تصادم کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے جتنی زیادہ فرائیڈ سے واقفیت ہوتی گئی اتنا ہی زیادہ اس تصادم کا پتہ چلتا گیا۔ ڈاکٹر جونس (Dr. Jones) جس نے فرائیڈ کے سوانح حیات پر چار جلدوں پر مشتمل ایک بلند پایہ

کتاب لکھی ہے۔اس قسم کے اعتراضوں کا جیسے میں نے کیے ہیں۔ یہ جواب دیتا ہے کہ اگر معترضین لاشعور کے متعلق فرائیڈ کی جملہ تصنیفات کو پڑھ لیں تو انھیں اپنے اعتراضات کا کافی وشافی جواب مل جائے گا۔ لیکن مصنف کہتا ہے:۔

"میں نے فرائیڈ کی کتابوں سے وہ سب پڑھ لیا جو اس نے لاشعور کے بارے میں لکھا ہے پھر بھی میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور میرا اعتراض بدستور قایم رہا"

مُصنّف کی رائے میں اگرچہ فرائیڈ نے عِلمِ نفسیات پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس سے عِلمِ نفسیات میں گراں قدر معلومات کا اضافہ ہوا ہے تاہم اسے سائینس کا حقیقی آدمی (True Man of Science.) نہیں کہا جا سکتا۔

اس باب کے آخر میں مصنّف نے ایک فٹ نوٹ دیا ہے جس میں درج ہے کہ فرائیڈ لاشعور کی اقلیم کا موجد نہیں ہے۔ ایڈورڈ فون ہوف مین (Edward Von Hoffman.) نے ۱۸۶۹ء میں ایک کتاب موسوم بہ "فلسفۂ لاشعور" (The Philosophy of Unconscious.) شایع کی تھی جس کے ذریعہ فرائیڈ اور تمام جرمن مفکرین کو اس تصور سے واقفیت ہو گئی تھی۔

باب نہم کا عنوان "دو۔ برٹرینڈ رسل" ہے مصنف نے برٹرینڈ رسل کا تعارف اس مضمون میں اس طرح کرایا ہے:۔

"موجودہ بڑے اشخاص کی تصانیف میں برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel.) کی تصانیف سب سے زیادہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ جارج سنتیاین نے اسے اپنے سوانح حیات کی آخری جلد میں ایسی خداداد

قابلیت کا انسان بتایا ہے جس کی مثال اسے کہیں اور نہیں ملی "۔

"اس کا خاندان عالی ہے۔ بنوغ علم جوش و جذبۂ عظیم استعداد عمل روشن دماغی اور مکمل ایمانداری اور جرأت کے اوصاف کا وہ مالک ہے۔ عدل و انصاف کا وہ ایسا ہی گرویدہ ہے جیسا ظرافت کا۔ اس کو ریاضی علوم طبعی اور تاریخ میں ید طولیٰ حاصل ہے وہ تمام اہم زبانوں سے واقف ہے اور دنیائے سیاست اور دُنیائے ادب کے تمام حالیہ امور سے بہت اچھی آگاہی رکھتا ہے"۔

اس کے بعد سنتیاین نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ بحیثیت ایک عظیم مفکر کے رسل خود بخود ناکامیاب ہو چکا ہے"۔ اور مصنف سے بحث کے دوران سنتیاین نے یہ بھی کہا:۔

"غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ساتھ رسل میں بے وقوفی کی بھی ایک رمق موجود ہے"

برٹرنیڈ رسل کی طبیعت کی اس دو رُخی کیفیت کا اظہار انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں اس طرح کیا گیا ہے:۔

"وہ طبیعتاً مایوسی میں مبتلا رہتا ہے۔ سخت انتہا پسند ہے دُنیا کے واقعات پر تقریباً معاندانہ تنقید کرتا ہے"۔

لیکن ساتھ ہی جب مشکل ترین موضوع پر یعنی "علم" پر ایک مضمون لکھانے کی ضرورت پیش آئی تو انسائیکلو پیڈیا کے کارپردازوں نے برٹرنیڈ رسل ہی کو اس کے لکھنے کے لئے پسند کیا۔

مُصنف نے برٹرنیڈ رسل کی سیاسی ژرف نگاہی کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب رسل سویٹ روس گیا تو وہ نہایت تیزی سے اس فیصلہ پر پہونچ گیا جس کی صحت کی وقت نے تصدیق کر دی ہے۔ اس نے اس ابتدائی زمانہ میں روس کے

"عظیم تجربہ" یعنی انقلاب کے خلاف جو رپورٹ لکھی ہے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دیگر لوگ کافی وقت ضائع کرنے کے بعد اس کے بارے میں کہنے کی جرات کرسکے
رسل نے تعلیم اور فلسفہ پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں مصنف نے اس کی صرف دو کتابوں
ایک "تاریخ فلسفۂ مغرب" (History of Western Philosophy)
اور دوسری "آزادی کے مجوزہ راستے" (Propsed Roads to Freedom)
کا ذکر اس باب میں کیا ہے۔

باب دہم چارلی چیپلن (Charlie Chaplin) کے سوانح حیات اور اس سے متعلق تاثرات پر مشتمل ہے۔ اس کی تعریف میں مصنف لکھتا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جب میں اس سے ملا تو وہ دُنیا کا مشہور ترین انسان تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز ایکٹر تھا۔ اس کی کشش کے عناصر مُصنّف نے یہ بیان کئے ہیں۔ اس کی فکر اور تخیل ہمیشہ متحرک رہتی تھی۔ اس میں ظرافت تھی۔ اس کا چہرہ خوبصورت، اسکے انداز میں خوشنمائی اور جسم میں پھرتی تھی اور وہ اپنی گفتگو کو فطری حرکات کے ذریعہ واضح اور موثر بنا دیتا تھا۔ اس کی مزاجی کیفیت کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مزاج میں تلوّن بہت تھا۔ وعدے پورے کرنے میں اکثر کوتاہی کرتا تھا۔ اگرچہ یہ بہت متمول تھا لیکن روپیہ خرچ کرنے کی کافی جرائت نہ رکھتا کیونکہ بچپن میں وہ افلاس زدہ رہ چکا تھا۔ چارلی فلمی تصویریں بھی تیار کیا کرتا تھا۔ اس کے لکھنے کے طریقوں اور ان مزاجی کیفیتوں کو جو اسے لکھنے میں مدد دیتی تھیں مُصنّف نے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کی لکھی ہوئی فلمی کہانیاں جن کا ذکر کیا گیا ہے یہ ہیں۔
"جدید زمانہ" (Modern Times) "عظیم آمر" (Great Dictator) اور

"نیویارک میں ایک بادشاہ" (A King in Newyork.) سب سے زیادہ اہم وصف اس کا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنا کردار نہایت بے تکلفی سے ادا کرتا تھا جسے دیکھ کر ناظرین کو یہ احساس ہوتا تھا کہ اس میں اس سے زیادہ موثر طور پر کردار ادا کرنے کی استعداد موجود ہے۔

گیارھواں باب امریکہ کے مشہور فلاسفر اور ماہر تعلیم جان ڈوی (John Dewey.) کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ جان ڈوی مُصنّف کا اُستاد اور دوست ہے چنانچہ سب سے پہلے مصنف نے اس طویل باب میں اسکے اور اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے اور اس کی زندگی کے ہر گوشہ پر معتدبہ روشنی ڈالی ہے۔ اس کی عظمت کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں پیرس کی یونیورسٹی نے اسے اعزازی ڈگری عطا کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

"جان ڈوی امریکی ذہانت کی بہترین تخلیق اور اس کا مکمل نمونہ ہے"

ڈوی کے ماں اور باپ دونوں مذہبی آدمی تھے۔ اس کی پیدائش ۱۸۵۹ء میں ورمنٹ Vermont. میں ہوئی۔ بچپن میں وہ اوسط درجہ کی ذہانت کا لڑکا تھا۔ نوجوانی میں اس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جنسی بے راہ روی سے کوسوں دور تھا۔ اسکی والدہ کی اخلاقی تعلیم کا اس پر کافی اثر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی ایک سکول ٹیچر کی حیثیت سے شروع کی۔ ایک روز جب وہ گرجے میں عبادت میں مصروف تھا اسے یہ خیال آیا کہ یہ سب عبادت محض ایک رسمی چیز ہے اور اس خیال سے اسے بہت ذہنی تکلیف محسوس ہوئی اور جب اس نے ٹامس ہکسلے کی ایک کتاب علم عضویات پر پڑھی اور دیکھا کہ اس میں دُنیا کی اور مذہب کی پیدائش کے متعلق

انجیل مقدس کی تعلیمات سے قطعی مختلف خیالات درج ہیں تو اس کے ذہن میں عظیم بحران پیدا ہوا اس ذہنی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حصولِ علم میں اس نے جان توڑ کوشش شروع کردی اور فلسفہ کے سینیر کلاس کے کامیاب طلبا میں سرِ فہرست رہا۔ یہ کشمکش برابر جاری رہی یہاں تک کہ ایک شام کو جب کہ وہ بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا اسے ایک واقعہ پیش آیا جسے وہ "پر اسرار تجربہ" کہتا ہے۔ یہ ان سوالات کا جو اس کے ذہن کی پریشانی کا باعث بن رہے تھے ایک جواب تھا۔ اس تجربہ میں اسے کوئی شکل نظر نہیں آئی۔ صرف ایک آواز اس نے سُنی جس سے اس کی طبیعت میں ایک نہایت نشاط انگیز احساس پیدا ہوا اور جسے الفاظ کا جامہ اس نے اس طرح پہنایا "تم کس بات کے لیئے پریشان ہو؟ جو ہے وہ ہے" ڈوی کا بیان ہے کہ اسکے بعد سے اس کے لئے ایمان اور اعتقاد کا مطلب تھا متفکر و پریشان نہ ہونا غور و خوض کے بعد اس نے اخلاقیات اور طبیعات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنے کا تہیہ کرلیا۔

۱۸۷۹ء میں ڈوی نے اپنی زندگی کا اہم کام شروع کردیا کافی کوشش کے بعد اس نے بالٹیمور (Baltimore.) کی تحقیق علمی کی یونیورسٹی میں فیلوشپ حاصل کرلی۔ وہاں اسے جارج سلویسٹر مورس (George Sylyester Morris. جیسا معلم مل گیا۔ پروفیسر مورس کی صحبت میں اس نے ہیگل کا بلغور مطالعہ کیا اور اسکے اصولوں کا قائل ہوگیا۔ کیونکہ ہیگل کے یہاں اخلاقیات اور طبیعات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ڈوی اس کے نظریات سے محبت کرنے لگا۔ بارہ سال تک وہ ہیگل کے فلسفہ کے زیر اثر رہا۔ لیکن جب ۲۵ سال کا ہوا تو اس فلسفہ کی گرفت ڈھیلی ہوگئی جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ تھا وہ ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس کا نام ایلس چپمین Alice Chipman, اسی لڑکی سے ۱۸۸۶ء میں اس کی شادی ہوگئی۔

ڈوی کے تعلیمی نظریوں کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اسکے

عملیاتی یا آلاتی فلسفہ (Instrumental Logic) سے اخذ کئے گئے ہیں مُصنّف کہتا ہے کہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان نظریوں کا ماخذ اس کے بچے تھے تعلیم پر ڈوی کی ایک اہم کتاب "اسکول اور معاشرہ" (School and Society) ہے۔ جس میں اس نے پہلی مرتبہ اس امر پر زور دیا کہ اسکول کو بچوں کی دلچسپی کی جگہ ہونا چاہیئے۔ اس کتاب کا ترجمہ بہت سی دیگر زبانوں میں ہوا ہے جن میں چینی اور جاپانی زبانیں بھی شامل ہیں۔ تعلیم پر ڈوی کی دوسری معرکہ آرا تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" Democracy and Education ہے۔ سید محمد تقی جنھوں نے اس کتاب کو اُردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں:

یہ ان امہات کتب میں شامل ہے جن کا کسی زبان میں موجود نہ ہونا زبان کی بے مائیگی کا ثبوت ہے۔"

عالمی جنگ اول کے بعد ڈوی نے روس کا سفر کیا اور وہاں سے واپس آکر سوویٹ روس کی تعلیمی کارکردگیوں کی بہت تعریف و توصیف کی۔ اس کے بعد جب ایک دفعہ مرتبہ روسی انشاپرداز میکزم گورکی (Maxim Gorki) معہ اپنی بیوی کے روسی انقلاب کے لئے امداد حاصل کرنے کی غرض سے نیویارک آیا تو زار روس کے افسروں کے اشارے پر تمام شہر اس کا مخالف ہوگیا اسے شہر کے کسی ہوٹل یا نجی مکان میں ٹھہرنے کے لئے جگہ نہ مل سکی۔ پبلک کے جنون کے خوف سے کوئی شخص انھیں اپنے یہاں ٹھہرانے کا روادار نہ تھا۔ اس حالت میں جان ڈوی نے اسے اپنے یہاں ٹھہرایا اور اس کی پشت پناہی کی حالانکہ ڈوی کے اس فیاضانہ سلوک کی بنیاد پر اس کی ملازمت ختم ہوجانے کا خطرہ موجود تھا۔ اسکے بعد جب لیون ٹراٹسکی پر غداری کا الزام لگایا گیا تو ڈوی نے اس مطالبہ کی پُرزور حمایت کی کہ اس کے جرم کو ثابت کرنے کے لئے ٹراٹسکی پر عدالت میں مقدمہ

چلایا جائے۔ اس طرح ڈوی نے یہ ثابت کردیا کہ پہلی عالمی جنگ کی حمایت اس نے اس وجہ سے نہیں کی تھی کہ وہ اشتراکیت کا متعصبانہ طور پر مخالف تھا۔ ٹراٹسکی کے ساتھ انصاف کرانے کے مطالبہ کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کا ڈوی چیرمین تھا۔ اسی زمانہ میں ڈوی نے اپنی عظیم کتاب "منطق نظریہ تحقیق" (Logic Theory of Inquriry. ) لکھی۔ مصنف نے ڈوی کے عملیت پسندانہ نظریہ (Pragmatism) پر بڑی دلچسپ رائے زنی کی ہے۔ وہ کہتا ہے: "میرے خیال میں اس نظریہ کی مذمت کرنے والے حضرات بڑی زبردست غلطی کرتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ پریگمیٹزم روحانی اقدار پر ایک حملہ ہے۔ میرے نزدیک یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پریگمیٹزم روحانیت کو سائنس کی شکل میں لانے کی ایک کوشش ہے"۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نظریۂ عملیت کی رو سے حق وہی چیز ہوتی ہے جو کام کرتی ہے اور خدا پر یقین رکھنا کارآمد بات ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کا وجود ہے۔

مصنف نے ڈوی کے تعلیمی نظریات کے اس حصہ پر اعتراض کیا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ بچوں کی مرضی کے مطابق ان کے لئے نصاب مقرر کرنا چاہیئے۔ مصنف کے نزدیک بچوں کی مرضی یا پسندیدگی کو اتنی اہمیت دینا غلط ہے۔ ڈوی کے تعلیمی نظریہ کے دیگر اجزا سے اسے پورا اتفاق ہے اور ان کی بنا پر وہ ڈوی کو تمام دنیا کے بچوں کا محسن اور نجات دہندہ تصور کرتا ہے۔

بارھویں یعنی آخری باب میں مصنف نے اپنی والدہ محترمہ کے ابتدائی حالات

کا تذکرہ اور ان کی قابلیت اور سیرت کی تصویر کشی بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے۔ نیویارک اسٹیٹ میں وہ پہلی خاتون تھیں جنھیں گرجے میں باضابطہ پادری کا عہدہ دیا گیا تھا۔ عموماً پادری صاحبان کہتے ہیں کہ خدا محبت ہے لیکن مصنف کی والدہ مسز ایسٹ مین (Mrs. Eastman.) کا نظریہ یہ تھا کہ "مسرت" ہے اور ترقی کرنا انسان کا مقصد اولین ہے اور وہ اپنے اصولوں کو حیرت انگیز دلیری سے بیان کرتی تھیں۔ اگرچہ وہ رسمی عقائد سے مختلف ہوتے تھے۔ وہ نہایت فصیح واعظ تھیں ۱۸۹۳ء میں ان کی فصاحت کی شہرت اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ شکاگو میں جب اسی سال مذاہب کی عالمی کانگریس منعقد ہوئی تو اس میں خطبہ دینے کے لئے انھیں ان کے چھوٹے سے گرجے سے بلایا گیا۔ عورتوں کی اقتصادی آزادی کی وہ شروع سے حامی تھیں۔ اپنے شوہر مسٹر ایسٹ مین (Mr. Eastman.) کے علیل ہو جانے پر عرصہ تک اپنے خاندان کے جو پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ مصارف انھوں نے تنہا اٹھائے ان کی پاکیزگیٔ کردار اور حسن سیرت کا یہ عالم تھا کہ وہ پادری بھی جو ان کے عقائد سے اختلاف رکھتے تھے ان کو ولی (saint) کہتے تھے۔ مسز ایسٹ مین (Mrs. Annis Ford Eastman.) نے اپنے بچوں کی تربیت کا کام بھی بہت اچھی طرح انجام دیا۔ مصنف نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

"میری والدہ جدید اسکولوں سے زیادہ ہوشمند تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آزادی کی خوش ذائقہ غذا کے ساتھ نظم وضبط کی تلخ دوا مناسب مقدار میں وقتاً فوقتاً کیوں کر دی جاتی ہے"۔

مذکورہ بالا کتاب "گریٹ کمپے نیانس" (Great Companions.) کا

ترجمہ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ نے خالص علمی نقطۂ نظر سے کرایا ہے۔ اس کتاب کو ترجمہ کے لئے منتخب کر کے اکیڈیمی مذکور نے نہایت ہی ---- روشن خیالی سے کام لے کر مصنف کے ذاتی عقائد کے حسن و قبح کو نظر انداز کرتے ہوئے اردو داں طبقہ کے سامنے مفید معلومات پیش کرنے کی ضرورت کو اہمیت دی ہے اور اس اقدام کے لئے وہ علم دوست طبقہ کی جانب سے خصوصی مبارکباد کی مستحق ہے۔

اُردو میں صحافتی ادب اور رپورتاژ کی روزافزوں ترقی کے ساتھ شخصی مرقع نگاری بالخصوص ملاقاتی خاکوں کی ترتیب و تہذیب کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور اس پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب کسی موضوع سے متعلق ہے مصنف نے ان ملاقاتی مرقعوں میں اپنے شخصی کردار اور ذاتی خیالات و معتقدات کو زیادہ اہمیت دی ہے لیکن دوسروں کیلئے بھی ان کو سرمایۂ بصیرت اور ذریعہ مسرّت بنانے کے ساتھ تخیل اور حُسنِ ادا کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ مصنف طرزِ تحریر کے اعتبار سے بہت مشکل پسند واقع ہوا ہے۔ میں نے ترجمہ کو سلیس اور عام فہم بنانے کی پوری کوشش کی ہے اور آزاد ترجمہ کی غیر ذمہ دارانہ روش سے بھی اجتناب کیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تکمیل میں جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی ڈائرکٹر اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور جناب مولوی محمد حامد علی خاں صاحب ڈائرکٹر موسسہ مطبوعات فرینکلن کی سرپرستی اعانت اور مفید مشوروں کو بہت زیادہ دخل ہے۔ میں ہر دو صاحبان کا بہت زیادہ منت پذیر ہوں۔

محمد حامی الدین خاں

کراچی ۱۵ رمئی ۱۹۶۳ء

# بوڑھا اسکرپس[1]

## اخلاقی درس سے عاری لیکن ایک کامیاب سرگزشت

جس وقت میری ملاقات ای۔ڈبلیو اسکرپس ( E. W. Scripps. ) سے ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہو چکی تھی۔ وہ کروڑ پتی تھا اور تیس اخباروں کا مالک تھا جن کی اشاعت لاکھوں تک پہونچتی تھی۔ میں ان دنوں "ماسیز" ( Masses. ) کا ایڈیٹر تھا۔ یہ ایک انقلابی رسالہ تھا جس کی اشاعت دس ہزار تھی اور جس سے بارہ ہزار ڈالر سالانہ کا خسارہ ہو رہا تھا۔ ہماری ملاقات لنکن اسٹیفنس ( Lincon Steffens. ) کے توسط سے ہوئی۔ اسٹیفنس انقلابی تحریکات کا ایک مخلص مربّی تھا۔ مغربی ممالک کے دورہ سے واپسی پر اس نے

---

[1] ای۔ ڈبلیو اسکرپس (۱۸۵۴ سے ۱۹۲۶) مشہور امریکن صحافی تھا۔ الی نوائے میں پیدا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے کلیولینڈ میں پینی پریس اخبار جاری کیا۔ بعد ازاں اپنے منیجر اور بھائی کی شرکت میں آزاد خیال اخباروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اسکرپس۔ میکرائے لیگ کہا جاتا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے اخبارں کو خبریں مہیا کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا۔ (مترجم)

ایک دن مجھ سے کہا:

"ممکن ہے بوڑھا اسکرپس تمھارے رسالہ کے لیے تمھیں کچھ روپیہ دے

وہ اس کو ہر ماہ پڑھتا ہے۔"

اس سلسلے میں حصولِ زر کا امکان تو مجھے بہت بعید معلوم ہوا لیکن میرے لئے یہ اطلاع بہت ولولہ انگیز تھی کہ میرے رسالہ کو ایک ایسا شخص بھی پڑھتا ہے۔ لہذا میرے دل میں اس کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔

اسکرپس نے ادھیڑ عمر میں دو ہزار ایکڑ رقبہ کی ایک مرتفع چراگاہ لاہویئو[۱] علاقہ کیلی فورنیا[۲] میں خرید کی تھی اور اس میں مویشیوں کی پرورش کے لیئے ایک ساٹھ کمروں کی عمارت بنا کر خود بھی وہیں گوشۂ عافیت میں وہ اپنے خیالات وتصورات میں محو رہتا اور اپنے خاندان کی پرورش کرتا تھا اور اس نے اپنے اخبارات کی ملکیت کو فروغ حاصل کرنے اور خود بخود برگ وبار لانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ بجز اسکے کہ کبھی کبھی وہ طویل ٹیلیفونی سلسلہ پر کوئی آمرانہ حکم صادر کیا کرتا تھا۔ سانڈیگو[۳] (San Diego.) میں ایک تقریری پروگرام کے اختتام پر میں ایک پرانی

---

[۱] لاہویئو ایک پرفضا دیہاتی علاقہ ہے۔ جہاں لوگ تفریح کے لئے جاتے ہیں۔ سمندر کا قرب ہے۔ شاندار فرحت بخش ساحل ہے۔ اور چاروں طرف چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ (مترجم)

[۲] کیلی فورنیا ممالک متحدہ امریکہ کی ایک مشہور اور اہم ریاست ہے۔ اس کا رقبہ ۱۵۶۸۰۳ مربع میل ہے اور آبادی ۶۹۰۷۳۸۷ ہے۔ دارالسلطنت سان فرانسسکو ہے۔ (مترجم)

[۳] سان ڈیگو ریاست کیلی فورنیا کا خوبصورت اور دلکش شہر ہے۔ ایام سرما میں ہزارہا لوگ تفریح اور آرام کے لئے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اس کی آبادی تقریباً ۳۶۲۶۸۵ ہے۔ (مترجم)

ٹی موڈل فورڈ گاڑی میں سوار ہو کر اس سے ملنے کے لئے گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر اتنے محظوظ ہوئے کہ میں وہاں ایک ہفتہ تک ٹھہرا رہا اور پھر اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً میں نے متعدد ہفتے اس مہمان نواز چراگاہی مکان میں بسر کیئے۔

ان ہفتوں میں تقریباً تمام وقت خالص لفظی بحثوں میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ بیساختہ قہقہوں اور تمباکو کے دھوئیں کے بادلوں کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس دوران میں ہم نہ تو خوش گپیاں کرتے نہ چہل قدمی کے لئے باہر نکلتے نہ شراب سے شغل کرتے اور نہ کبھی کار پر سیر کے لئے جاتے تھے۔ البتہ اس نے ایک "حقیقی کار" میرے سپرد کر دی تھی اور مجھے اس کے کل پرزوں کا تجزیہ کر کے ایک پرانی گیر شفٹ (: .Gearshift) کو چلانا سیکھنے کا موقع دیا تھا، لیکن اس سے قطع نظر کر کے ہماری رفاقت بس اس حد تک تھی کہ ہم اس کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھ کر ملکے سگاروں سے شوق کرتے رہیں اور تین سے چھ گھنٹوں تک بے تکان مختلف موضوعات پر باتیں کیئے جائیں۔

وہ طویل قامت اکہرے بدن کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ داغ تھے اور چندیا لہ تھا۔ ایک آنکھ سے کسی قدر بھینگا تھا اور دوسری سے ایک خوفناک سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ یہ ہیئت کذائی اس قسم کی تھی کہ معمولی بہروپ سے وہ بحری ڈاکو کے کردار کے لئے نہایت موزوں سمجھا جا سکتا تھا۔

پرانے زمانہ میں جبکہ اس کے "پینی پریس" (.Penny Press) نے امریکی صحافت میں ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا وہ کلیولینڈ میں بندوق لے کر پھرا کرتا تھا اس اخبار کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ ناگوار حقائق کو مزدوروں کے نقطۂ نظر سے اور

بے تکلفی، لاپروائی اور اختصار کے ساتھ شائع کیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک دن عدالت کے بغلی کمرہ میں اس کے دشمنوں کے اشتعال دلانے پر ایک ہجوم نے کچھ حجتی کرکے اس کو زچ کر دیا اور ایک کونے میں ڈھکیل دیا۔ نوبت جسمانی تشدد تک پہونچنے والی تھی کہ اچانک ایک شخص نے چلا کر کہا "گولی چلانے والا ہے!" یہ امر واقعہ تھا یا نہ تھا لیکن اس آواز سے دس سیکنڈ کے اندر اندر وہ سب فرار ہو گئے اور کمرہ میں وہ ہی اکیلا رہ گیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ میں نے آئینہ میں دیکھا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان لوگوں کے بھگانے میں میری بندوق نے کام کیا یا میری شکل نے!

میرے خیال میں یہ کرشمہ زیادہ تر اس کی صورت ہی کا تھا۔ اس نے بارہا اپنی بندوق تانی لیکن کبھی اس کو چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے وہ شہ زور تھا لیکن جسمانی اعتبار سے ہلکا پھلکا تھا۔ عورت کے ایسے پتلے ہاتھوں والی یہ امتزاج خوفناک ہے بالخصوص جب کہ ہاتھوں میں بندوق ہو۔

میرے تصور میں یہ نقشہ اب تک مرتسم ہے کہ وہ گھومنے والی کرسی پر اپنی ڈیسک کے پیچھے دراز، سگار کے دھوئیں میں سے تمسخر آمیز نیم وا آنکھوں سے دیکھتا ہوا ہر مسئلہ پر اس طرح تحکمانہ رائے زنی کرتا کہ گویا اس کو تمام موضوعات پر پورا عبور حاصل ہے۔ لیکن ساتھ ہی کبھی اس کی آنکھوں سے مترشح ہونے والے انبساط حقارت آمیز اشارات، اور بیچ بیچ میں متفکرانہ استفسارات سے اس امر کی غمازی بھی ہوتی تھی کہ ہم سب کی طرح اس کا مبلغ علم بھی بہت کم یا بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر وہ بار بار اٹھتا ملحقہ کمرہ میں جاتا اور ایک قلمی مسودہ لے کر واپس آتا تھا۔ یہ مضمون زیر بحث پر خود اس کا لکھا ہوا ایک علمی مقالہ ہوتا تھا۔ وہ اس کے بعض اجزا

مجھ کو پڑھ کر سناتا اور اس میں جو فراست اس کو نظر آتی تھی اس پر مسرّت آمیز استعجاب کا اظہار کرتا تھا۔

اسکرپس کا دماغ مونٹین[1] (Montaigne.) کی طرح جدّت آفریں اور متنوع تھا اور دُنیا کے ہر مسئلہ کے متعلق معقول شبہات اور قیاس آرائیوں سے پُر تھا۔ اگرچہ وہ اعلیٰ زباں دانی کی نعمت سے محروم تھا لیکن اس کے علمی مقالات میں مونٹین کے مضامین کی سی صاف بیانی، ذہنی جسارت اور ناقابلِ تشفی تشنگی پایا جاتا تھا۔ اس نے ان کو شائع کرنے کے بجائے لوہے کے ایک پُرانے بکس میں مقفل کر دیا تھا تاکہ اس کے پوتوں کے ہشیار ہونے تک وہ محفوظ پڑے رہیں[2]۔

مونٹین کا مقام تو بہت بلند ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی اور امریکن خصوصاً اہلِ ثروت و اقتدار میں سے بھی کوئی شخص اس روشن دماغ لیکن درشت مزاج شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا وہ ہرسٹ[3] (Hearst) سے بھی اتنا ہی

---

[1] مائیکل ڈی مونٹین ۱۵۳۳ء — ۱۵۹۲ء شہرۂ آفاق فرانسیسی انشاپرداز جس کے اسلوب بیان اور طرزِ نگارش کا انگریزی نثر نگاروں پر بہت اثر پڑا۔ انقلاب فرانس سے قبل جن علمی مشاہیر نے فرانسیسیوں کے دل و دماغ کو اپنی زندہ جاوید تحریرات سے متاثر کیا ان میں اس کا بھی شمار ہے (مترجم)

[2] ان مقالات کے بعض منتخب اجزا سنہ ۱۹۵۱ء میں کتابی صورت میں Damned Old Crank کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ مُرتّب کا مقدمہ پڑھنے سے مجھے یہ پتہ چلا کہ جن دو یا تین لنگوٹیے دوستوں کو یہ مقالات دکھائے گئے تھے ان میں ایک نام میرا بھی تھا۔ (مصنف)

[3] ولیم رینڈولف ہرسٹ سنہ ۱۸۶۳ء۔ یہ مشہور صحافی اور ناشر سان فرانسسکو میں پیدا ہوا سنہ ۱۸۹۵ء میں اس نے نیویارک میں مارننگ جرنل کو ستر لاکھ ڈالر میں خریدا صحافتی کاروبار میں بڑے حیرت انگیز دلیرانہ اقدامات کر کے امریکہ کی اخباری دُنیا میں اپنے لئے ایک خاص اور بلند مقام حاصل کر لیا سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۰۷ء تک ایوانِ نمائندگان کا رکن رہا۔ (مترجم)

مختلف تھا جتنا کہ اس کا کار آمد چراگاہی مکان سینٹ سیمون St. Simeon. کی تماشاگاہ سے مختلف تھا۔ وہ صحافتی دُنیا کی تمام نامور شخصیتوں سے اپنی زبردست دماغی صلاحیت اور بیباک انفرادیت کے اعتبار سے بالکل علیحدہ تھا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے بعض لوگ اس کو خبطی کہتے تھے حالانکہ کوئی خبطی اس قدر زیرک اور ہوشمند نہیں ہوا ہے۔

وہ پکا دہریہ تھا، اس نے کبھی گرجا میں حاضری نہیں دی نہ کبھی تھیٹر یا کسی سیاسی اجتماع یا کھیل میں گیا۔ اس کا گمان تھا کہ "جو کچھ بھی ہے سب غلط ہے"۔ نوعِ انسانی کے متعلق بشمولِ خود اس کی اس قدر خراب رائے تھی کہ اس نے کبھی لوگوں کی عزت و محبت کی مطلق پروانہ کی۔ شہرت کو وہ محض ایک کھلونا سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے خود اپنی ذاتی عزت قایم رکھنے کی بھی پروانہ کی۔ وہ اسی طرح کہا کرتا تھا اور اس کو ثابت کرنے کے لئے وہ بڑے فخر سے کہتا تھا کہ

"پچیس سال تک میں نے اتنی شراب پی ہے جتنی تین چار آدمیوں کو ہمہ وقت بدمست رکھنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے!"

اور یہ شغل اس وقت چھوڑا جب اس کی صحت جواب دینے لگی۔ اسکرپس ایک بے قرار سیاح، بے پناہ پڑھنے والا اور شاعری کا دلدادہ تھا۔ ذوقِ سخن کی تسکین اس کو زیادہ تر بائبل سے حاصل ہوتی تھی۔ باوجودیکہ وہ سنڈے اسکولوں اور ان کے نام نہاد معلموں کو محض احمق تصور کرتا تھا۔ اس کو پوئیر ریچارڈ جنتری Poor Richard Almanack.) میں لکھے ہوئے تمام اقوال زبانی یاد تھے لیکن ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کو اتفاق نہیں تھا۔ وہ جس قدر ممکن ہو سکتا سوتا تھا اور جب تک اس کا

جی نہ چاہتا بستر سے نہیں اُٹھتا تھا۔ وہ اپنے پاس کبھی کوئی کتاب نہیں رکھتا تھا، اور کاروباری لوگ عام طور پر جو کتابیں رکھتے ہیں ان کو وہ اپنے لئے "ناقابلِ برداشت وبال" سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک نہایت کامیاب کاروباری آدمی تھا۔ اس نے اپنی زندگی کاشتکار لڑکے کی حیثیت سے شروع کی تھی اور جب وہ ڈیٹرایٹ (Detroit..) میں آیا تو اس کے پاس اسّی ڈالر تھے جو اس کی واسکٹ کے استر میں سیئے ہوئے تھے، لیکن جب اس کا آخری وقت آیا تو وہ ایک شاہانہ نجی سمندری کشتی میں فروکش تھا اور اس نے پانچ کروڑ ڈالر سے زیادہ کی دولت اپنے پیچھے چھوڑی۔

امریکہ سے باہر کسی اور ملک میں اسکرپس جیسی شخصیت کا عالمِ وجود میں آنا ممکن نہ تھا۔ حیرت یہ ہے کہ جس طریقہ سے اس شخص نے کسی قسم کی محنت کئے بغیر دولت کے انبار سمیٹے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز امریکی طرزِ حیات امریکہ کی قومی کامیابی کی سرگذشت کے مغائر نہیں۔ اس نے اپنا پہلا اخبار کلیولینڈ پریس (Cleveland Press..) ۱۸۷۸ء میں صرف دس ہزار ڈالر کے سرمایہ سے جاری کیا جو اس نے اپنے بھائی جارج سے قرض لئے تھے۔ سولہ ماہ بعد وہ ایوننگ کرانیکل (Evening Chronicle..) کا اجرا کرنے کے لئے سینٹ لوئی (St. Louis.) گیا۔ اس کے بعد وہ کلیولینڈ واپس آیا۔ یہاں وہ چھ مہینے تک ٹھہرا پھر وہ اپنی پیاری بہن ایلن (Ellen) کے ساتھ یورپ چلا گیا۔ اُس وقت سے لے کر ۱۹۲۶ء تک جب اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اس کو کلیولینڈ پریس پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ حالانکہ خود اس کا کہنا ہے کہ اس دوران میں میں نے تیس دن بھی کلیولینڈ میں رہ کر نہیں گزارے۔" صدی کے اختتام پر اس اخبار کی حیثیت

لاکھوں کی ہو گئی تھی۔

اسکرپس کا کہنا ہے کہ میں ہر وقت ایک دن میں چار آدمیوں کا کام انجام دینے کو تیار رہتا تھا، لیکن میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ ایسے مواقع شاذ ہی پیش آئیں۔ چوبیس سال کی عمر سے میری زندگی کے نصف سے زیادہ دن اس طرح گذرے ہیں کہ مجھے کسی قسم کے کاروبار سے متعلق شعوری طور پر کوئی فکر یا توجہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اخباری مشغلہ مجھے اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری زندگی کا ایک غیر اہم واقعہ ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں اسکرپس نے کہا کہ مجھے جو یہ شاندار کامیابی بلا محنتِ شاقہ حاصل ہوئی ہے اس کے تین اسباب ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ میں نے اوائل عمر میں حتمی طور پر طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کام کرنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس فیصلہ پر پہونچنے کا اصل محرک رومن کولیسیم کی وسعت و عظمت تھی۔

چوبیس سال کی عمر تھی کہ میں بلا کسی مقصد کے یورپ میں گھوم رہا تھا اور سر میں یہ سودا تھا کہ میں ایک مشہور اہل قلم بنوں لیکن ایک روز سہ پہر کے وقت میں کولیسیم میں ایک اُفتادہ ستون پر دھوپ میں لیٹا ہوا تھا کہ میں نے یکایک یہ فیصلہ کر لیا کہ اہل قلم بننے کے بجائے مجھے صاحبِ اقتدار بننا چاہیئے اور اخباروں کی ایک سلطنت قائم کرنی چاہیئے۔ دوسرے لوگ اخبارات کے لئے تحریری مواد مہیا کریں گے اور میں پسِ پردہ غیر معروف و گمنام رہ کر اس اخباری سلطنت کو پورے طور پر اپنے قابو میں رکھ کر چلاؤں گا۔

اس کی کامیابی کا دوسرا سبب جو پہلے سبب سے ملتا جلتا ہے یہ تھا کہ وہ

اپنے جوہرِ ذاتی سے بخوبی واقف تھا یعنی وہ جانتا تھا کہ اس میں عملی قوتِ فیصلہ موجود ہے۔ اس جوہرِ ذاتی کی پرورش پر توجہ کر کے اور دوسرے کے کندھوں پر کام اور پریشانی کا بار ڈال کر اس نے شروع ہی میں قوت و توانائی کا اتنا ذخیرہ پس انداز کر لیا تھا جتنا کہ اولوالعزم اشخاص اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل تک بھی محفوظ نہیں کر سکتے۔ اس کی بظاہر اتفاقیہ کامیابی کا تیسرا سبب یہ ہے کہ اس کو انسانی فطرت کے متعلق باطنی علم حاصل تھا۔ اس نے ایک دفعہ یہ حیرت انگیز بیان دیا۔ زندگی بھر میں نے اپنے اخبارات کے ملازمین کو غالباً پانچسو سے زیادہ احکام بھی صادر نہیں کیے میرا طریقۂ عمل یہ تھا کہ انتخاب کرنے کے بعد میں ملازمین کی فطرت کا مطالعہ کرتا پھر زبانی گفتگو اور خطوط کے ذریعے ان میں یہ جذبہ پیدا کر دیتا کہ وہ اپنی استعداد سے بہترین کام لے کر اپنے فرائضِ منصبی انجام دیں۔

اس کے اقوال جو ہم تک پہونچے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گفتگو اور مراسلت کے ذریعے دوسروں کو کس قسم کی تلقین کیا کرتا تھا۔

(۱) یہ ممکن ہے کہ متواتر ضبط و تحمل سے کام لے کر ایک ریاکار انسان اپنے آپ کو مخلص ترین معلم اخلاق ظاہر کرے۔ لیکن یہ نہایت صبر آزما کام ہے۔

(۲) وہ کام ہرگز تم خود مت کرو جس کے کرنے کے لئے تم کو دوسرا آدمی مل سکے جتنا کام کوئی دوسرا آدمی تمھارے لئے کر سکے گا تم کو اتنا ہی زیادہ وقت اور اتنی ہی زیادہ استعداد ان کاموں کے لیئے میسّر آجائے گی جن کو کوئی دوسرا آدمی تمھارے لیئے انجام نہیں دے سکتا۔

(۳) کسی سے نفرت مت کرو۔ نفرت ذہنی اور اعصابی قوت کا صرفِ بیجا ہے۔

(۴) حکمت عملی سے کام لو لیکن مکروہ اور ناپسندیدہ حد تک نہیں۔ ایسے حالات شاذونادر ہی پیش آتے ہیں کہ کسی صاحبِ ضمیر شخص کو نڈر اور بے لاگ تقریر وتحریر کی بدولت نقصان برداشت کرنا پڑے۔

اسکرپس اپنے ناجائز معاشقوں کے سلسلہ میں خاص طور پر جرأت اور صاف گوئی سے کام لیتا تھا۔ اس میں ایک بری عادت یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو "پسندیدہ" اور "ناپسندیدہ"، دو گروہوں میں تقسیم کرتا تھا اور شادی ہونے تک اس کی گرویدگی اور جنسی تعلقات ہمیشہ ناپسندیدہ دوشیزاؤں کے ساتھ رہے، ان میں سے ایک لڑکی جو ڈیٹرائٹ (Detroit) میں اس کی داشتہ رہ چکی تھی سینسناٹی[۵] (Cincinnati) میں اس کے دفتر پہونچی جہاں اسے اپنے اخبار پوسٹ (Post) کے اجرا کا اچھا موقع مل گیا تھا اور اس نے افشائے راز کی دھمکی دے کر اس سے کچھ رقم وصول کرنا چاہی اسکرپس نے اخبار کے شہری ایڈیٹر کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ دونوں مقامی اخباروں کے نامہ نگاروں کو بلائے۔ جب دونوں نامہ نگار آگئے تو اس نے اپنے ملاقاتی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

"مس براؤن میرے ساتھ ایک آشنا کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ میں ان کی فرمائشیں پوری کیا کرتا تھا۔ پھر ہم میں خوشگواری کے ساتھ مفارقت ہوگئی۔ اب آج یہ میرے پاس اس غرض سے آئی ہیں کہ ان پرانے تعلقات کو طشت ازبام کرنے کی

---

۵ سنسناٹی۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ریاست اوہیو کا ایک مشہور شہر ہے۔ پارچہ سازی کپڑے کی صنعت فرنیچر سازی اور مشینری کے لئے مشہور ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۵۰۳۸۲۴ ہے۔ (مترجم)

دھمکی دے کر مجھ سے روپیہ وصول کریں۔ اگر آپ چاہیں تو اس داستان کو اپنے اخبار میں شائع کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اس قصہ کو ختم کر چکا ہوں۔"

دوسرے روز یہ روئداد جلی سرخیوں کے ساتھ اخباروں میں شائع ہوئی اور ہر شخص کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس سے نہ تو اخبار کی اشاعت پر کوئی بُرا اثر پڑا اور نہ ایڈیٹر کی شہرت کو کوئی نقصان پہونچا۔ اسکرپس نے اپنی نجی زندگی کے ایک واقعہ کو منظر عام پر لانے میں جس بیباکی اور صاف گوئی سے کام لیا اس کا اثر اہالیِ سنسینیٹی کے دلوں پر اتنا گہرا ہوا کہ جنسی بے راہ روی کا پردہ چاک ہونے سے اس کے خلاف جو کراہت پیدا ہونا چاہیئے تھی اس کی پوری تلافی ہو گئی۔ اکتیس سال کی عمر میں جب اسکرپس کی شادی ہوئی تو اس نے عہد کیا کہ اب وہ ناجائز جنسی تعلقات سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا، اور یہ عہد اس نے آخر وقت تک نباہ دیا۔

جس حیرت انگیز طریقہ سے اسکرپس نے یکایک اپنی اخباری سلطنت قائم کر لی تھی ایسی ہی تعجب خیز مستعدی سے وہ اس سے دست بردار ہو گیا اور آہستہ آہستہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ کولیسیم میں اس نے بحالتِ بیداری جو خواب دیکھا تھا اس کے صرف بارہ برس بعد اس نے ایک دن صبح کے وقت اپنے کاروباری منیجر ملٹن میکرائے (Milton Mcrae.) کو طلب کیا اور اپنے کاروبار میں محدود شرکت کی قرارداد اس کے سامنے پیش کی جس کی رو سے اس کو تنخواہ اور منافع کے طور پر آمدنی کا ایک ثلث ملنا قرار پایا۔ اس میں ایک شرط یہ تھی کہ اسکرپس میکرائے (Scripps. Mcrae.) سلسلے کے اخبارات کو چلانے پر

کل آمدنی میں سے پچاس فی صد سے زیادہ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ اب وہ کیلی فورنیا ہیں رہ کر اپنے چراگاہی مکان میں بیٹھا ہوا عقاب کے مانند اپنی مملکت پر نظر رکھنے لگا۔ ہر اخبار کے دفتر سے روزانہ اور ہفتہ وار اطلاعات آتی رہتی تھیں اس نگرانی اور حساب کتاب کی جانچ کرنے کی غرض سے اس کو سالانہ دس ہزار میل تک سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ سفر وہ اپنی نجی کار میں کرتا اور دو معتمد اس کے ہم سفر ہوتے تھے جو ہر وقت کام میں منہمک رہتے تھے۔ لیکن جب وہ گھر جاتا تو اپنی پوری توجہ سفیدے کے جنگل اُگانے، چکوتروں کے کنج لگانے، تالاب بنوانے، اپنے ذاتی بنجر علاقوں کی بحالی کے لئے میلوں تک پائپ ڈلوانے، اپنے بیٹوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور سب سے زیادہ ایسی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کیا کرتا تھا جن کا فن صحافت سے دور کا بھی تعلق نہ ہوتا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اپنی کل مُدّتِ حیات میں اس نے عالمِ بیداری کی تمام ساعتوں میں سے نصف سے زیادہ گھڑیاں مطالعۂ کتب میں صرف کی ہیں۔

میکرائے سے جو معاہدات ہوئے تھے ان میں ایک یہ تھا کہ اخباری کاروبار کو مزید وسعت دینے کی صورت میں ہر فریق اس علاقہ کا مختار کار سمجھا جائے گا جہاں وہ اپنا اخبار پہلے جاری کرے گا۔ اسکرپس نے اندازہ لگا لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ میکرائے بھی اس بات کو سمجھتا تھا کہ ڈیلاز[1] (Dallas.)، ٹیکساز[2] (Taxas.)

---

[1] ڈیلاز۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ریاست ٹیکساز کا ایک شہر ہے۔ جس کی آبادی ۴۳۴۷۴۹ نفوس کے قریب ہے۔ یہاں کی خاص پیداوار گندم ہے۔ (مترجم)

[2] ٹیکساز ممالک متحدہ امریکہ کی بڑی ریاستوں میں اس کا شمار ہے۔ اس کی آبادی ۶۴۱۴۸۲۴ ہے۔ اس کے رقبہ میں جو ۲۶۳۶۴۴ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے روئی اور اناج پیدا ہوتا ہے۔ اور ان پیداواروں کی وجہ سے یہ جگہ مشہور ہو گئی ہے۔ (مترجم)

میں ایک عمدہ قسم کا شبینہ اخبار جاری کرنے کیلئے اچھا میدان ہے۔ اس نے ایک گمنام نامہ نگار مسٹر ایلفریڈ او اینڈرسن کو بھی تاک رکھا تھا جو سینٹ[1] لوئی (Saint.L) میں معمولی سی اجرت پر اسکرپس۔ میکرائے سلسلے کے اخبار میں کام کرتا تھا۔ ایک روز بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر اینڈرسن کو ایک تار ملا جس پر نام کے دو ابتدائی حروف بطور دستخط کے ثبت تھے۔ اس تار کا مضمون یہ تھا کہ وہ ڈیلاز جائے اور سب سے پہلی فرصت میں وہاں ایک شبینہ اخبار کے اجرا کا انتظام کرے۔ اس کام کے لیے ڈیلاز کے ایک بنک میں اس کے نام روپیہ جمع کرا دیا گیا ہے۔ اینڈرسن کے حواس مجتمع ہوئے تو یہ جانتے ہوئے کہ جن حکم ناموں پر ای۔ ڈبلیو (E.W) کے دستخط ہوں ان کا کیا منشا ہوتا ہے اس نے چار صفحات کے ایک اخبار کا پہلا ایڈیشن تیار کیا سینٹ لوئی میں اس کو چھپوایا خود کاپیاں لے کر بذریعہ ٹرین روانہ ہو گیا اور دوسرے دن سہ پہر کو یہ اخبار ڈیلاز کے بازار میں بکنا شروع ہو گیا۔ اسکرپس دوسرے لوگوں کو چرکا دینے میں بہت محظوظ ہوتا تھا، خصوصاً اپنے نیم شریکِ کار میکرائے کو چرکا دینے میں اسے بہت ہی لطف آتا تھا جس کی طبیعت میں خوش طبعی کا فقدان اس کے لئے اتنا ہی موجبِ روح تھا جتنی کہ اس کی بے پناہ استعدادِ کار اور یکسوئی لائقِ تحسین تھی۔

اسی طرح کی دلی مسرت اسکرپس کو اس وقت ہوئی جبکہ ایسوشی ایٹڈ[2]

---

[1] سینٹ لوئی۔ دریائے مسی سپی مسوری کے کنارے پر ایک مشہور شہر ہے جو جفت سازی کی صنعت کے لئے مشہور ہے۔ اس کی آبادی میں قریباً ۸۱۶۰۴۸ نفوس شامل ہیں۔ (مترجم)

[2] ایسوشی ایٹڈ پریس۔ یہ اخباری ادارہ ۱۸۶۸ء میں نیویارک میں قائم کیا گیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ ملک بھر کے تمام روزناموں کو خبریں مہیا کرے ۱۸۹۲ء میں اس کو الی نوایز میں رجسٹرڈ کرایا گیا۔ اور یورپ کے تمام اخبارات کو خبریں پہنچانے کا ٹھیکا مل گیا۔ ۱۹۰۰ء میں یہ پھر نیویارک میں منتقل ہو گیا اور وہاں مستقل اس کا دفتر قائم ہو گیا۔ (مترجم)

پریس کا ایک منصوبہ جو خبر رسانی کا اجارہ حاصل کرنے کے لیئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی تدبیر سے ناکام بنا دیا گیا۔ انھوں نے اسکرپس کو بھی اس منصوبہ میں شرکت کی دعوت دی لیکن اس نے قبول نہ کی۔ انھوں نے اس کو آخری مہلت دی کہ یا تو وہ شریک ہو جائے یا پھر ہمیشہ کے لیئے اس کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ اسکرپس موقع کا منتظر رہا یہاں تک کہ فیصلہ کی آخری گھڑی گزر گئی، لیکن اس عرصہ میں اس نے ایک اپنی خبر رساں ایجنسی قایم کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ پھر اس نے اپنا ایک نمائندہ ان لوگوں کے اجلاس میں بھیجا جس نے بڑے تحکمانہ انداز سے یہ مطالبہ کیا کہ اسکرپس کے اخباروں کو وہی حیثیت دی جائے جو دیگر شرکائے مجلس کے اخباروں کو حاصل ہے۔ ان لوگوں نے جیسا کہ اس کا خیال تھا اس مطالبہ کو نفرت آمیز ہنسی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ اسکرپس نے فوراً برقی پیغاموں کے ذریعہ جو اس نے پہلے سے تیار کر لیئے تھے اسکرپس میکرائے پریس ایسوسی ایشن کے قیام کا اعلان کر دیا جسے بعد میں یونائیٹڈ پریس[1] کا نام دیا گیا۔ وہ اخباری اجارہ داری پر اس کاری ضرب کو امریکی صحافت کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتا تھا۔

اسکرپس اپنے چند جاری کردہ احکام کا تذکرہ اکثر بڑے اطمینان سے کیا کرتا تھا اسی سلسلے میں اس کے ملازمین یہ کہتے تھے کہ جب وہ کوئی حکم دیتا تھا تو اس کی فوری تعمیل لازمی ہوتی تھی۔ ورنہ اس کے ہیبت ناک ردِ عمل سے ساری عمارت ہل جاتی

---

لہ یونائیٹڈ پریس۔ یہ اخباری ادارہ ایسوشی ایٹڈ پریس کی مخالفت میں نیو یارک میں ۱۸۸۲ء میں قایم کیا گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں اس کو ایسوشی ایٹڈ پریس کے ساتھ مدغم کر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ اسکرپس کے اخبارات کا ایک شعبہ بن گیا۔ یہ ایک پرائیویٹ اخباری ادارہ ہے۔ (مترجم)

تھی۔ گھر پر وہ ایک مطلق العنان مشرقی حکمران کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا چراگاہی قلعہ نما مکان ایک ہی منزل کا تھا اور ایک کمرہ سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے ہر ایک دروازہ پر خود اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ احکام آویزاں نظر آتے تھے۔ "دروازہ بند رکھو" ای۔ ڈبلیو، اسکرپس ناشتہ ختم کرتے ہی میز سے اُٹھنے سے قبل وہ ہر روزہ احکام جاری کرتا تھا۔

"باب (Bob.) میں تم سے اسی وقت گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور دو بجے دوبارہ تم سے ملاقات کروں گا، نیکی .Nackie ! (اس کی اہلیہ) چار بجے تمہارے ساتھ کار میں چلوں گا۔"

"میکس ! (Max.) ہماری بات چیت میرے دفتر میں دس بجے ہوگی۔"

ہماری گفتگو کا سلسلہ عموماً دس بجے سے ایک بجے تک جاری رہتا تھا اور اکثر سہ پہر یا شام کو پھر شروع ہو جاتا تھا۔ جب میں رخصت ہو کر دماغی تکان اور تمباکو کے اثر سے لڑکھڑاتا ہوا کمرہ سے نکلتا تھا تو وہ کہا کرتا "اس گفتگو کے لئے شکریہ!" گویا اس معاملہ میں مجھے کوئی اختیار حاصل تھا۔

مجھے یاد ہے کہ اس نے ایک مرتبہ خود ستائی کے انداز میں قلمبند کیا ہوا ایک مقالہ میرے سامنے پڑھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں ممالک متحدہ امریکہ کے ایک ہزار چوٹی کے سرمایہ داروں میں سے ہوں، اور اس "زعمِ باطل" کی معذرت پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "اس عظیم ملک کے نظم و نسق کی برائی بھلائی میں میری دو فی صد ذاتی ذمہ داری شامل ہے" اس کے ثبوت میں اس نے مجھے ایک مراسلہ دکھایا جس میں ووڈرو ولسن[لہ] (Woodrow Wilson.) کے پوسٹماسٹر جنرل برل سن

لہ ووڈرو ولسن ۱۸۵۶ء سے ۱۹۲۴ء مشہور امریکی سیاستدان جو جنگ عظیم اول میں امریکہ کا صدر تھا وہ [illegible]

(Burleson.) نے یہ تسلیم کیا تھا کہ ۱۹۱۶ء کے انتخابات میں حکومت کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ اسکرپس کے اخباروں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ زعم باطل بے بنیاد نہ تھا، لیکن اس کی گفتگو میں اس قسم کا رنگ کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اپنی تمام خودرائی و تحکم کے باوجود اس میں دیانت دارانہ انکسار کی جھلک پائی جاتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ اس سے سوال کیا کہ نیویارک میں آپ نے اپنا کوئی اخبار جاری کیوں نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

"میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں۔ یہ ہرسٹ .Hearst[1] یا پولٹزر .Pulitzer[2] کا کام ہے"۔

میرے نقطۂ نظر سے وہ بہت بڑا آدمی تھا بلکہ بہت زیادہ غور و فکر کرنے والا۔ وہ استدلال اور پُر مغز خیال آفرینی کا بہت شائق تھا۔ وہ ان افکار و تخیلات کی جو اس نے لوہے کے صندوق میں مقفل کر رکھے تھے۔ بمقابلہ ان خیالات کے جو وہ اخبارات کے ذریعہ ظاہر کرتا رہتا تھا زیادہ پروا کرتا تھا۔ سائنسی صداقتوں پر وہ دل سے فریفتہ تھا۔ اشاعت کا اخباری شعبہ جو اس نے سائنس سروس کے نام سے واشنگٹن میں قائم کیا تھا اور اسکرپس کا ادارہ تحقیق حیاتیات و تجربات جو اس نے مجھے فخریہ طور پر لا جولا میں دکھایا ایسے ادارے ہیں جو میرے تاثرات کے مطابق یونائیٹڈ پریس یا اسکرپس ہوارڈ سلسلے کے اخبارات سے زیادہ نمایاں طور پر اس کے دل و دماغ کی تخلیق ہیں۔ اس کی زندگی کے اس شعبہ میں اس کے محرکات خالص اور صاف ہوتے تھے۔

دنیادار انسان کی حیثیت سے اس کے سامنے دو مقاصد تھے جن کا یکجا ہونا مجھے خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ ایک تو دولتمند بننے کا پرجوش عزم۔ یعنی محفوظ طریقہ پر ہمیشہ

سرمایہ دار طبقہ میں شامل رہنا۔ وہ آغاز جوانی سے اس کلیہ کا قائل ہو گیا تھا کہ اُجرت لینے سے اُجرت دینا ایک زیادہ بابرکت فعل ہے اور اس کا اس داد و ستد میں ہمیشہ آجر کے مرتبہ پر فائز رہنے کا عزم فولاد کی طرح مضبوط تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ جبلی طور پر اہلِ ثروت سے نفرت کرتا تھا۔ اور اس صحافت سے اس کو دلی بیر تھا جس کا مقصد محض سرمایہ داروں کے مختلف گروہوں میں رابطۂ گفت و شنید پیدا کرنا ہو۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں اس کے بھائی جیمس (James.) نے جس کو شکاگو میں ایک اخبار میں نقصان ہو رہا تھا اس سے درخواست کی کہ یہاں آ کر اس اخبار کا انتظام سنبھال لے۔ ان دونوں نے ایک ہوٹل کے کمرہ میں بیٹھ کر جو ڈیربارن اسٹریٹ پر واقع تھا اس معاملہ پر گفتگو کی۔ گفتگو کے دَوران میں انھوں نے ایک ہنگامے اور چیخ پکار کا شور سُنا جو باہر سے آ رہا تھا۔ اس زمانہ میں جوڑی ہانکنے والوں کی ہڑتال زوروں پر تھی اور یہ اسی کے ایک ہنگامہ کا شور تھا۔ جب وہ نیچے کی طرف دیکھنے لگا تو جیمس نے دھیمی آواز میں کہا:

"کاش! میں اس شہر کا میئر ہوتا تو ان لوگوں کو قرار واقعی سبق دیتا۔"

اسکرپس نے کہا:۔

"تم ان ڈرائیوروں کو زدو کوب کرنا، گولی سے اُڑانا یا گرفتار کرنا چاہتے ہو، میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ کامیاب ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم تم مل کر کام نہیں کر سکتے۔ تمھیں اپنا کام خود ہی سنبھالنا ہوگا۔"

سیاسی اعتبار سے کرپس کے اخبارات آزاد تھے، اور ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے "امریکی پریس کو گروہ بندی کے امتیاز اور اس کی پابندیوں سے آزاد کرایا۔"

لیکن مزدوروں اور عوام سے جن کی تعداد اسکرپس کے تخمینہ کے مطابق آبادی کا ۹۵ فی صد تھی والہانہ وفاداری کے ساتھ وابستہ تھے۔ سی۔پی اور ۹۵ یہ دونوں دفتری مخففات تھے جو اسکرپس کے اخباروں میں ان کی وفاداری کے اس نصب العین کی جانب اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ مزدوروں کی حیثیت کو بلند کرنے کے لئے کوئی بھی اقدام کیا جاتا تو یہ اخبارات اس کی حمایت کرتے۔ مثلاً آٹھ گھنٹے کا دن، دوکانوں کا ایک دن بند رکھنا، اجتماعی طور پر بات چیت کا حق مزدوروں کا معاوضہ، بیمۂ ملازمین، احکام امتناعی کے خلاف قوانین، وغیرہ۔ انھوں نے انکم ٹیکس کی حمایت میں بھی جدوجہد کی تھی لیکن آگے چل کر اسکرپس کو اس بات پر افسوس ہوا کہ ایسے مضر معاشی اقدام کی حمایت کیوں کی؟

یہ بات اس کی فطرت میں تھی کہ مالدار اور تعلیم یافتہ طبقوں کے خلاف جو بھی مہم اُٹھائی جائے اس کی حمایت کی جائے۔ اپنے کسی بڑے دشمن کا ذکر کرتے وقت وہ ہمیشہ ان دونوں صفات کو اس پر چسپاں کردیا کرتا تھا، اور لطف یہ ہے کہ یہی اوصاف خود اس کی ذات پر بھی پورے طور پر چسپاں ہوتے تھے۔

اس قسم کی جنگ جو اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہے اکثر انسانوں کو اگر بالکل برباد نہیں کرتی تو شکست خوردہ ضرور کردیتی ہے۔ اکثر زمانوں اور ملکوں میں یہ صورت حال کسی شخص کی ہزیمت کا باعث ہوسکتی ہے، لیکن امریکہ کی صحافتی دنیا میں ۱۸۷۸ء سے ۱۹۱۶ء تک اِی۔ ڈبلیو۔ اسکرپس کے معاملہ میں اس جنگ نے بے پناہ شخصی فلاح کو پروان چڑھایا، اور نچلے طبقہ کے لوگوں کی حمایت میں کام آنے والے نہایت موثر حربوں میں سے ایک حربہ ثابت ہوئی۔

امریکہ میں اس زمانہ میں طبقاتی کشمکش زوروں پر تھی اور اسکرپس کے اخبارات نے ان کے نظریاتی عقائد سے سروکار نہ رکھتے ہوئے اُجرتی مزدوروں کی بڑھتی ہوئی جماعت کا ساتھ دیا۔ اس نے اپنے اخبارات میں مزدوروں کی انجمنوں کے مطالبات کی ہمیشہ پوری قوت اور استقلال کے ساتھ تائید کی۔ لیکن اس حد تک مصلحت بینی سے ضرور کام لیا کہ اشتراکیت کے خلاف کچھ نہ لکھا یا صرف اس قسم کے فقرے چست کرنے پر اکتفا کیا جیسے "معاشرہ کو کسی فرد سے فائدہ نہیں پہونچتا۔ دنیا میں وہی شخص کسی مقام کا مستحق ہے جو اپنا بوجھ خود اُٹھا سکتا ہے۔" یہ بھی اسی کا قول ہے اور اس میں زیادہ پختہ فراست پائی جاتی ہے کہ "طبقاتی جنگ ہمیشہ رہنے والی ہے۔" اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور نقاد نے جو مجھے ان ایام میں ملا اشتراکیت کی اصل حقیقت کو اتنے صاف اور صحیح طریقہ پر نہیں سمجھا جتنا کہ پس نے سمجھا تھا۔ اس نے یہ بیان کر کے مجھے حیرت میں ڈال دیا "غالباً تمہارا پروپیگنڈا بالآخر کامیاب ہو جائے گا"، اور اسی کے ساتھ اس نے یہ بالکل سچی پیشین گوئی کی کہ "جو چیز تم کو حاصل ہو گی وہ اس چیز سے جس کے بارے میں تم گفتگو کر رہے ہو اتنی مختلف ہو گی جتنی کہ موجودہ منظم عیسائیت حضرت عیسےٰؑ کے تصورات سے مختلف ہے۔"

اسکرپس نے جیسا کہ اسٹیفن نے پیشین گوئی کی تھی، میرے رسالہ کے لئے رقم دے دی لیکن اس نے اس رقم کو عطیہ کا نام دینے سے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک تجربہ ہے۔

"اگلے سال تم میرے پاس آؤ اور آمد و صرف کا حساب پیش کرو۔ اُس وقت میں یہ صحیح اندازہ کر سکوں گا کہ آیا میرا یہ عمل جذبات کے

تحت تھا یا عقل کے تقاضے کے مطابق تھا۔"

دوسرے سال میں نے اپنے کاروباری مینیجر سے ایسی رپورٹ تیار کرائی کہ جس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلے کہ اسکرپس کو اپنی امدادی رقم دوگنی کردینی چاہیئے میں نے اس پر یہ بات واضح کردی اور وہ رپورٹ پر اپنی نظریں جمائے رہا، پھر کہنے لگا: "میکس! تم خوب تقریر کرتے ہو لیکن میں یہ پہلے ہی سے جانتا ہوں، کیونکہ میں تم کو سینڈیگو میں تقریر کرتے سن چکا ہوں، مگر اس کاغذ پر جو حساب ہے اس سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تمھارا رسالہ ناکام رہا۔ ذاتی طور پر یہ پرچہ میرے لیئے مسرّت بخش ہے لیکن کاروباری لحاظ سے یہ کامیاب نہیں ہے۔ اس لئے تمھیں کسی مخیّر شخص کی تلاش کرنی چاہیئے۔ میں تو ایک کاروباری آدمی ہوں۔"

میں نے ایک مخیّر شخص کو ڈھونڈھ نکالا اور اگرچہ یہ قصّہ اسکرپس کی اس داستان سے زیادہ میری سوانح حیات سے تعلق رکھتا ہے لیکن میں اس کو یہاں دہرا دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کی وجہ سے ہماری باہمی رفاقت ایک مناسب اور خوش آئند انداز پر انجام پذیر ہوئی۔

ان لوگوں کی طرح جو مال و دولت کے دلدادہ ہوتے ہیں اسکرپس کو بھی اپنے خاندان کے ساتھ یگانگت رکھنے کا پورا خیال تھا۔ اس کی عمر بھر کی رہنمائی کے سبب اس کی بہن ایلن بھی اتنی ہی دولتمند ہوگئی تھی جتنا کہ خود اسکرپس تھا۔ وہ لاہویا میں سمندر کے قریب نشیبی حصہ میں رہتی تھی۔ اسکرپس نے مجھ سے رخصت ہونے سے قبل سہ پہر کے وقت کہا کہ آج تم ٹھہر جاؤ اور میری بہن سے مل لو۔ ایلن اسکرپس پتلی دُبلی عورت تھی اور ضعیفی کے باعث اس کی جلد زرد ہوگئی تھی اور اس پر

مگر مچھ کی سی جو کور ہیڑیاں بن گئی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے کسی چلتی پھرتی شے کو اتنا ضعیف نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے دماغ کی روشنی ابھی ماند نہیں پڑی تھی بجز اس کے کہ اس پر جذبات کا غلبہ ہو جاتا تھا لیکن اس کے جذبات اسکریپس کے مقابلہ میں زیادہ نیک اور فیض رساں تھے۔ اس کو مذہب اور سنڈے اسکولوں سے بہت لگاؤ تھا اور وہ مذہبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے لئے بڑی بڑی رقوم دیا کرتی تھی۔ اپنے بھائی کی ذات سے اس کو ان چیزوں سے بھی زیادہ وابستگی تھی اور چونکہ میرے تعلقات اس سے مخلصانہ تھے اس لئے اس نے میرا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ میں اس کے دروازے پر سے اسکریپس سے رخصت ہوا اور سواری میں بیٹھ کر چل دیا۔ لیکن میں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ میں ایلن اسکریپس کے باغ میں ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر دیکھتا رہا۔ جب اسکریپس چلا گیا تو چند لمحوں کے بعد میں نے دروازہ پر گھنٹی بجائی۔ اور ایلن سے کہا کہ میں ایک فوری خیال کے تحت واپس آگیا ہوں میں یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کیا آپ میرے رسالہ کی مدد کریں گی۔ میں نے اس کو بھی وہی حسابات دکھائے جو اسکریپس کو اطمینان دلانے کے لیے تیار کئے گئے تھے، اب پھر وہ حیرت انگیز طور پر واضح اور مدلل نظر آتے تھے۔

اس نے مجھ سے پوچھا:۔

"تمھارے پرچے کو کتنی امداد کی ضرورت ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی کہا:۔

"مجھے اس سال جو دینا تھا اس کا وعدہ میں ایک چھوٹے سے اخبار سے کر چکی ہوں جو ہمارے کلیسا کی طرف سے جاری ہونے والا ہے۔"

میں نے جواب دیا "مجھے سردست صرف چھ ہزار ڈالر کی ضرورت ہے۔"

اس نے کہا:۔

"مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں سردست اتنی رقم نہیں دے سکتی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یہ رقم مجھ سے تین سالانہ اقساط میں لے لو اور اپنا کام چلاؤ؟"

کئی سال بعد جب جو ڈیوڈسن نے اسکرپس کا مجسمہ تیار کیا تو بوڑھے اسکرپس نے بڑے جوش میں آکر بیان کیا کہ جب میں نے 'ٹائمینز' اخبار کے لئے چار ہزار ڈالر دینے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ کسی مخیر شخص کو تلاش کرو تو وہ (یعنی مولف) چلا گیا اور اسی کی مخیر بہن سے یہ رقم حاصل کر لی۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی بدولت اسکرپس کے دل میں میرا احترام کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔

# آئن شٹائن سے تین ملاقاتیں

البرٹ[1] آئن شٹائن سے میری پہلی ملاقات میری کتاب "لطفِ خندہ" (Enjoyment of Laughter) کے ناشرین ڈگ سائمن اور میکس شسٹر کی تدابیر سے ہوئی۔ اُس نے پولینڈ کے ایک ماہرِ ریاضی لیوپولڈ انفیلڈ کے اشتراک سے ایک عام مطالعہ کی کتاب لکھی تھی جس میں اس نے طبیعاتی علوم کی ترقی کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر کیا تھا۔ سائمن اور شسٹر اس کتاب کو عوام میں خوب مقبول کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تاکہ یہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو سکے۔ اس لئے دونوں مصنفوں اور ہر دو ناشروں کا ایک اجلاسِ مشورت ۲۰ اپریل ۱۹۳۷ء کو آئن شٹائن کے مکان واقع پرنسٹن[2] (Priucetan) نیوجرسی[3] (New Jeriey) میں ہونا قرار پایا تھا، جو سائنس

۱؎ البرٹ آئن شٹائن (۱۸۷۹ - ۱۹۵۴) شہرۂ آفاق جرمن نژاد یہودی النسل ماہرِ طبیعیات جو سائنس کی دنیا میں نظریۂ اضافیت کے موجد کی حیثیت سے زندہ جاوید شہرت کا حامل ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک جبکہ اس کو ہٹلر کے حکم سے جلاوطن کر دیا گیا تھا وہ قیصر ولیم کے فزیکل انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر رہا۔ برلن سے جلاوطن ہو کر اس نے ممالک متحدہ امریکہ میں قیام کیا جہاں وہ فزکس کا پروفیسر ہو گیا۔ اور نیوجرسی کے شہر پرنسٹن میں اعلیٰ تعلیم کے ادارہ کا مستقل ممبر بن گیا۔ اس کو ایٹمی توانائی کا پہلا موجد سمجھا جاتا ہے کیونکہ اسکے نظریہ متحدہ میدان نے قانون کشش کو دنیائے سائنس سے روشناس کرایا۔

۲؎ پرنسٹن۔ ریاست نیوجرسی کا ایک شہر ہے جو اپنی یونیورسٹی کیلئے مشہور ہے۔ ۳؎ نیوجرسی۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ہے جو نیویارک کے قریب ہے اور کاشتکاری پٹرولیم تیل اور ریشم کیلئے مشہور ہے۔ رقبہ ۷۵۲۲ مربع میل ہے اور آبادی ۵،۱۶۰،۱۶۵ ہے۔ (مترجم)

نے جس کی صاف گوئی بھی ایسی ہی دلفریب تھی جیسی کہ اس کی خوش طبعی، کیونکہ دونوں یکساں تھیں، مجھ سے کہا:

"میکس! ہم نے آئن شٹائن کے ساتھ ملاقات کا وقت مقرر کر لیا ہے اور بحیثیت ناشرین ہماری خواہش ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص بھی ہو جو کم از کم کھاؤ کے لئے یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ زیر بحث کتاب کے موضوع کو سمجھتا ہے۔"

اس کیفیت کے تحت اور اس رازدارانہ مقصد کو لئے ہوئے میں آئن شٹائن سے ملاقات کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کیلئے میں نے یہ طریقہ سوچا تھا کہ نفس مضمون یعنی عام سائنس سے گریز اختیار کئے بغیر میں آئن شٹائن کی کتاب کے موضوع کو بحد امکان زیر بحث نہیں لاؤں گا۔ میں نے کئی برس پہلے کولمبیا[1] یونیورسٹی میں اصول سائنس پر درس دیئے تھے اور میں یہ سمجھتا تھا کہ اب بھی میں بطور نمائش اس مضمون سے اپنی واقفیت کا اظہار کر سکوں گا۔ غرضکہ آئن شٹائن سے دو گھنٹے تک ملاقات ہوئی اور تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ یہ واقعہ میری زندگی کی نہایت خوشگوار یادگاروں میں سے ہے، اور خود اس نے بھی اس گفتگو میں اتنی دلچسپی لی تھی کہ اس کے بعد بھی اس نے مجھے سائمن اور شسٹر کے توسط کے بغیر دو اور ملاقاتوں کا شرف بخشا۔

ہم جب آئن شٹائن کی ملاقات کو گئے تو اس کی بیوی کو انتقال کئے ایک یا دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا اور ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ بہت غم زدہ اور افسردہ ہو گا۔ لیکن انفیلڈ کے الفاظ یہ تھے:۔

---

[1] کولمبیا یونیورسٹی۔ امریکہ کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ جس کو ایک مذہبی فرقہ نے ۱۷۵۴ء میں قائم کیا تھا جس میں ۱۸۸۳ء سے عورتوں کا بھی داخلہ شروع ہوا۔ (مترجم)

"وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو رہتا ہے، یا یوں سمجھیے کہ وہ اپنے ذہن کو دن، اس طرح مصروف رکھتا ہے کہ اسے کسی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

جس وقت ہم نے اس سے ملاقات کی تو وہ ایک پرانی طرز کے بدوضع لکڑی کے مکان میں سکونت پذیر تھا اس نوع کی بدوضعی امریکہ کے مکانوں میں اس قدر عام ہے کہ یہاں ہر متنفس اپنے خیالات کی دُنیا میں بسا ہوا یا کم از کم ذوقِ نظر سے ضرور بیگانہ معلوم ہوتا ہے لیکن ہم لوگوں سے اس نے مکان کے بالائی حصہ کے ایک زیرین کمرہ میں ملاقات کی جہیں بڑے آئینہ کی ایک کھڑکی تھی جس کی وجہ سے نگاہ بالکل قریب کے درختوں کے نظارہ میں ایسی محو ہو جاتی تھی کہ مکان کا بدوضع ہونا محسوس نہ ہوتا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید ہمارا یہ تصور کہ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا رہتا ہے صحیح نہ ہو، لیکن جب میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ یہ کھڑکی اس مکان میں پہلے سے تھی یا اس نے خود لگوائی ہے' تو اس نے جواب دیا:

"نہیں یہ کھڑکی میری بیوی نے لگوائی تھی۔ اوّل تو مجھے یہ بھلی نہ لگتی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب میں کسی مکان میں رہوں تو مجھے اُس کے اندر ہی رہنا سہنا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بات معقول ہے" حالانکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ اس میں کچھ زیادہ معقولیت نہیں ہے۔

اُس کے بال اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ نہ تو وہ بکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور نہ ان میں کنگھا کیا ہوا تھا، نکٹائی غائب تھی، پوشاک بھیلا نما معلوم ہوتی تھی، دانتوں کی حالت بہت خراب تھی، فرنیچر بہت فرسودہ ہو چکا تھا، غرضکہ آئن شٹائن کے ارد گرد کی ہر چیز صاف طور پر اس بات کی شاہد تھی کہ جس دُنیا کی حرکت کے قوانین

کا مطالعہ کرنے میں وہ ایسے والہانہ جوش سے مصروف ہے اُسی دُنیا کی حسی اقدار کی طرف سے وہ کس قدر غافل ہے۔

جیسا کہ میں نے ایک مقام پر ذکر کیا ہے مجھے عظیم شخصیتوں سے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں مل کر تعجب کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں نسائیت کا مادہ موجود ہے۔ آئن شٹائن کی ذات کے متعلق یہ احساس اور بھی زیادہ نمایاں طور پر ہوا اس کی وضع قطع اتنی جاذب نہیں تھی جتنی کہ وہ تنک مزاجی اور نزاکت کا پہلو لئے ہوئے تھی، اور اس کی جھومتی جھامتی چال سے تو ایک گداز جسم کی عمر رسیدہ عورت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر اتنا گوشت تھا کہ ان پر کوئی رگ یا جھری نظر نہیں آتی تھی اور بالکل بچوں کے سے ہاتھ معلوم ہوتے تھے۔ یہ عجیب و غریب جسمانی خول اپنے اندر ایک ایسے نفس کو چھپائے ہوا تھا جس کی تیزی اور طاقت اتنی زیادہ تھی کہ وہ زندگی اور گفتگو کے تمام طبعی مفروضات حتیٰ کہ طبعی اور کیمیاوی علوم سے متعلق تمام مفروضات کی تہ کو پہونچکر ریاضی کے ایسے مجردات تک رسائی حاصل کر سکتا تھا، جس میں ان کو جائز قرار دینے والے محسوس مشاہدات کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔

کتاب زیر بحث کی تاریخ اشاعت اور بیرونی آرائش کے متعلق کچھ یوں ہی سی بات چیت ہونے کے بعد ڈک سائمن نے جو فن فوٹو گرافی کا ماہر تھا۔ آئن شٹائن سے کہا کہ اگر تکلیف نہ ہو تو دو ایک فوٹو لینے کی اجازت دیجئے۔

آئن شٹائن نے کہا: "کوئی ہرج نہیں۔ یہ تو اب میرا پسندیدہ شغل ہے۔"

اس سلسلے میں اس نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا کہ ایک متجسس ہم سفر سے پالا پڑ گیا۔ اس کے سوال کرنے پر کہ میرا ذریعۂ

معاش کیا ہے" میں نے یہ کہہ کر اس سے پیچھا چھڑایا کہ میں فوٹوگرافروں کا ماڈل ہوں"۔

چونکہ اس روز خاصی گرمی تھی اس لئے تصویریں لینے کی غرض سے ہم مکان کے پیچھے ایک مختصر سے بلغیچے اور سبزہ زار میں چلے گئے۔ ہم دونوں آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے اس وقت دھوپ نورستہ پتوں میں سے چھن کر آرہی تھی اور ڈِک تصویریں لینے کے مناسب زاویوں کا ہوشیاری سے انتخاب کرنے کے لئے ہمارے گرد گھوم رہا تھا۔ اس موقع پر ہم نے کائنات کے متعلق گفتگو شروع کی تھی۔ جب ہم یہاں سے فارغ ہوکر واپس مکان جارہے تھے تو راستہ میں اثنار گفتگو میں ڈِک نے مجھے یقین دلایا کہ ایک دو تصویریں اتنی اچھی آئی ہیں کہ ان کو دیکھ کر آئندہ نسلیں تمھارے متعلق بلاشبہ یہہ باور کریں گی کہ تم ایک عظیم المرتبت انسان سے دوسرے درجے پر ضرور ہو، لیکن گھر پہونچتے ہی اس نے ٹیلیفون پر مجھے یہ افسوس ناک پیغام دیا کہ ابھی تک تم محض ایک فانی انسان ہو۔ کیونکہ وہ کیمرہ میں فلم ڈالنا بھول گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کوشش بیکار گئی۔ اب میں یہی کرسکتا تھا کہ اس موقع پر آئن شٹائن اور میرے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اور جس کو اس نے غیرفانی بنانے کی کوشش کی تھی اس کا خلاصہ پوری احتیاط سے ضبطِ تحریر میں لے آؤں۔

مجھ سے آئن شٹائن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ گو وہ تشبیہی خدا کا قائل نہیں لیکن وہ اپنے آپ کو دین دار ہستیوں میں شمار کرتا ہے اور ماہرینِ سائنس کائنات سے متعلق جو معقول علم حاصل کرنے کی سرگرم کوشش کرتے ہیں اس کو وہ اصلی اور بلند ترین معنوں میں "مذہب" سمجھتا ہے۔ میں نے اس کے روبرو یہ اظہار رائے کیا کہ میں آپ کو صحیح معنوں میں مذہبی آدمی ماننے سے قاصر ہوں اور لفظ مذہب کا آپ کے نزدیک جو مفہوم ہے

میں اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا ہوں۔ پھر میں نے کہا صحیح فکر کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ مذہب اس اتفاق پر دلالت کرے کہ ماورائے عالم کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو انسان کے مفادات سے ہمدردی رکھتی ہے۔

آئن شٹائن نے جواب میں کہا "مذہب کے آغاز اور ابتدائی ارتقا کے متعلق تو یہ خیال درست ہے۔ قدیمی مذہب کے لئے جس کی بنیاد خوف پر تھی یہ کہنا صحیح ہے اور اس میں سے معاشرتی اور اخلاقی مذہب کی جو شاخیں پھوٹی ہیں وہ بھی اسی کے ذیل میں آتی ہیں۔

اس نے یہ تسلیم کیا کہ ان دونوں صورتوں میں مذہب یہ فرض کر لیتا ہے کہ خارجی عالم میں کوئی ایسی قوت یا قوتیں موجود ہیں جو انسانی مفادات کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہیں۔ لیکن اس نے کہا کہ ان سے بلند تر سطح پر بھی ایک مذہب ہے جو خوف و بیم سے بالکل آزاد ہے اور جس کو اخلاقیات سے بھی کوئی تعلق نہیں، اس بلند تر مذہب کی تعریف اس کے ذہن میں یہ تھی کہ یہ آفاقی ہستی کے سامنے عجز و انکسار کی یہ کیفیت ہے۔

اس موقع پر جو گفتگو ہوئی وہ حرف بحرف تو میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے لیکن لفظ عجز مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے عقل و فراست سے ترتیب پائی ہوئی کائنات کی عظمت و جلال کے مقابلہ میں انسانی مقاصد و خواہشات کی کم مائیگی پر بہت زور دیا۔ اس کو اس بات کا یقین تھا کہ نیوٹن[1] (Newton) کیپلر

---

[1] ۱۶۴۲ء سے ۱۷۲۷ء مشہور برطانوی ماہر طبیعیات و ریاضی جس نے قانون حرکت دریافت کیا۔

(مترجم)

(Kepler.[1]) اور نتیجۃً خود اس کو بھی کائنات کا ادراک حاصل کرنے کی صبر آزما تگ ودو میں جس چیز نے سہارا دیا وہ یہی مذہبی احساس تھا۔

لیکن مجھے اس مسئلہ میں بعض شکوک تھے۔ ایک حقیقی ماہر سائنس جو مثلاً گھونگھوں یا کیڑوں کی تحقیقات کے متعلق عالمگیر سند حاصل کرنا چاہیے وہ بھی موضوع کی تقدیس کا قائل ہوئے بغیر اپنے کام اور اس کی صداقت سے اتنا ہی شغف ظاہر کرتا ہے۔ میں نے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا اور ممکن ہے میں نے اس اظہار رائے کی بھی جسارت کی ہو کہ حقیقت کائنات کا مجموعی طور پر مطالعہ کرنے والوں کے انہماک اور نیت کو غیر معمولی طور پر مشقت طلب اور قابل احترام تصور کرتے ہیں پیشہ ورانہ افتخار کا جذبہ کارفرما ہے۔ بہرحال ہمارا اختلاف رائے کچھ اس نوعیت کا تھا اور اس نے مذہب کا جو رشتہ عجز و انکسار سے قایم کیا تھا اس کے جواب میں میں نے اس سے کہا کہ مظاہر قدرت کے سامنے کسی حد تک اظہار عجز سائنس کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اگر ہم اس روش کو مذہب سمجھ لیں تو اس سے عوام کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہو جائے گا اور سائنس میں فوق العادت خیالات شامل کرنے کا رجحان پیدا ہو جائے گا۔"

آئن شٹائن نے اس نظریئے سے شدید اختلاف نہ کیا، اس کا یہ منشا نہیں تھا کہ سائنس کے مسائل میں مافوق العادت تصورات کو داخل کر لیا جائے لیکن اس نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ اس وقت سورج کی روشنی باغ کی فضا سے غائب ہو رہی تھی اس لیئے ہماری گفتگو درمیان ہی میں ختم ہو گئی۔ ڈک اپنی آخری خیالی تصویریں لے چکا تھا۔ آئن شٹائن نے

[1] ۱۵۷۱ء سے ۱۶۳۰ء جرمنی کا ماہر فلکیات جس نے حرکت سیارگان کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا۔ (مترجم)

تجویز کیا کہ ہم لوگ برساتی میں چلیں جو مطبخ سے بالکل قریب ہے۔ اور وہاں چائے نوشی کے ساتھ ساتھ ہماری گفتگو جاری رہے گی۔ جب ہم ایک مختصر سی چائے کی میز کے گرد کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے تو ہماری گفتگو کا موضوع جیسا کہ اکثر ہوتا ہے مذہب سے بدل کر مسئلہ جبر پر آگیا۔ ڈک اور میکس شسٹر نے اس بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ڈک نے بعد میں اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ اس موضوع کو سمجھ ہی نہیں سکا اگرچہ مجھے اس کے اس بیان کی صداقت میں شک ہے۔ انفیلڈ بھی خاموش بیٹھا رہا۔ گو اس نے اپنے سکوت کی اس سے مختلف وجہ بیان کی۔

مجھ میں ضرورت سے زیادہ جھجک موجود ہے لیکن جس معصومانہ وسعت قلب کے ساتھ آئن شٹائن دوسرے لوگوں کی ہر قسم کی گفتگو اور بیانات پر اپنی توجہ مبذول کرتا تھا اور جس طرح بچوں کے سے اشتیاق کے ساتھ وہ اپنی پر مسرت آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہتا تھا اس سے میری جھجک بالکل دور ہو گئی۔ میں اپنے ایام جوانی میں فلسفے کے نائب مدرس کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا اس وقت بھی مجھ میں اس عہد کی جسارت عود کر آئی اور میں نے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ آپ نظریۂ علت و معلول سے پیدا شدہ جبر کی ہمہ گیری کا ذکر غیر معمولی تیقن کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس کا عملی تجربہ کرتے میں اس اصول کا ترک کرنا کوئی مفید بات نہیں لیکن اس کو عمومیت دینے سے تو تمام سائنسی حقائق کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔ "اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی ذہن فیصلہ پر پہونچنے کے لئے اسباب ماسبق کا محتاج ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان فیصلوں میں عقلی وجوہ کو کچھ دخل نہیں جن پر ان کا دار و مدار فرض کر لیا گیا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئن شٹائن نے بحث کے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ میرا کسی ایسے آدمی سے سابقہ نہیں پڑا جس نے اس مسئلہ پر غور کیا ہو حالانکہ میری رائے میں عقیدۂ جبر کے خلاف یہ ایک واضح دلیل ہے۔ تاہم وہ اس موضوع پر بحث کرتا رہا گویا کہ یہ ایک نئے قسم کا کھیل ہے جس میں ہم مشغول ہیں تھوڑی دیر بے مقصد رد و قدح کرنے کے بعد اس نے کہا "جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام واقعات سلسلۂ اسباب و علل میں جکڑے ہوئے ہیں تو ہماری نظر صورت حال کے صرف ایک پہلو پر ہوتی ہے، اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دماغ شواہد کی بنا پر فیصلہ کرتا ہے تو اس کا دوسرا پہلو ہوتا ہے"۔ میں نے جواب دیا "لیکن یہ تو محض گریز کا ایک حیلہ ہے۔ اگر ہمیں فلسفیانہ انداز میں فیصلہ کرنا ہے تو ہم بنیادی صداقت کو دو زاویوں میں اُلجھا کر نہیں چھوڑ سکتے"۔

اس نے میری رائے سے اتفاق کیا لیکن جواب میں اس نے وہ مشکلات بیان کیں جو عقیدۂ اختیار کے تصوّر میں پیش آتی ہیں۔ میں نے تسلیم کیا کہ اصل صورت حال کی توضیح کرنے میں یہ تصوّر بھی بنیادی طور پر ہمہ گیر سلسلۂ علت و معلول کے نظریہ سے زیادہ کارآمد یا قابلِ جواز نہیں ہے میرا فلسفہ تو تمامتر اس تشکک پر مشتمل ہے کہ انسانی دماغ کسی بنیادی مسئلہ کو جس سے دراصل انسان کا سابقہ پڑتا ہے حل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، اور دیگر منفی نوعیت کے مواقف کی طرح اس موقف کی تائید بھی مشکل نہیں ہے۔

بحث طویل اور پیچیدہ ہوتی جارہی تھی اور قدرتاً مجھے وہی باتیں زیادہ یاد ہیں جو میری طرف سے پیش کی گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اس سے کہا کہ اخلاقی آزادی

کے متعلق مجھے زیادہ تشویش نہیں ہے۔ بلکہ مجھے یہ فکر ہے کہ جو رائیں اور دلیلیں ہمارے جیسے مباحث میں سامنے آتی ہیں وہ قابلِ اعتماد ہونی چاہئیں اور جن نتیجوں پر ہم پہونچتے ہیں (اگر پہونچیں) وہ صحیح ہوں تو اسے بڑا تعجب ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہونچے۔ مسئلہ جبر و قدر کے جھگڑے میں کبھی کوئی کسی آخری فیصلہ پر نہیں پہونچا ہے، لیکن اس بحث کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ اس نے میرے موقف کو بڑی صفائی اور زور کے ساتھ جرمن زبان میں انفیلڈ کے سامنے بیان کیا۔ اس نے کہا "اس شخص کا مطلب یہ ہے کہ فیصلہ اگر مبنی بر واقعات بھی ہو تو بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہو۔

میں نے کہا "جب تم اس کی جرمن زبان میں تشریح کرتے ہو تو یہ ایسا دلفریب معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ میرا موقف درست ہے"!

اس کا جواب اس نے پُرمسرت تبسم کے ساتھ دیا اور موضوعِ گفتگو کو پھر اسی مذہب اور سائنس کے مسئلہ پر لے گیا جہاں سے یہ گفتگو شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں بھی مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ میں بڑی چرب زبانی سے کام لیتا رہا اور مجھے اُمید ہے میری اس جسارت کی وجہ اس کا پُرکشش اندازِ استفسار سمجھا جائے گا نہ یہ کہ میں اپنے خیالات میں اپنی انانیت کے باعث مستغرق تھا۔

میں نے ہارپرس میگزین (Harpers Magazine.[1]) میں ایک مقالہ

---

[1] ہارپر میگزین۔ یہ رسالہ ۱۸۵۰ء میں ہنری ایلڈن ملز کی زیرِ ادارت جاری ہوا شروع شروع میں یورپ کے رسائل و جرائد کے مضامین نقل کر کے شائع کیا کرتا تھا۔

مارکس (Marks.)[1] کے نظریہ پر لکھا تھا اور یہ سمجھانے کے لئے کہ میں نے جو مذہب کے بارے میں یہ کہا تھا کہ اس میں یہ عقیدہ لازماً موجود ہوتا ہے کہ خارجی دُنیا یا اس کے اندر کی کوئی شے انسانی مفادات کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے۔ میں نے مارکس کے فلسفہ جدلیت کو پیش کیا تھا۔

میں نے کہا "اگرچہ مارکس کا نظریہ سائنس پر مبنی ہونے کا مدعی ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک مذہب ہے۔ مارکس نے اعلان کیا کہ کائنات کی تعمیر مادّہ سے ہوئی ہے لیکن اس کی تفتیش پراسرار طور پر اس نتیجہ پر پہونچی کہ یہ مادّی دُنیا جدلیت کے قانون کے تحت وہی خصوصیت حاصل کر رہی ہے جو وہ چاہتا تھا کہ اسے حاصل ہو۔ اس کا سارا فلسفہ یہ ثابت کرنے کی ایک عظیم کوشش تھی کہ خارجی کائنات پرولتاری انقلاب کی موافقت میں ہے اور اس کی مدد کر رہی ہے"۔

اپنی اس کامیابی سے کسی قدر دلیر ہو کر میں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ جان ڈیوی (John Dewey.) کا فلسفہ علیت بھی اس قسم کی ایک کوشش ہے۔ ڈیوی خارجی واقعات اور انسانی اختیار و ارادہ میں ہم آہنگی اس عقیدہ کے ذریعے پیدا کرتا ہے کہ

---

[1] ہینرک کرل مارکس۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۳ء تک ایک مشہور جرمن سیاسی اور اقتصادیات کا فلاسفر تھا۔ اینجلز کا بہت عزیز دوست تھا۔ یورپ سے جلاوطن ہونے کے بعد انگلینڈ میں اقامت گزین ہوا مشہور فلاسفر ہیگل کا متبع تھا۔ لیکن نظریہ جدلی مادیت کو منضبط کرنے میں اپنے اُستاد سے بھی آگے بڑھ گیا۔ لندن کے قیام کے زمانہ میں اس نے اپنی مشہور کتاب داس کیپٹل شائع کی۔ جو موجودہ کمیونزم کی اصل بنیاد ہے۔ اس کا نظریہ جو مارکسزم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہے کہ ہر چیز کی قیمت محنت اور مشقت کے اعتبار سے جو اس پر صرف کی گئی ہے قایم کی جاتی ہے۔ محنت کش طبقہ اپنی ضروریات سے زیادہ اشیا تیار کرتا ہے۔ لیکن آج کل کے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مزدور طبقہ کو منافع آمدنی میں سے کچھ بھی حصہ نہیں ملتا۔ اسلئے سرمایہ دار بنیادی طور پر مزدور کا دشمن ہے۔

واقعات کے تعین کے عمل میں انسانی ارادہ بھی شامل ہے۔"

آئن شٹائن نے میری تقریر کے اس آخری حصہ کا کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ شرارت انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میز کے ارد گرد دیکھتا رہا اور صرف یہ کہا "یہ شخص شریر ہے بہت شریر!"

دروازہ پر جب ہم الوداعی مصافحہ کرنے لگے تو اس نے کہا "آج کی گفتگو بہت پر لطف رہی!" مجھے ندامت کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ میں اپنی یادداشت میں اس کی گفتگو کا بہت ہی تھوڑا حصہ لکھ سکا اور اب یاد سے بھی بیان نہیں کر سکتا۔

۲۔ ہماری دوسری ملاقات انفیلڈ کے توسّل سے ہوئی۔ اس نے مجھے ۲۲ اپریل کو تحریر کیا:۔

"آئن شٹائن اور میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور آپ کی ملاقات سے انتہائی لطف اُٹھایا تھا۔ اگر آپ آئن شٹائن کے ساتھ سلسلۂ بحث جاری رکھنا چاہیں تو میں دوسری ملاقات کا آسانی سے انتظام کر سکتا ہوں۔ اسی موقع پر میں اس کتاب کے بارے میں جو ہم لکھ رہے ہیں چند ضروری معاملات پر آپ سے مشورہ بھی کر لوں گا۔ جواب سے مطلع فرمائیے۔"

مجھے لازماً اس بات سے خوشی ہوئی اور مئی کے شروع میں مجھے پھر آئن شٹائن سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ اب کی مرتبہ میں پرنسٹن تنہا گیا اور اپنی مہم میں تنوّع پیدا کرنے کے لئے میں راستے میں واکر گورڈن ڈیری فارم کی پانچ ہزار گایوں کو دیکھنے کے لئے تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔ انفیلڈ اسٹیشن مجھے لینے آیا تھا۔ جب ہم دونوں آئن شٹائن کے یہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے کھانے کے کمرے کی میز پر جھکا ہوا بڑے اطمینان سے ایک پیڈ پر جو مساوات کے سوالوں سے پُر تھا غور کر رہا تھا۔

اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آئن سٹائن کے دماغ سے خیالات غالباً ایسے ہی اطمینان کے ساتھ اور بغیر کسی رکاوٹ کے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ واکر گورڈن ڈیری فارم کی گائیں دودھ دیتی ہیں۔ دونوں میں موازنہ کرنے سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آئن شٹائن کو اس میں تفوق حاصل ہے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کا اندازِ حیات میرے مسرّت انگیز معیارِ زندگی پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ یہ گائیں اپنے تھانوں پر کھڑی ہوئی پورے سال رات دن چرتے رہنے، سونے یا جگالی کرنے میں بسر کرتی ہیں اور ان کی تفریح صرف اس قدر ہے کہ دن میں دو مرتبہ ایک زیر زمین ڈھلوان جگہ پر سے گزرتی ہوئیں دوسری عمارت میں ایک گھومنے والے بلیٹ فارم کے قریب پہونچ جاتی ہیں جو ان میں سے بیس بیس کو باری باری سے پورے دس منٹ تک گھماتی ہے۔ اس عرصہ میں ہر ایک گائے نہا بھی لیتی ہے اور ایک بجلی کی مشین کے ذریعہ اس کا دودھ بھی دوہ لیا جاتا ہے۔ پھر وہ واپس ایک دوسری ڈھلواں جگہ پر سے ہوتی ہوئی اپنے تھانوں پر چلی جاتی ہیں۔ اگرچہ اس سے زندگی میں حوادث کے موجود ہونے کے متعلق میرے جو نظریات ہیں ان کا بطلان ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں نے آج تک اتنی خوش و خرّم گائیں کبھی نہیں دیکھیں

یہ موازنہ ایک حد تک شاید احمقانہ معلوم ہوتا ہے اور جذبۂ احترام کے بھی منافی ہے، لیکن میرا دونوں جگہ جانا بالکل ایک ہی وقت میں ہوا تھا اسلئے میں اس خیال سے باز نہیں رہ سکا۔ اس وقت آئن شٹائن بھی پورے طور پر مطمئن اور خوش معلوم ہوتا تھا۔ انفیلڈ کے یہ جملے "وہ ہمیشہ اپنے خیالات میں محو رہتا ہے۔" "اس کو تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔" پھر مجھے یاد آگئے اور

میں یہ غور کرنے لگا کہ غالباً یہ جگہ رہنے کے لیئے سب سے زیادہ محفوظ اور پُرامن ہے۔

آئن شٹائن مجھ سے دوبارہ اس لیئے ملنا چاہتا تھا کہ علّت و معلول پر بحث کرتے ہوئے میں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی وجہ سے اس میں اس موضوع پر شدّت کے ساتھ غور و خوض کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی تھی وہ مجھے اپنے نئے خیالات بتانا چاہتا تھا۔ وہ گفتگو شروع کرنے کے لئے بے چین نظر آتا تھا حتیٰ کہ ہم پھر اس موضوع پر آئے اور وہ اپنا نیا موقف اس طرح شوق سے پیش کرنے لگا جس طرح کہ کوئی بچہ ایسی چیز دکھاتا ہے جو اس نے کسی شکستہ کھلونے سے بنالی ہو۔ کانٹ[1] (Kant.) کے انداز میں یہ گفتگو اس بیان سے شروع ہوئی کہ قانونِ علّت و معلول واقعات کی مشاہدہ شدہ ترتیب پر حاوی نہیں ہے یا یہ کہ اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ قانون زیادہ تر تصوّراتی نظام سے متعلق ہے جس کے ذریعہ ظہورِ واقعات کی توجیہ کی جاتی ہے، لیکن بعض واقعات کی ایسے تصوّراتی نظام کے ذریعے بہتر طریق پر توجیہ کی جا سکتی ہے جو اصول علّت و معلول کو ہمہ گیر عمومیت نہیں دیتا اور اس کے برخلاف یہ فرض کر لیتا ہے کہ بعض قسم کے واقعات بلا اسباب کے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر کانٹ کے نظریہ سے کافی مختلف تھا۔

---

[1] کانٹ اور اس کا فلسفہ۔ مشہور جرمن فلاسفر جو ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۷۰ء میں کونگزبرگ میں فلسفہ کا پروفیسر ہو گیا اور ۱۷۹۷ء تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کی مشہور کتاب کا نام عقل مجرد کے نکتہ چیں۔ اسکے اصول و نظریات نے بعد کے آنیوالے فلسفیوں کو بہت متاثر کیا۔ کانٹ کا عقیدہ ہے کہ ہمارے تمام تصورات خلا اور وقت پر منحصر ہیں۔ (مترجم)

یعنی اس خیال کے متعلق بعض افواہیں یا ماہرین طبیعات کے درمیان اس بارے میں جو نزاع پیدا ہوا ہے اس کے متعلق کچھ سُنا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا یہ محض قیاس آرائی ہے یا کوئی ایسا تصوّر ہے جس سے حقیقت میں کوئی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ حقیقتاً اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا "بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ منفرد واقعات کے بڑے مجموعوں کا حساب قانونِ اغلبیت (Probablity) کے مطابق اس مفروضہ کی بنیاد ہی پر لگایا جاتا ہے کہ ہر ایک منفرد واقعہ محض اتفاق (chance) کی پیداوار ہے ہمارے قوانین کا تعلق مجموعوں ہی سے ہوتا ہے اور وہ صحیح ثابت ہوتے ہیں۔"

یہ خیالات جن کو میں نے اپنے خیال میں تقریباً حرف بحرف دہرا دیا ہے، کافی دلچسپی کے حامل ہیں کیونکہ اس موقف کی بالکل تردید کرتے ہیں جس پر اس نزاع کے آغاز سے آئن سٹائن بہت سختی کے ساتھ قائم تھا۔ اس نے اپنے اس ذہنی انقلاب کی اطلاع پہنچانے کے لئے سب سے پہلے میرا انتخاب کیوں کیا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب ہم مکان سے باہر آئے تو میں نے دیکھا کہ انفیلڈ آئن سٹائن کے اس اظہارِ خیال پر جوشِ مسرّت سے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

وہ جوش میں کہنے لگا "تم دیکھتے ہو وہ کتنا آگے نکل گیا ہے!"

میں نے تو کچھ محسوس نہ کیا لیکن وہ پُر مسرّت لہجہ میں یہ کہتا رہا کہ ان بیانات سے آئن سٹائن کے دماغ میں مکمل تبدیلی کا پتہ چلتا ہے، گویا یہ نوجوانوں کے آگے اعترافِ شکست ہے۔

مسز انفیلڈ کار میں آگئی تھی۔ جب ہم اُس سے ملے تو انفیلڈ نے اس سے بھی یہ عظیم خبر ایسے پُرجوش طریقے پر بیان کی کہ گویا پرسٹن نے فٹ بال کا میچ جیت لیا ہے یا پولینڈ نے جنگ میں کامیابی حاصل کرلی ہے، اور یہ کہ اس کامیابی کے حاصل کرنے میں خود اس نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ وہ کہنے لگا:

"میں ایک سال سے اس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہا ہوں اور میری کوشش کا نتیجہ اب نکلا ہے۔" جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے مزید کہا: "آپ نے دیکھا ہوگا کہ گزشتہ ملاقات میں جب آپ لوگ علت و معلول کے مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے تو میں خاموش تھا اور میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا"

میں نے کہا درحقیقت اس کے انداز گفتگو نے مجھے ایسا کہنے پر مجبور کردیا۔

"بے شک میں نے اس کو محسوس کرلیا تھا، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ تمھیں ایک آدمی ہو جس نے اس کو اپنے کٹر عقائد کی نیند سے بیدار کیا!"

وہ نہ تو مسکرایا اور نہ اس نے اس بات میں میری انانیت کے رُخ کا کوئی احساس کیا، لیکن اس کی بیوی مسکرائی۔ کہ گویا اس کو یہ احساس ہوا تھا۔

۳۔ ۶ر جون کو مجھے انفیلڈ کا ایک اور خط ملا جس میں تحریر تھا: "کیا آپ آئندہ ہفتہ میں جمعرات یا جمعہ یا سنیچر کو پرسٹن آسکیں گے؟ آئن شٹائن ابھی یہیں ہے، مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آپ سے پھر ملاقات کرکے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔"

میں پہونچا اور اس مرتبہ میکس شسٹر بھی مرے ساتھ تھا، لیکن! افسوس ہو

کہ ڈک سائمن مع اپنے کیمرہ کے ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ بقائے دوام کی اُمید ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ لیکن میں اپنے ساتھ رسالہ "ہارپر" کا ایک نسخہ لے گیا تھا جس میں نظریہ مارکس پر میرا ایک مضمون تھا، اور دل ہی دل میں اس خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ میرے مضمون کو پڑھنے والوں میں کم از کم ایک اتنی بڑی شخصیت کا انسان شامل ہوگا۔ ہم انفیلڈ کے کمرہ میں جو نمبر ۲ وانڈیورٹر ایوینیو (Wandeverter n T Avonue.e) کی زیرین منزل پر تھا ملے۔ آج بھی مطلع صاف تھا۔ آئن شٹائن چند منٹ میں گلی ہی سے خراماں آپہونچا، وہ ننگے سر تھا اور ایک طالب علم کی طرح کھلی ہوئی قمیص اور بھورے چمڑے کا ایک پرانا ونڈ بریکر اور سٹینس کے جوتے بغیر موزوں کے پہنے ہوئے تھا۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی وہ چلایا، "یہ کیا ہے، کیا کوئی سویٹ کی مقبول عام کتاب ہے؟" وہ بہت ہی پُرکشش گفتگو کرنے کے انداز میں تھا اور اس مرتبہ میں نے انکسار سے کام لیتے ہوئے اس کو گفتگو کرنے کا موقع دیا، اور میں خود دل ہی دل میں اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کے خیالات کی گہرائی، صفائی اور مسرت انگیز تنوع کی تعریف کرتا رہا۔

مجھے یاد ہے میکس شسٹر نے یہ دریافت کیا کہ کیا اس کا کوئی امکان ہے کہ علم کیمیا پر بھی کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جیسی کہ انھوں نے علم طبیعات پر لکھی ہے اور انفیلڈ نے اس کا یہ جواب دیا کہ "کیمیا اس قدر غیر دلچسپ مضمون ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمھیں کوئی آدمی اس مضمون پر کتاب لکھنے کے لئے مل جائے گا۔" آئن شٹائن نے بھی تائید کی کہ کیمسٹری واقعی بہت غیر دلچسپ ہے۔ مجھے یہ ایک عجیب رائے معلوم ہوئی

کیونکہ میں یہ خیال کرتا تھا کہ ایٹم کی دریافت نے علم کیمیا اور علم طبیعیات کے امتیاز کو قریب قریب ناپید کر دیا ہے۔

ہم نے پھر ان لوگوں کا ذکر شروع کر دیا جو سائنس کے اقتدار کو مذہبی اعتقادات کی تبلیغ میں استعمال کرتے ہیں۔ میں نے جینس Geans اور ایڈنگٹن Eddington کی تصانیف کا ذکر کیا اور آئن سٹائن نے مجھ سے بھی زیادہ پُر زور الفاظ میں کہا: "یہ بُری کتابیں ہیں، یہ دیانت دارانہ تصانیف نہیں ہیں، لیکن یہ لوگ پھر بھی عظیم الشان ماہر فلکیات اور مشہور اہل قلم سمجھے جاتے ہیں ـــ کوئی ایسا آدمی ملنا مشکل ہے جو محض صداقت کی بنیاد پر ان کی مخالفت کر سکے۔"

ہم نے سیاسیات پر گفتگو شروع کی اور مجھے یہ ماننا پڑا کہ آئن سٹائن ایک نہایت تیز اور قوی سیاسی فراست کا مالک ہے۔ اس نے یہ پیشین گوئی کی کہ اگر ہٹلر تمام یورپ پر اقتدار قایم کرنے کے ارادے میں کامیاب ہو گیا تو امریکہ کو لڑائی میں دخل دینا پڑے گا۔" اس وجہ سے نہیں کہ اس پر حملہ کیا جائے گا بلکہ فاشزم کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر" اس نے اسٹالن اور ہٹلر کے درمیان معاہدہ ہو جانے کی بھی پیشنگوئی کی۔ اس زمانہ میں پُرانے بالشویکوں پر ماسکو میں مقدمہ چلانے کے دوران میں لوگوں نے جو "اعترافات" کئے تھے اس کے متعلق اس نے کہا۔ "یقیناً یہ سچے نہیں ہیں، یہ ناممکن ہے کہ بیس اشخاص جن کو ایک سازش کے جرم میں ماخوذ کیا گیا ہو، وہ بالکل یکساں طریقہ پر بیان دیں، اور وہ بھی ایسے خلافِ فطرت طریقہ پر کہ جس سے وہ عوام میں اپنے آپ کو بدنام کر لیں۔"

میرے اس بیان پر کہ اگر فرانسیسی وزیر اعظم لیوں بلم[۵۱] (Leon Blum)

۵۱؎ فرانس کا پہلا سوشلسٹ وزیر اعظم۔ مصنف اور نقاد بھی تھا۔ جنگ دوم میں ۱۹۴۲ء میں اس پر مقدمہ چلا اور ۱۹۴۵ء تک جرمنوں کی قید میں

اسپینی جمہوریت کی درخواست پر سامان جنگ مہیا کر دیتا تو اسپین میں خانہ جنگی نہ ہوتی"۔ اُس نے جواب دیا "یہ تو صحیح ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ بلم کو اپنے ملک میں ایک بڑی دُشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ فرانسیسی فوج کا نصف سے زیادہ حصّہ فاشسٹی خیال کا تھا۔ بے شک ایسا کرنے کی اس میں فراست نہیں تھی، لیکن اگر وہ فراست سے بہرہ ور ہوتا تب بھی وہ اس کام کو کرنے کی قوّت نہ رکھتا تھا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اگر بلم ایک زیادہ عظیم المرتبت انسان ہوتا تو وہ اس اقدام کی جرأت کرتا اور اس کو کر بھی سکتا"۔

اس کا یہ قول کہ "وقت جمہوریتوں کے خلاف جا رہا ہے"۔ میں نے لکھ لیا اور یہ بھی لکھ لیا کہ "ان کو چاہیے تھا کہ فاشزم کو جنم لیتے ہی یا اس سے پہلے ہی کچل ڈالتے۔ اب بھی وہ اس کو ختم کر دیں تو اچھا ہے"۔ اس کا یہ منشا تھا کہ اس کو طاقت کے زور سے ختم کر دیا جائے اور چونکہ آئن شٹائن آج سے دس سال پہلے ایک انتہائی امن پسند اور شدید مخالف جنگ کی حیثیت سے میرے سیاسی شعور پر اثر انداز ہوا تھا اس لیئے اس کی موجودہ رائے سے اس کی قوتِ فیصلہ کی حقیقت پسندی اور لچک کا اظہار ہوا جس سے مجھے خوشی ہوئی۔

ان خیالات سے جن کا اظہار اس نے ۱۹۲۷ء میں کیا تھا یہ بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ جنگ کے بعد وہ کمیونسٹ سازش کا سب سے زیادہ پرجوش آلۂ کار بن جائے گا۔ اس پچھلے عہد میں اس نے بلا پس و پیش کمیونسٹوں کے جھمیلوں میں اپنا نام شامل کر دیا۔ اس نے کمیونسٹ رسالہ "آج کا سوویت روس (Soviet Russian Today.)" کے لئے مضامین لکھے

اس نے ہالی وڈ ٹین 'Hollywood Ten' کی جن کو کانگریس کی توہین کرنے کے الزام میں سزائے قید ہوگئی تھی حمایت کرنے کی کوشش کی، حالانکہ ان میں سے سب نہیں تو اکثر بہت ایسے لوگوں کی تھی جو کمیونسٹ پارٹی کے رُکن تھے۔ اس نے ایک مراسلے کے ذریعہ تمام روشن خیال لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی علانیہ سازش کا جسے عمالِ حکومت ناکام بنانے کے لیئے کانگریسی تحقیقات کے ذریعہ کوشش کر رہے تھے مقابلہ کریں گویا کوئی بھی حکومت ایسی سازش سے چشم پوشی کرکے باقی رہ سکتی تھی اس نے اپنے اس یقین کا اعلان کردیا کہ دُنیا کی تمام خرابیاں اشتراکی نظامِ معیشت کے قیام ہی سے دور ہوسکتی ہیں اور اس نے اپنے ان دعاوی کا اظہار رسالہ "ماسیز اینڈ مین اسٹریم" (Masses and Main Stream.) کے صفحات میں کیا جو کمیونسٹ پارٹی کے حامی شائع کرتے تھے اور جس کا صفحہ صفحہ سوویٹ آمریت کی حمایت کے لیئے وقف تھا۔ اس نے ایسا موقف اختیار کرلیا کہ کمیونسٹ اخبار ڈیلی ورکر (Daily worker) نے اس کو ان الفاظ میں داد دی "یہ متحدہ محاذ کی جیتی جاگتی علامت ہے"۔ حالانکہ متحدہ محاذ حقیقت میں خوشامد اور غدّاری کا ایک بدترین فریب تھا جو انسانیت کے خلاف کسی زمانہ میں عمل میں لایا گیا ہو۔

دوسری جنگ عظیم کے دس سالہ عہد میں آئن ٹسٹائن نے کن اسباب سے اپنے معتقدات میں نرمی اختیار کی اس کی تشریح میرے اس بیان کے موضوع سے خارج ہے ۱۹۳۷ء میں وہ اس بات پر آمادہ تھا کہ ہٹلر کی آمریت کا بزورِ قوت انسداد کیا جائے، لیکن ۱۹۴۷ء میں جب اسٹالن کی اس سے بھی زیادہ مکمل اور

دہشت ناک استبدادیت پر حملہ ہو رہا تھا تو وہ اس کو ہر ضرب کاری سے محفوظ کرنے کے لیئے آڑے آتا تھا۔

میں آئن سٹائن سے اپنی عقیدت کے پیش نظر اس کی معقول توجیہ بھی پیش کر سکتا ہوں کہ آئن سٹائن کو بحیثیت قوم یہودیوں سے والہانہ تعلق خاطر تھا اور جب ہٹلر نے ان پر وحشیانہ اور مخصوص نوع کے مظالم توڑے تو آئن سٹائن اتنا متاثر ہوا کہ اس معاملہ پر عام انسانی مسائل کی طرح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا اگرچہ اس نتیجہ پر پہونچنا غلط تھا کہ سویٹ روس نازیوں کا زور ختم کر کے گویا یہودیوں کا نجات دہندہ بن گیا تھا۔ توجیہ کچھ بھی کی جائے لیکن ایک پختہ کار اور منطقی دماغ میں کورانہ جذباتیت کی اس نمایاں جھلک کا پایا جانا میرے لئے اور ان تمام حضرات کے لئے جو رجال پرستی کا رجحان رکھتے ہیں۔ ایک تنبیہ ہے کہ ہم اپنے جوشِ عقیدت میں حد سے نہ گزر جائیں۔ خود آئن سٹائن کا ایک قول ہے اور میرے خیال میں اسی کے پیش نظر اس کو جانچنا چاہیئے کہ "ہر انسان کی قدر بحیثیت انسان کے ہونا چاہیئے اور کسی انسان کو درجۂ الوہیت پر فائز نہ کیا جائے"۔

اس تیسری ملاقات میں ہم نے سگمنڈ فرائیڈ کے متعلق بھی تبادلۂ خیال کیا۔ آئن سٹائن نے کہا۔

"وہ ایک بہت عظیم آدمی ہے۔ میری رائے میں اس نے بعض حیرت انگیز تصورات دریافت کیئے ہیں، لیکن وہ صحیح ہیں یا غلط یہ شاید ہم اپنی زندگی میں تو معلوم کر نہ سکیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ نفسیاتی امراض کی اصلیت

کی دوبارہ جانچ ناممکن ہے۔ یہ قصور فرائیڈ کا نہیں ہے بلکہ اس کے موضوع کا ہے"۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک صرف یہ بات نہیں ہے کہ فرائیڈ اپنے اصولوں کی دوبارہ جانچ نہ کرسکا بلکہ وہ اس جذبہ ہی سے محروم ہے۔ اس موقع پر میکس شسٹر نے بڑی چالاکی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا:۔

"جس جذبہ کے تحت مسٹر آئن شٹائن نے فرائیڈ کے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے اسی سے فرائڈ محروم ہے"۔

آئن شٹائن نے کہا:۔

"میں نے ایک مرتبہ ایک خواب دیکھا جس سے ایک معمولی طریقہ پر فرائیڈ کے ایک نظریہ کی توثیق ہوتی تھی۔ برلن میں ہمارا ایک پروفیسر روڈ (rude.) نامی تھا جس سے میں نفرت کرتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بیزار تھا۔ ایک روز مجھے خبر ملی کہ وہ انتقال کرگیا اور جب میں اپنے ساتھیوں سے ملا تو میں نے یہ خبر ان تک ان الفاظ میں پہونچائی:۔

"یہ کہا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی میں کم از کم ایک نیک کام ضرور انجام دیتا ہے۔ روڈ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ وہ مرگیا ہے۔" اسی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں لیکچر ہال میں بیٹھا ہوا ہوں اور روڈ کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ بہت تندرست اور رعب دار معلوم ہوتا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا۔ پرتپاک طریقہ پر اس سے مصافحہ کیا اور اس سے کہا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ زندہ ہیں!

میں سمجھتا ہوں فرائیڈ اس خواب کو سن کر یہ کہے گا کہ تم نے روڈ کے متعلق جو ناشائستہ الفاظ کہے دل میں تم اس پر بہت نادم تھے اور خواب نے تمہیں اس متاسفانہ احساس سے نجات دلا دی۔"

فرائیڈ کچھ بھی کہتا اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ سے آئن شٹائن کی سیرت پر بہت دل فریب روشنی پڑتی ہے۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے رسالہ ہار پرس' کا وہ شمارہ اس کو دیا جس میں میرا مضمون تھا اور اس سے خواہش کی کہ اس مضمون کو پڑھنے کی زحمت گوارا کرے اس نے بڑے شوق سے رسالہ لے لیا اور کہا "میں اس کو پڑھوں گا۔ میں اس کا خوب مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔" انفیلڈ نے رسالہ اس کے ہاتھ سے لیا اور کہا کیا آپ اس کو ابھی اپنے ساتھ لے جائیں گے یا پہلے میں اس کو پڑھ کر پھر آپ کو بھجوا دوں؟"

آئن شٹائن نے جواب دیا "نہیں میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" اور رسالہ اس سے واپس لے لیا۔ اس نے یہ طے کیا کہ وہ قصبہ کے عقب سے ہوتا ہوا گھر واپس جائے گا تاکہ اس کو راستہ میں پریشانی نہ ہو۔ کتاب کے متعلق میکس سشر سے چند فنی امور طے کرنے کے بعد وہ ہم سے رخصت ہوا۔ میکس اور میں اس کو پرانی ونڈ بریکر اور ڈھیلی ڈھالی پتلون میں خراماں جاتے ہوئے دیکھنے کے لئے کھڑکی کی طرف گئے۔ وہ ایک سادہ طبیعت شریف اور جری انسان تھا۔ جب کھڑکی سے لوٹے تو انفیلڈ نے میز پر سے 'ہارپرس' کا رسالہ اٹھایا جس کو آئن شٹائن وہاں چھوڑ گیا تھا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر

شروع کی۔ وہ کہنے لگا:

"یہ ایک بالکل نرالی چیز ہے۔ اس نے یہ طے کیا تھا کہ میرے پاس رسالہ چھوڑ جانے کے بجائے وہ خود اس کو لے جائے گا، لیکن یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اس کو یہیں ڈال گیا۔ اصل میں وہ اس کو پڑھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن میں ایسا انتظام کروں گا کہ وہ ضرور پڑھے۔ تم فکر مت کرو میں بھی پڑھوں گا اور اور اس کو بھی پڑھنے کے لیے مجبور کروں گا۔"

وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اس کے پیچھے دروازہ میں ایک شگاف سا نمودار ہوا اور اس میں سے ایک نورانی چہرہ دکھائی دیا ایک ہاتھ آگے کو بڑھا اور انفیلڈ کے ہاتھ میں سے رسالہ چھین لیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

ایک لفظ بھی کسی نے نہیں کہا لیکن ہم سب خوب ہنسے۔ انفیلڈ جب سنبھل کر بیٹھا تو اپنا سرخ چہرہ میری جانب کر کے کہنے لگا: "یہ تمھیں داد و تحسین دی گئی ہے تم سمجھ نہیں سکتے کہ یہ تحسین کس قسم کی ہے!"

برٹرینڈ رسل نے آئن شٹائن کی موت پر جو لمبا مضمون لکھا اس میں اس نے اس تبدیلی کا ذکر نہیں کیا جو اس میں ہمارے طبعی حقیقت کے علم کے نظریہ اعداد و شمار کے بارے میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

رسل کا بیان ہے "آئن شٹائن نے اس نظریہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ وہ یہی یقین کرتا رہا کہ ایسے قوانین جن سے منفرد ایٹموں کے طرزِ عمل کا تعین ہوتا ہے ضرور موجود ہیں، اگرچہ ابھی تک ان کی حقیقت واضح نہیں ہوئی ہے۔"

اگرچہ مجھے اس موضوع پر کافی عبور حاصل نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میرے لئے

آئن سٹائن کی تصنیف "میرے آخری سال" (Out of my Last Years.)
میں سے اس تبدیلی کی جس کے وجود سے رسل انکار کرتا ہے شہادتیں مہیا کرنا آسان
تھا، اور اس سے انفیلڈ کو بڑی مسرت ہوئی تھی۔

مارچ ۱۹۳۶ء میں نظریہ مقادیر اُصول طبیعیات
Quantum Theory and Fundamentals- سے بحث کرتے
ہوئے اس نے تحریر کیا تھا، "اس سے قبل شاید کبھی کوئی ایسا نظریہ عالمِ وجود
میں نہیں آیا جس نے تجرباتی عوامل کے ایک مختلف العناصر مجموعہ کا اندازہ کرنے
یا اس کی تشریح کرنے میں اس طرح رہنمائی کی ہو جس طرح کہ نظریۂ مقادیر نے
کی ہے، لیکن اس کے باوجود میرا اعتقاد یہ ہے کہ یہ نظریہ اس کوشش میں جو ہم
طبیعیاتی علوم کے لیے ایک یکساں اور ہمہ گیر بنیاد تلاش کرنے کے لیے کر رہے
ہیں ہم کو غلط راستے پر لے جا سکتا ہے، کیونکہ میرے خیال میں حقائق اشیا کا
یہ ایک نامکمل خاکہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ خاکہ کا نامکمل ہونا قوانین کی شماریاتی نوعیت (یعنی
ان کے ناقص ہونے) کا نتیجہ ہے۔" (جرنل فرینکلن انسٹی ٹیوٹ جلد ۲۲۱ نمبر ۳)

چار سال بعد "طبیعیات اور حقیقت" پر لکھتے ہوئے اس نے کہا: "غالباً
یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ طبیعیات کبھی آئندہ علم کی مدد کے سہارے موجودہ
شماریاتی نظریئے کو جبریت کے حق میں ترک کر دے گی۔ ۔ ۔ ۔"
(سائنس واشنگٹن ۲۴ مئی سنہ ۱۹۴۰ء Science- Washington-May, 24, 1940)

لیکن مضمون کے آخری حصہ میں اس نے متذبذب ہو کر لکھا:۔
"بعض ماہرین طبیعیات جن میں میں خود بھی شامل ہوں یہ یقین نہیں کر سکتے

کہ ہم کو یہ بات تسلیم کر لینا چاہیئے کہ قدرت کے واقعات ایک اتفاقیہ کھیل کے مانند ہیں۔ ہر شخص کے لیئے اپنی سعی و کوشش کی سمت اختیار کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہے اور ہر شخص لیسنگ (.Lessing) کے اس اعلےٰ مقولہ سے اطمینان حاصل کر سکتا ہے کہ "صداقت کی تلاش اُسے حاصل کر لینے سے زیادہ قابل قدر ہے"

مجھے یہ شبہ ہو رہا ہے کہ اس نے جس چیز کو میرے سامنے مذہب بیان کیا تھا وہ ایک جذبہ تھا نہ کہ اصول طبیعیات کے متعلق اس کی فکر و تشویش، جس نے آئن شٹائن کو بادلِ ناخواستہ نظریۂ جبر کے ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی تصنیف "ماین وائٹ بلٹ" .Mein- Weitbild مطبوعہ اسٹرڈم ۱۹۳۳ء پر جو پیش لفظ لکھا تھا اس میں نظریۂ جبر کی تعریف میں قصیدہ خوانی کی تھی۔ اس نے جوشیلے انداز میں کہا تھا: "شوپنہار کے اس قول نے کہ انسان جو چاہے کر سکتا ہے لیکن یہ طے کرنا کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے اس کے امکان سے باہر ہے، میرے لیئے بچپن سے اب تک روحانی فیضان کا موجب رہا ہے۔ اسی قسم کا روحانی فیضان میری طبیعت سے اس قدر مغائر ہے کہ میں اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ایسا شخص جس نے نوجوانی سے ایسی مستقل اور حوادث سے محفوظ دنیا میں رہنے کو روحانی فیضان کا حامل پایا ہو وہ بڑھاپے میں اس سے باہر نکالے جانے کے خلاف سخت مقابلہ کرے گا۔

# ارنسٹ ہیمنگوے[1]

## اس کی اعلیٰ وادنیٰ صفات

ارنسٹ ہیمنگوے کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ میں جن لوگوں عظیم سمجھتا ہوں ان میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ ہماری ملاقات اگرچہ دوستانہ طریقہ پر ہوئی اور عرصۂ دراز تک رہی لیکن محض اتفاقیہ تھی، لیکن مجھے اس سے بڑی وابستگی ہو گئی تھی۔ مزید براں میری زندگی کا ایک بڑا حیرت انگیز واقعہ بلکہ دراصل دو[2] ایسے واقعات اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک اس وقت جبکہ وہ ایک نہایت شاندار اہلِ قلم ثابت ہوا اور دوسرا اُس وقت جبکہ اس نے ایک کتاب میرے منہ پر دے ماری۔

ہم ۱۹۲۲ء کے موسمِ بہار میں جنیوا کے ہوٹل واڑینے میں ملے تھے۔ ہم دونوں دولِ عظمیٰ کے مستند سربراہوں کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۹۱ نوٹ مترجم

گئے تھے جواب تاریخ میں جنیوا[۵۱] کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اقدام پہلی عالمی جنگ، پہلی احمقانہ صلح اور پہلے بالشویک انقلاب کے بعد یورپ میں امن قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس میں ہزیمت یافتہ اہل جرمنی اور فاتح بالشویک کے علاوہ ہر اہل قلم اور صحافی جس کو باریابی میسر آسکی پہونچ گیا تھا۔ ارنسٹ کو اخبار ٹورنٹو اسٹار (Toronto Star) نے بحیثیت نامہ نگارِ خصوصی بھیجا تھا، ایک تئیس سالہ نوجوان کے لئے یہ ایک غیر معمولی اعزاز تھا۔ میں نیویارک ورلڈ (New York World) کی طرف سے پروانۂ تقرری لے کر وہاں پہونچا تھا، اور میں نے اس اخبار کو ایک یادداشت بھی ارسال کی۔

اس یادداشت میں کانفرنس کے افتتاحیہ جلسہ کا حال لکھا تھا۔ میں نے تحریر کیا تھا کہ جب تمام مندوبین اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور لائیڈ جارج[۵۲] بھی بڑی شان سے نزول اجلال فرما چکے اور صدر اپنی یادداشتوں کے صفحات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ چکے اور اپنا عصا اُٹھا کر جلسہ کی کارروائی شروع کرنے کے لئے تیار ہوئے تو معلوم ہوا کہ روسیوں کے لئے جو چار کرسیاں مخصوص کر دی گئی تھیں۔

---

[۵۱] دیکھو ص ۴۵۹ نوٹ مترجم
[۵۲] دیکھو ص ۴۵۹ نوٹ مترجم)

وہ ابھی خالی پڑی ہیں۔" دو تین، پانچ منٹ۔ یہاں تک کہ دس منٹ گزر گئے۔ انتظار کی شدّت اب بیچینی، بے صبری اور پریشانی کی حد تک پہونچ گئی۔ روسی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ ہمیشہ دیر سے آتے ہیں۔ خیر۔ لیکن اس موقع پر تو ان کو دیر نہیں کرنا چاہیئے تھی کیونکہ دُنیا کے تمام زعما ان کو شرکت کا موقع دینے ہی کی غرض سے یہاں جمع ہوئے تھے۔"

ارنسٹ میرے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے اپنی یادداشت میں ان خالی کرسیوں کا ذکر کرتے ہوئے زیادہ جامع فقرہ لکھا کہ "میں نے ان سے زیادہ خالی دکھائی دینے والی چار کرسیاں کبھی نہیں دیکھیں۔"

ارنسٹ نے اسی مضمون میں میرے متعلق بھی ایک فقرہ چست کیا جو مجھے اتنا شگفتہ نہیں معلوم ہوا۔" ایک تنومند، شگفتہ مزاج، مڈل ویسٹرن کالج کے پروفیسر کی طرح۔"

موسم بہار کے ان سست نہاد دنوں میں ایک دن جارج سلکومب ارنسٹ اور میں ایک موٹر میں سوار ہو کر ریالو (Rapall) گئے۔ جارج ڈیلی ہیرالڈ لنڈن کا حسین نامہ نگار تھا۔ اس کا حسن اس کی چمکدار سُرخ رنگ کی خنجر نما داڑھی اور ایک بڑے سیاہ رنگ کے فیلٹ کے ہیٹ سے ظاہر تھا جیسا کہ پیشہ ور شورش پسند خصوصاً اطالوی انارکسٹ شورش پسند عموماً اوڑھا کرتے ہیں۔ اس کی ہلکی نیلگوں آنکھیں ہیٹ کے نیچے چھپی رہتی تھیں اس کی ناک چھوٹی لیکن خوش وضع تھی، اس کے خیالات خاصے باقاعدہ تھے، اور اس کو دیکھ کر تم اپنے دل میں یہ کہتے کہ سُرخ داڑھی اور بڑے کالے ٹوپ کے علاوہ

شورش پسندی کی کوئی علامت وہاں نہ تھی! لیکن تم اس کو پسند کرتے:
وہ ایک طرحدار آدمی تھا اور اب بھی ہے۔ ارنیسٹ اس سے بھی زیادہ اور واضح طور پر طرحدار آدمی تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی وہ اخبار نویسی سے آگے بڑھ کر علم و ادب کے میدان میں اپنی جولانیاں دکھانے کی طرف مائل تھا لیکن اس نے اوباشانہ طور طریقے اختیار نہیں کیے تھے۔ وہ شریف النفس سادگی پسند انسان تھا، اس کی پوشاک کسی قدر ڈھیلی لیکن رواج کے مطابق ہوتی تھی۔ اس کی نمایاں خصوصیت اس کی تسخیر کن مسکراہٹ، دل فریب چہرہ اور نہایت چمکیلے دانتوں کی بتیسی تھی کہ ایسی کسی مرد یا عورت یا بچے کی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ریپالو (Rapallo.۱) سانتا مارغریٹا سے جہاں بالشوک مندوبین کو ٹھہرایا گیا تھا صرف چند منٹ کی مسافت پر تھا۔ میں زیادہ وقت اسی نواح میں گھومتا رہتا تھا۔ وہ چھوٹی سُرخ اور سپید رنگ کی فورڈ گاڑی جس میں ہم پھرا کرتے تھے۔ مجھے ایک ٹائم مشین معلوم ہوتی تھی جو ہمیں انقلاب آفریں مستقبل کے دروازہ سے واپس گزشتہ صدی کے عہد میں پہونچا دیتی تھی۔ جونہی ہم ریپالو پہونچے تو چھوٹے سے دروازہ پر ایک گھنٹی بجاتے اور ایک اندرونی زینہ طے کرتے ہی ہم میکس بیربوم (Max Beerbohm ۲) کی لاثانی شخصیت کے روبرو پہونچ جاتے تھے۔ وہ نہایت نفیس لباس میں ملبوس آرام وہ فرصت میں مکان کے کھلے ہوئے چبوترہ پر بیٹھا ہوا مرسلا (Marsala.۱ ۵) شراب کی چسکی لگاتا ہوتا تھا۔ اس چبوترہ سے سمندر کے

نیلگوں پانی کا منظر آنکھوں کو تازگی بخشتا تھا اور اس کے چہرہ سے اطمینان بخش خوشی کے آثار نظر آتے تھے کیونکہ وہ ابھی ابھی نہایت چابکدستی سے شاہ ایڈورڈ ہفتم کی زندگی کے چند مضحکہ خیز خاکے تیار کر چکا تھا۔

چونکہ ہم فاصلہ ورازسے چل کر دفعتاً اس کے پاس بلا سابقہ تعارف کے پہونچے تھے اور اس سے گفتگو کرنے کے سوا کوئی خاص وجہ بھی آنے کی نہ تھی۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے نہ صرف دلی مسرّت بلکہ نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس نے بطور انتباہ اتنا ضرور کہا کہ سیاسیات پر گفتگو نہ کی جائے اور ہم نے اس کی اس بات سے اس قدر اتفاق کیا کہ کچھ ہی دیر کے بعد ہم سیاست پر بڑی صفائی اور بے پروائی سے گفتگو کرنے لگے۔ برطانوی قوم کے افراد جب زیادہ پُرتپاک لوگوں سے ملتے ہیں تو ان کے خوش اخلاقانہ انداز میں کچھ رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور یہ رکاوٹ تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے کو پہچاننے میں بھی حائل ہو جاتی ہے۔ یہ وقت اس لئے اور بھی شدید ہو گئی کہ ہم تو محض معمولی لباس میں وہاں پہونچے تھے اور یہ انگریز میکس بیربوم برطانوی شائستگی کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کا بھورے رنگ کا سوٹ بہترین طریقہ پر تیار کیا گیا تھا، بھورے فیلٹ ہیٹ کی کریز بے نقص تھی، اور ترشی ہوئی مونچھیں جچتی تھیں۔ تکلف اور غیریت کی یہ فضا اُس وقت تک پورے طور پر صاف نہ ہوئی جب تک ہم نے تجارتی صحافت کے خلاف تخلیقی فنکاروں کی بغاوت کے متعلق ذکر شروع نہیں کیا۔ میں نے اس موضوع پر کافی گفتگو کی کیونکہ اخبار ماسیز ( Masses, ) اور اس کے بعد لبریٹر ( Liberrtor. ) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے

مجھے اس معاملہ کو کسی قدر عوامی انقلاب کی مخالفت کرتے ہوئے امریکی سرمایہ داروں سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے خوب اُچھالنا پڑتا تھا۔ یہ بحث میری ایک مختصر سی کتاب "صحافت اور ہنر کا مقابلہ" کا موضوع بھی تھا جو کناف (Knof.) نے شائع کی تھی۔

بیر بوم نے کہا انگلستان میں ہم نے اسی قسم کی بغاوت "زرد کتاب" (Yellow Book) میں کی تھی۔ پھر اس نے تفصیل بتائی کہ اپنے دوست اُبری بیرڈسلے (Aubrey Beardsley) کی رہنمائی میں وہ سب سے پہلے اس مشہور ترین مختصر رسالہ میں بحیثیت فنکار کے منظر عام پر آیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس بغاوت کا رجحان اس کے اندر آگے بھی برقرار رہا اور بعد میں اس نے اپنی تصویروں کو کبھی اشاعت کے لئے نہ دیا۔ اگر کوئی تصویر اخبار میں چھپ گئی تو یہ امر اتفاقیہ تھا۔

اس نے کہا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان تصاویر کی موجودگی ان کے مقصد کو پورا کر دیتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس گفتگو نے جس کا اختتام اس شخص کے جس کو ہم سب پسند کرتے ہیں مذکورہ بالا نہایت اہم فقرہ پر ہوا۔ ہیمنگوے کے جذبات کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ مجھے اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کو اپنی زندگی میں جو مسائل ہمہ وقت درپیش ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بحیثیت ایک صحافی کے وہ جلب زر کی سرگرمیوں سے کس طرح اپنے آپ کو نجات دلائے اور رمتاہل ہونے کے باوجود اپنے معاملات کو مالی اعتبار سے کس طرح استوار کرے تاکہ اپنا وقت

اور قلم فن ادب کی خدمت پر صرف کر سکے۔ اس کے ایک بچہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس مسئلہ کے حل میں ایک سال کی اور تاخیر ہوئی، لیکن اس چیز سے متعلق اُمیدوں اور اس سے پیدا ہونے والے مصائب کا اسے پہلے ہی احساس ہو چکا ہوگا، لیکن وہ اتنا خاموش اور ہماری گفتگو پر نوجوانوں جیسے شوق سے اس قدر متوجّہ رہا کہ مجھے درحقیقت یہ خیال ہونے لگا کہ وہ شاید ان موضوعات سے بالکل ناآشنا تھا۔[1]

جب ہم روانہ ہو گئے تو کچھ دور چل کر میں نے میکس بیربوم کے چند بیانات کو لکھنے کے لئے گاڑی کو تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرایا۔ اس وقت ارنسٹ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا اور اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہا "اس کے بیان کا ایک ایک حرف یہاں محفوظ ہے"۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بات بالکل سچ تھی اور مکالمہ نگاری میں اس کو جو قدرت حاصل تھی اس کے خاص وسائل میں سے ایک یہ چیز بھی ہے۔

ان دنوں ارنسٹ ایک اعتدال پسند اور شاہانہ اطوار کا نوجوان تھا اور میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ اس کا طرزِ عمل غیر معمولی طور پر دوستانہ تھا۔ وہ اخبار لبریٹر کو ضرور پسند کرتا ہوگا کیونکہ اس نے مجھ سے درخواست کی میں اس کے چند واقعاتی قلمی خاکوں پر ایک نظر ڈال لوں جو اس نے تحریر کی خاطر لکھے تھے۔ اگرچہ میں ان سے زیادہ متاثر نہیں ہوا لیکن میں نے انھیں اپنے قائم مقام ایڈیٹروں کلاڈ میکے اور مائیکل گولڈ کے پاس بھیج دیا تاکہ اگر ممکن ہو تو ان کو شائع کر دیا جائے۔ ارنسٹ ہر واقعہ کو اصل شکل میں ضبطِ تحریر

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۵۷ نوٹ مصنف

میں لانے کی جو سرگرم اور اعلیٰ کوشش کر رہا تھا شاید اس سے ہم سب ہی واقف تھے۔ اس کو یہ جستجو تھی کہ جن احساسات و جذبات کا ہم تجربہ کرتے ہیں ان کی تخلیق کن واقعات سے ہوتی ہے۔ شاید اس کی یہ ابتدائی کوششیں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئیں۔ وجوہ کچھ بھی ہوں یہ مضامین "لبرٹیر" میں شائع نہیں ہوئے۔ چنانچہ جب میں "لبرٹیر" کے لئے مضامین لکھنے والوں کی فہرست تیار کروں گا تو ارنسٹ ہیمنگوے کا نام اس عہد کے ان چند ممتاز اہل قلم میں ہوگا جنھیں مذکورہ فہرست سے مجھے علیحدہ رکھنا پڑے گا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی ہیڈلے ( .Hadley ) نے ان ابتدائی تحریرات سے بھرا ہوا ایک پورا بکس کہیں ضائع کر دیا۔ اور ارنسٹ کو ان مضامین کو دوبارہ قلمبند کرنا پڑا۔ چونکہ میں ان کا نمونہ دیکھ چکا ہوں اس لئے میں یہ خیال کرنے کی جانب مائل ہوں کہ یہ نقصان نفع بخش ہی تھا۔

بہر حال اس وقت مجھے ارنسٹ غیر معمولی ذہانت کا حامل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کو محض ایک ہوشیار اور صاف ذہن اخبار نویس سمجھتا تھا جسکو میں صرف اس لئے پسند کرتا تھا کہ اس نے مجھے صاف طور پر بتا دیا کہ وہ پچھلی لڑائی میں ڈر کے مارے نیم جان ہو گیا تھا۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں رہتے تھے ایک دن صبح اس کے غسل خانے میں گرم پانی کا ہیٹر زور سے پھٹا جس کے دھماکہ سے وہ کمرہ کے بیچ میں آ کر گرا۔ وہ ہنستا ہوا بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑا ہو گیا جس سے ہر شخص متاثر ہوا اور مجھے اور بھی زیادہ ہمدردانہ جذبہ کے ساتھ اس واقعہ کی قدر ہوئی کہ وہ جنگ میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔

۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان پیرس اور اینٹی بیز[۱] میں پھر ہماری ملاقات ہوئی۔ میں ماسکو کی یاترا ختم کر کے بالشویک مقرّر اور وزیر انصاف نکولائی کی ہنس مکھ بہن ایلینا کریلنکو کے ہمراہ واپس یورپ آگیا تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ سکون کی قیمت گری ہوئی تھی۔ امریکہ کے ادیب یورپ پر اس طرح ٹوٹ پڑے تھے جس طرح کہ اناج کے کھیت پر کوّے گرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے چند ماہ کے قیام کے لئے کیپ اینٹی بیز کے نواح میں ضرور آتے تھے۔ شہر اینٹی بیز کیپ کا بنیادی مستقر ہونے کی حیثیت سے ایک عجیب و غریب پشتہ سے محفوظ کیا گیا ہے جو بلند اور گندمی رنگ کا ہے اور ایک تدریجی زینہ معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ نہایت مضبوط دیواریں ہیں جو پانی کے اوپر نظر آتی ہیں اور مینار ہیں جن سے شہر نائیس (Nice) سے بہت آگے ایلپس ماریٹائیس کی برفانی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ میں نے اس پشتہ کے شگاف میں ازمیٹ کے ٹائپ رائیٹر کے لئے مختصر سی جگہ نکالی اور میں خود بھی یہاں کچھ مدّت کے لئے غار میں رہنے لگا۔ وہ تین میل دور کیپ کے سرے پر ٹھہرا ہوا تھا اور سائیکل پر آتا جاتا تھا۔ ہم ایک دو[۲] مرتبہ ایڈن راک (Eden Roc.!) کے مقام پر ساتھ ساتھ تیرتے بھی رہے لیکن وہ چیز جس کو میں قابلِ اطمینان دوستی کہہ سکتا ہوں ہمارے درمیان اگلے موسم سرما میں بمقام پیرس پیدا ہوئی۔ ایلینا اور میں ایک کمرہ میں واجی رارڈ کے

بڑے میدان میں رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ اس مقام سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں ارنسٹ اور اس کی بیوی ہیڈلے مقیم تھے۔ ہیڈلے ایک دلکش لڑکی تو نہ تھی لیکن قبول صورت ضرور تھی۔ وہ کچھ گول مٹول، طاقتور جسم کی آزاد خیال عورت تھی۔ میں تو اس کو فطرتاً ہائیکر (Hiker.) سمجھتا تھا۔ ہم میں کافی گہری دوستی تھی اس حد تک کہ ارنسٹ نے مجھے کتاب "سیل ہائے بہار" (Torrents of Springs.) کی ایک جلد دی۔ جس پر تحریر تھا "میکس اور ایلینا کی خدمت میں ہدیہ محبت کے ساتھ" کسی اتفاقیہ امر یا میری طبیعت کے فطری تقاضے نے مجھے اس وقت اس کے مطالعہ سے باز رکھا۔ لیکن میں نے "ہمارے عصر میں" (In our Time,) کے پہلے ایڈیشن میں "اَپ اِن شی گن" (Up in Michigan.) اور دیگر افسانوں کو پڑھا اور ان کے متعلق میرے دل میں حیرت انگیز پسندیدگی پیدا ہوئی۔ میں یقین نہ کر سکا کہ یہ کرخت افسانے جنہیں پوست کندہ واقعات کی اتنی زبردست چاشنی تھی اور جو اتنے جامع اور مکمل تھے اسی بے حوصلہ نوجوان صحافی نے لکھے ہیں جس نے تین برس پہلے مجھ کو جنیوا میں چند غیر مربوط سے مضامین دکھائے تھے۔

مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس حیرت انگیز بھوت کی سابقہ تاریخ اور ہمہ گیری سے میں بالکل ناواقف تھا۔ میری حالت یہ ہے کہ میں تقریباً ہمیشہ ان واقعات سے جو کسی خاص وقت پر ادبی حلقوں میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں پیچھے رہ جاتا ہوں۔ اور ان سے تقریباً ناآشنا رہتا ہوں۔ شروڈ اینڈرسن (Sherwood Anderson.) اس گروہ میں سے ایک تھا جن کو ہیمنگوے

نے اس زمانہ میں کیفٹ بنک پر اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ میں نے ماسیز اور لبریٹر (Masses. S) اور (Liberator) میں شیر ووڈ کی بعض ابتدائی بہترین کہانیاں شائع کی تھیں، لیکن میں اس سے بے خبر تھا کہ یہ شخص نئے اسالیب نگارش کا مشہور موجد تھا یا آئندہ ہو جائے گا۔ اس کی پیرس کی موجودگی یا ہیمنگوے سے ادبی رفاقت کا بھی مجھے علم نہیں تھا۔ اسی طرح جرٹ روڈ اسٹین Gertrude. Stein. اور اس کے مسلک، اس کی کتاب "تین زندگیاں" (Three Lives.) اور پیرس میں مقیم امریکی اہلِ قلم پر اس کے اثر کا بھی مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے کئی سال پہلے اس کی ایک احمقانہ تصنیف ٹینڈر بٹنس (Tender' Buttons.) دیکھی تھی جس کے مضامین ہر پہلو سے بجز مخلصانہ جذبات کے پاگل کی بکواس معلوم ہوتے تھے اور میں نے اس کو اور اس کی تمام تصانیف کو ہنس کر نظر انداز کر دیا تھا۔ میں لیو اسٹین (Leostein) سے واقف تھا اور کبھی کبھی پیرس میں کھانے پر اس کا شریک رہا کرتا تھا، کیونکہ یہ شخص ایک اعلےٰ دماغ اور حیرت انگیز ذخیرہ الفاظ کا مالک تھا اور اسے جان ڈیوی اور ولیم جیمس کے فلسفیانہ اغلاط کا احساس تھا، لیکن اس کی صحبت سے کسی قدر اُکتاہٹ پیدا ہوتی تھی، اتفاق سے اس کی بہن بھی احمق تھی۔

چونکہ اس جسمانی معذوری کی وجہ سے وہ ادبی، وعلمی طرزوں اور موضوعات گفتگو میں کامل دستگاہ نہیں رکھ سکتا تھا لہذا ہمارے عصر میں .In our Time کی چیت زبان، اختصار واجمال اور ناخواندہ اشخاص کی سی حقیقت پسندی سے بہت ہی متعجب ہوا۔ اس زمانہ میں ایلینا روسی سفارت خانہ میں کام

کر رہی تھی اور ہم دونوں ماسکو کے حالات سے اس حد تک ناواقف تھے کہ ہم یہ خیال کر بیٹھے کہ ایلینا اس کا ترجمہ روسی زبان میں کر دے، اور میں اس پر ایک مقدمہ لکھ دوں جس میں سوویٹ روس کے علمی حلقوں سے اِس نئے جرت انگیز اہلِ قلم کا تعارف کرایا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے ایلینیا سے ارنیسٹ کی موجودگی میں دریافت کیا کہ روسی زبان میں "صاف صاف گفتگو" کے لئے مترادف الفاظ کیا ہیں اور جب ارنیسٹ نے مجھ سے اس کا سبب دریافت کیا تو میں نے اس کو بتایا کہ روسی ترجمہ کے پیش لفظ میں اس کے اسلوبِ نثر نگاری کی خصوصیت بیان کرنے کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ اس نے کہا "مجھے یہ پسند ہے!"

"صاف صاف گفتگو" کے روسی الفاظ ہم کو نہیں مل سکے اور ۱۹۲۵ء کے موسم بہار میں میری کتاب "لینن کی موت کے بعد" (.Since Lenin Died) کے شائع ہوتے ہی جس میں میں نے استحصال اقتدار شخصی کے لئے اسٹالن کی سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ ایلینا کو روسی سفارتخانہ کی ملازمت سے جلد ہی ہاتھ دھونے پڑے اور اس کے ساتھ ہی یہ اُمید بھی منقطع ہو گئی کہ ہم دونوں میں سے کسی کے منتخب کردہ الفاظ ماسکو میں طبع ہو سکیں گے۔

چار دیگر واقعات کا جن سے ہیمنگوے کا تعلق ہے میرے جذبات پر ایسا اثر پڑا کہ جب میں قیام پیرس کے زمانہ اور وہاں کے مقامات کو یاد کرتا ہوں تو اپنے حافظہ میں ان واقعات کے نقوش صاف صاف موجود پاتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے کمرہ میں اسکر بنرز ( Scribner's ) کا ایک خط دکھایا جو اسی روز آیا تھا۔

اسکریبنرز نے اس کی تصنیف "ہمارے عصر میں" پڑھی تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ آئندہ جو کتاب یا کتابیں تیار ہوں ان کو وہ شائع کریں۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ چارلس اسکریبنرز سنز کی شائستہ فرم جس نے میری دو کتابیں "لطفِ شعر" (Enjoyment of Poetry.) اور "بذلہ سنجی" (Sense of Honour.) شائع کی تھیں اور جن کو بین نے اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنی امیرانہ ذہنیت کی بنا پر زیادہ انقلابی کتابوں کو شائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے "اَپ اِن مچی گن" (Up in Michigan,) جیسے عریاں انقلابی مضمون کو کیسے شائع کر دیا۔ میں یہ بھول گیا کہ "ہمارے عصر میں" (In our Time.) کا (جو ابتدا میں فرانس میں شائع ہوئی تھی) امریکی اڈیشن شائع کرتے وقت ہورییس لیورائٹ نے اس میں سے اس نفرت انگیز مضمون کو بالکل خارج کر دیا تھا، لیکن میرا استعجاب بھی اپنی جگہ پر ٹھیک تھا کیونکہ ہیمنگوے کا کام ہاتھ میں لے کر میکس پرکنز نے اس کی آخری حد تک پشت پناہی کی، اور قیاس ہے کہ اسکریبنرز (Scribner's.) نے دیگر ناشرین کے مقابلہ میں سب سے زیادہ امریکی افسانوں کو فحش عبارتوں سے پاک کرنے میں حصہ لیا ہے۔

میں اس وقت خود بھی افسانے لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ناول آدھا لکھ چکا تھا اور دو افسانے میری ڈیسک میں تیار رکھے تھے۔ ان میں سے ایک افسانہ میں نے ہیمنگوے کو پڑھنے کو دیا اور مجھے یاد ہے کہ جب اس نے واپس کیا تو اس کی بہت تعریف کی۔ اس نے کہا: "میں یہ نہیں کہتا کہ چونکہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں اس لئے یہ بھی مجھے پسند ہے"۔ اس جملہ میں مجھے دوگونہ اطمینان

حاصل ہوا۔

میرے حافظہ میں ایک اور واقعہ محفوظ ہے۔ میں بُولیوار مانٹ پرناسے پر ایک کیفے میں لنکن اسٹیفنس کے ساتھ بیٹھا ہوا اس سے ذکر کر رہا تھا کہ میں ارنسٹ کو کس قدر پسند کرتا ہوں۔ 'وہ بہت سادہ مزاج، تصنع سے پاک اور انکسار پسند آدمی ہے'۔ میں نے یہ یا اسی قسم کے الفاظ کہے۔

اسٹیفنس نے جواب دیا "یہ صحیح ہے لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے"

میں نے تعجب سے کہا "کیا واقعی ایسا ہے"۔ لیکن میں نے اس بحث کو بڑھایا نہیں۔ میں جانتا تھا کہ اسٹیفنس کے پُرزور الفاظ اتنے عاقلانہ نہیں تھے جتنا وہ انھیں سمجھتا تھا۔ بعد میں میرے قیاس میں یہ بات آئی کہ اس کی مراد ارنسٹ کی اس سنگ دلانہ تضحیک سے ہے جو اس نے "سیل ہائے بہار" (Torrents of Spring.) میں اپنے پُرانے دوست شیروڈ اینڈرسن کے بارے میں کی تھی۔ اس کتاب کو میں نے شائع ہونے کے بہت عرصہ بعد اس وقت پڑھا جبکہ میں نے یہ سُنا کہ اس کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ یہ نہایت گھٹیا کتاب ہے۔ میں نے اس کو بہت ادنے درجے کی کتاب سمجھا ہیمنگوے کی تصانیف و تخلیقات کی خوشنما عمارت میں یہ کتاب ایک گندے پانی کے جوہڑ کی طرح ہے۔

پیرس کا ایک واقعہ جو مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ یہ ہے کہ میں کیفے ڈرم کے سامنے ایک چھوٹی سی میز کے پاس تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ ارنیسٹ پاس سے گزرا وہ یونہی گھوم رہا تھا اور میں نے اس سے کہا کہ آؤ یہاں بیٹھ کر

کچھ پیئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے رات مونٹ مارٹرے میں گزاری ہے اور ابھی سو کر اُٹھا ہوں تو بہت ندامت محسوس کر رہا ہوں۔ اس بارے میں میری یادداشت تو اتنی صحیح نہیں جتنی اس کی ہو سکتی ہے کہ مجھے حرف بحرف یاد ہو لیکن میری یاد کے مطابق اس نے یہ کہا:

"اگر ان رقص گاہوں میں جائیں تو لازمی طور پر وہاں کی بعض لڑکیوں کی آرزو آپ کے دل میں پیدا ہو گی، میں جب کبھی ان عشرت کدوں سے لَوٹ کر گھر پہونچتا ہوں تو میں ایسے خیالات کی وجہ سے خود اپنی ذات سے نفرت کرنے لگتا ہوں، تو کیا تم ایسا نہیں کرتے؟ "آپ اِن مجی گن" کے مصنّف سے یہ بات سُن کر مجھے بہت تعجب ہوا اور میں نے جواب دیا (جو مجھے حرف بحرف یاد ہے) "ارنیسٹ میں ایسا خیال نہیں کرتا، میں نفسانی خواہشات کے احساس سے لذّت اندوز ہوتا ہوں، اس کے علاوہ میں خیال نہیں کرتا کہ تم حقیقت کا اظہار کر رہے ہو"

مجھے افسوس ہوا کہ ارنیسٹ ایک دم کھڑا ہو گیا اور مجھے ایک قہقہہ کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ کر وہ گلی میں اور بھی زیادہ تیزی سے اپنے راستہ پر چلنے لگا۔

اس واقعہ کی مجھے کوئی تشریح کرنا نہیں ہے۔ سوائے اِس کے کہ وہ بخوبی میرے ذہن میں محفوظ ہے اور یہ کہ مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ میرے بیساختہ جملے نے جس کا کوئی خاص موقع نہ تھا ہماری رفاقت کو باہمی رازداری کی حد تک بڑھنے سے روک دیا۔

ایک اور موقع پر ہم دو یا تین ساتھی کلوزیری ڈی لیلاس کے قریب ایک گوشے میں ایک چھوٹے ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت میں گزشتہ شب کا ماجرا بیان کر رہا تھا۔ میں شرابی اور نازک اندام مصوّر جولس پیسکن ( Jules Pascin. ) کی ایک مشہور پارٹی میں شریک ہوا تھا جو اس کے مونٹ مارٹرے کی ڈھلان پر واقع کمرہ میں ہوئی تھی نہایت فیاض طبع ہونے کے علاوہ پیسکن اس مقدس پہاڑ کے رہنے والوں میں جنسیات سے متعلق عضویاتی پہلوؤں پر سب سے زیادہ صفائی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا کرتا تھا۔ وہ تمام فنکاروں کو ان پارٹیوں میں بُلایا کرتا تھا، اور نہ صرف ان کو شاندار ضیافت دیتا تھا۔ ایسی شاندار کہ بہت سوں کو تو مہینوں میں شاید پہلی مرتبہ ایسے کھانے نصیب ہوئے ہوں۔ بلکہ کثرت سے شراب نوشی اور عریانی کے مظاہرے اور عام آزادانہ بے تکلفی کے اظہار سے بھی ان کو محظوظ کرتا تھا۔ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ پیسکن اور لوگوں سے زیادہ جنسی تجربات میں دلچسپی لیتا تھا، وہ محض صاف گو تھا اور اس معاملہ میں ذرّہ بھر خاموشی سے کام نہ لیتا تھا۔ اس مخصوص پارٹی میں اگرچہ دو پری وش خواتین کی وجہ سے جنھوں نے محض آرائش کی خاطر اپنے کپڑے اُتار دیئے تھے۔ دلکشی پیدا ہو گئی تھی لیکن حاضرین جنسی خواہش میں بہنے کے بجائے جذبۂ غضب سے مغلوب تھے۔ ہر شخص ایک دوسرے سے اُلجھ رہا تھا اور صبح ہوتے ہوتے یہ جھڑپیں ایسی صورت اختیار کر گئیں کہ ایک عظیم الجثہ، نشہ میں چور بلغاری اور ایک منحنی، زرد رنگ کے ڈریورک اور خوفزدہ انگریز میں سخت جھگڑا شروع ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا وہ پہلی جنگ عظیم پھر شروع کر رہے تھے، اور بلغاری جو اس

نحیف الجثہ انگریز کو ایک مُکّے سے ختم کر سکتا تھا نشہ کے اثر میں ایسا کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ چونکہ صرف میں ہی اس قوی ہیکل بلغاری کے مقابلہ کا نظر آتا تھا"۔

"میں نے ارنسٹ سے کہا" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قضیہ میں مجھے کچھ حصہ لینا پڑیگا۔

ارنیسٹ نے ترشروئی اور فوری نفرت کے ساتھ قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اور تم نے اب تک کچھ نہ کیا"!

"پہلے مجھے اپنی کہانی ختم کر لینے دو" میں نے کہا میری جرائت پر جو اس نے طعن کی تھی اس سے زیادہ پریشانی مجھے اس کی دخل اندازی سے ہوئی۔ میں اس وقت شاید اپنی گفتگو میں کچھ اپنی بڑائی کا اظہار کرنا چاہتا تھا جیسا کہ عام طریقہ ہے اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ بچوں کے ڈھنگ پر اظہار فخر کے لئے اس جنگ میں حصہ لینے کا ذکر کر کے یہ کہوں کہ "میں نے یہ کیا"!

میری کہانی یہ تھی کہ جب اس عظیم الجثہ بلغاری نے جو بلغاریہ اور برطانیہ کی جنگ دوبارہ شروع کرنے کے لئے گرج رہا تھا اپنے آپ کو صحن میں چاروں شانہ چت اور ایک امریکی کو اپنے سینہ پر بیٹھے ہوئے پایا تو وہ بچوں کی سی باریک آواز میں چیں چیں کرنے لگا۔ "لیکن جناب آپ نے شرافت سے کام نہیں لیا"!

اس نے یہی کلمات تین مرتبہ دوہرائے ان کے علاوہ نہ تو ایک لفظ کہا اور نہ کوئی حرکت کی۔ اس کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ اس کے سر کا پچھلا حصہ فرشِ صحن سے ٹکرا گیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ اس کے بعد جو عام گڑبڑ وہاں شروع ہوئی تھی۔ اس کو بھی بیان کروں۔ وہ برہنہ پری وش خواتین اس اندیشہ سے کہ کوئی قتل عام شروع

ہونے والا ہے اپنے کپڑے لینے کے لیئے ہمارے اوپر سے کود گئیں، اور کوتاہ قامت پیسکن .P 88 Pascin جو اس قدر مدہوش تھا کہ کسی کو شناخت بھی نہیں کر سکتا تھا وہ میری پیٹھ پر چند بے ضرر گھونسے مارتا ہوا اپنے انگریز مہمان کی مزید مدافعت کے لیئے لپکا۔ ایک خوشنما پرشور اجتماع تھا اور جو شخص بھی از راہِ خوش اخلاقی وہاں کی بات چیت سُننے کی زحمت گوارا کرتا تو محظوظ ہوتا۔ اس لیئے اس احمقانہ دخل اندازی کا کہ "تم نے کچھ نہ کیا!" کوئی موقع نہ تھا۔ اس واقعہ سے میرے ذہن میں سٹفینس کی اس بات کی جو اس نے ہیمنگوے کے بارے میں کہی تھی یاد تازہ ہو گئی، اور میں سوچنے لگا کہ یہ بہتر ہوتا اگر میں نے اس سے اس کی پوری تشریح کرالی ہوتی۔

اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ایک واقعہ پیش آیا جبکہ ارنسٹ نے اپنی کتاب "سہ پہر کو موت" ( Death in rhe Afternoon ) شائع کی تھی جس میں بیلوں کی لڑائیوں اور خوں ریزی کے "مذہبی جنون" کا ذکر تھا۔ خونریزی بھی وہ جو موت کے خلاف بطور احتجاج کی جاتی ہو۔ اِسی زمانہ میں مجھے اسپین جانے کا اتفاق ہوا اور بیلوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کی کوشش کی۔ خوبصورت جانوروں کے شائقین کی طرح مجھ میں بھی اس نظارہ سے غیظ و غضب کے جذبات پیدا ہوئے۔ میں پوری شدّت کے ساتھ اُس بیل کا حمایتی بن گیا اور مجھ میں بھی وفورِ جذبات کے باعث بیل کی طرح یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اِن بھیس بنائے ہوئے اور سازوسامان سے لیس بہادروں کے جسموں میں سینگ گھونپ دوں جو اُس کو تکلیف پہونچا رہے تھے۔ عام طور سے میرا خیال ہے کہ

بے سمجھ جانوروں کو اپنی تفریح کی خاطر تکلیف دینا یا اپنے کو بہادر ثابت کرنے کے لئے ایسا کرنا انسان کے بہت ہی پست مشاغل میں سے ہے۔ اس لئے جب ارنسٹ کی کتاب جو بیلوں کی لڑائی کی جذباتی تعریف سے پُر تھی میرے ہاتھ لگی تو میں نے بیلوں کی لڑائیوں اور ارنیسٹ کے کردار کے متعلق جیسا کہ کتاب سے منکشف ہوتا تھا۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ میں نے اپنے مضمون کا نام "سہ پہر میں بیل" ( Bull in the Afternoon- ] ) رکھا اور یہ مضمون جون ۱۹۳۳ء میں رسالہ "نیوری پبلک" میں شائع ہوا۔

ارنسٹ کے متعلق میرا یہ خیال تھا کہ ایک ادیب کی حیثیت سے وہ اس درجہ حسّاس تھا کہ خود اس کے کہنے کے مطابق گولہ باری کے وقت اس کی جان پر بن گئی تھی، لہٰذا اب ردِ عمل کے طور پر وہ اپنی اس مخصوص عادت کی ضرورت سے زیادہ اصلاح کرنی چاہتا تھا اور اپنے آپ کو ایک ایسا ہنگامہ پسند اور سخت گیر شخص ثابت کرنے کی طرف مائل تھا جو زیادہ سے زیادہ خون ریزی پسند کرتا ہے اور جو زیادہ سے زیادہ کشت و خون برداشت کرنے کی طاقت کا اظہار کرنے پر تلا ہوا ہے۔

جو واقعات میرے علم میں تھے ان سے یہی صاف اور صریح نتیجہ نکل سکتا تھا، لیکن اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ارنسٹ کا جسم بم کے حادثہ میں چھلنی ہو گیا تھا، اس کے جسم سے بم کے گولہ کے ۲۳۷ ٹکڑے نکالے گئے تھے اور شفاخانہ میں وہ ہفتوں ایسے دماغی کرب میں رہا تھا کہ اندھیرے میں سو بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے میرے سامنے نہ کبھی اپنے زخموں کا ذکر کیا تھا نہ اس تکلیف نہ

سانحہ کے متعلق کچھ کہا تھا۔ درحقیقت مجھے تو یہ بات ابھی حال ہی معلوم ہوئی جبکہ میں فلپ ینگ کے لکھے ہوئے، ایک تنقیدی مطالعہ "ارنیسٹ ہیمنگوے" کو پڑھ رہا تھا۔ اس مختصر سی کتاب کے مطالعہ سے جو بہت محنت سے لکھی گئی تھی مجھے معلوم ہوا کہ میں نے وجدانی طور پر جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کی اس سے بخوبی تائید ہوتی ہے، اور میرے نظریہ کا اطلاق نہ صرف "سہ پہر کی موت" (.Death in the Afternoon) پر ہوتا تھا بلکہ ہیمنگوے کی ہر ایک تصنیف اور ہر تحریر پر جو اُس نے ہمارے عصر میں" اور "مرد بزرگ اور سمندر" (The Old Men and the Sea. کے) کے درمیانی وقفہ میں لکھی تھیں "۔ یہ اس بدی اور تشدد سے فرار ہے جو ہیمنگوے کی زندگی اور اس کی تصنیفات مستقلاً دہراتی رہیں گی"۔ اس نظریہ کے اطلاق سے جس کی ابتدا میں نے کی تھی ایسے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے کہ میں اپنے ہی الفاظ میں اس کا اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہے "ہیمنگوے کی تصنیف میں، جو بیلوں کی لڑائیوں سے متعلق ہے بعض جز نہایت رنگا رنگ اور شاندار ہیں۔ اعلےٰ ظرافت بھی ہے اور حقیقتِ اشیا کے متعلق بے لاگ صاف صاف گفتگو کی گئی ہے، اور ابطال حقیقت کے متعلق جو بکواس کی جاتی ہے اس پر دردمندانہ اور شدید غضب ناکی کا اظہار بھی موجود ہے۔ ہیمنگوے شاعری کے تیز دشنہ کی کاری ضرب سے اپنا راستہ آگے کی طرف صاف کرتا ہے اور یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔ ساتھ ہی بیل کی سی حیوانی خاصیت بھی ہے۔ جس کو اگر بہت ہی ثقاہت سے بیان کیا جائے۔ تو اس کی ان تحریروں پر بکھری ہوئی اور جمی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو بیلوں کی لڑائیوں سے متعلق ہیں۔ بیل سے میری مراد یہ ہے کہ معمولی واقعات

کو طفلانہ رومانیت اور جذباتیت کا رنگ دیا گیا ہے۔"

یہ تو میرے مضمون کا آغاز تھا۔ اس کے بعد میں نے یہ سوال کیا تھا "ہمارا یہ صاف گوئی کا زبردست حامی، ہمارا پورا قد آور انسان، ہمارا ہیبت ناک حقیقت پسند شخص اس وقت اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیتا اور اپنے آپ کو طفلانہ رومانیت کے بادلوں میں چھپا لیتا ہے جب وہ بیلوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے اسپین کی سرحد میں داخل ہوتا ہے؟ یہ تو عام طور سے مشہور ہے کہ ہیمنگوے میں یہ پرسکون اعتماد پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ ایک مکمل قد آور انسان ہے۔ ہم میں سے بھی بہت سے لوگ جن کی نشو ونما ناز و نعمت کے سایہ میں ہوتی ہے جب جوان ہو کر فنکار بن جاتے ہیں تو وہ اکثر اس جذبۂ ہیچ میرزی کا شکار رہتے ہیں لیکن بعض واقعات نے ہیمنگوے کو ایک ایسے غیر منقطع احساس کا پابند کر دیا ہے کہ وہ یہ یقین کرنے لگا ہے کہ اسے اپنی بھرپور مردمی کا بیّن ثبوت دینا ہے۔ اس کے کردار کی یہ خصوصیت اتنی نمایاں ہے کہ انگریزی ادب میں اس کے ذریعہ سے ایک نئے ذوق کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ذریعے افسانہ نگاروں کے ایک حقیقی مکتبہ نے جنم لیا ہے۔ اس ادبی اسلوب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے اپنے سینہ پر مصنوعی بال لگا لینا۔"

میرے مضمون میں آغاز کی طرح خاتمہ پر بھی ان وجوہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جن کی بنا پر میں اس کی طبیعت کے اس بے کیف رجحان کے باوجود ہیمنگوے کو اتنا قابلِ احترام سمجھتا ہوں۔ میں نے بیان کیا تھا کہ دوسرے شاعروں نے پچھلی جنگِ عظیم کی سفّاکانہ "خونریزی" کے طوفان سے نکل کر اس کے المیہ اور ہولناکی کا ماتم کیا ہے

ان کی تلخ نوائیاں جنگ عظیم کے بعد کی شاعری کی صحیح نمائندگی کرتی تھیں وہ غیر معقولیت کے مسلک کی خود پسندانہ مبتذل شاعری نہ تھی، نہ وہ معمولی اخلاقی مقتضیات تھے (وہ بے وقعت مسلک جس کو ارنسٹ ہیمنگوے نے نہایت خوبی سے اپنی کتاب کے ایک پیرے میں قطعی مہمل ثابت کر دیا تھا) نہ وہ اس شدید دورِ مے نوشی کا جدید لا ابالی پن تھا جو ان حساس اعصاب کے لئے ناقابل برداشت تھا جن کو ترکیب تمدنی زندگی اور بہیمانہ خونریزی کے امتزاج سے ہوئی تھی۔

اگر میں یہ کہوں کہ ارنسٹ ہیمنگوے ان شاعروں میں نہایت حساس اور زندہ دل ہے اور خود پسندی، نمائشی تواضع، عمر رسیدہ کنواریوں جیسے اخلاق اور غیر معقولیت کے نقاب میں پوشیدہ بے معنی خیالات کا سب سے زیادہ پرجوش مخالف ہے تو کیا یہ بات کسی معالج کی تشخیص کی طرح مبالغہ آمیز سمجھی جائیگی میں ادب کے نفسیاتی تجزیہ میں زیادہ مہارت نہیں رکھتا ہوں لیکن میں اپنا یہ قیاس ظاہر کیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی کتاب "سہ پہر کو موت" کا شمار بھی انہی ہیبت ناک مناظر کے بیان سے متعلق ہے۔

میرے مضمون کا مطلب بالکل صاف ہے اور اس مضمون کو دوبارہ پڑھ کر بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ میں اس مردانہ وصف کے مظاہرے کی ضرورت کے سوا جو اکثر ذکی الحس بچے محسوس کرتے ہیں، کسی اور موضوع پر اظہارِ خیال کر رہا ہوں۔

میں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریر کیا ہے کہ بچپن میں خود مجھے اس ضرورت کا شدید احساس تھا اور اس جذبہ سے مجبور ہو کر میں نے مردانہ دلیری

کا جو ایک تنہا مظاہرہ کیا تھا اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اگر میں نے ارنیسٹ کے نفسیاتی تجزیہ کی جرأت کی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بھی ان جذبات کا جن کو میں نے ارنسٹ سے منسوب کیا ہے پورے طور پر حامل تھا۔

حالات مذکورۂ صدر کی روشنی میں آپ اندازہ کیجئے کہ جب بروس بلیون (Bruce . Büven. Sr.) ایڈیٹر "نیوری پبلک" نے مجھے بلا کر دریافت کیا کہ کیا تم ہیمنگوے پر نامردی کا الزام لگانا چاہتے ہو تو مجھے کتنا تعجب ہوا ہوگا! معلوم ہوا کہ آرچبالڈ میکلش نے میرے مضمون سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا اور ایک پورے صفحہ کا خوب گنجان لکھا ہوا غضب آلود خط ارسال کیا تھا جس میں اس نے مطالبہ کیا تھا کہ اس کے ہیرو کو اس "سنگین اور ناقابل تلافی تہمت" سے بچایا جائے میرا اصل جرم اور خاص قابلِ اعتراض جملہ میکلش کی رائے میں یہ تھا "یہ تو عام طور سے مشہور ہے کہ ہیمنگوے میں یہ پرسکون اعتماد پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ ایک مکمل قدآور انسان ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ میں جنسیات کے متعلق گفتگو کر رہا تھا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ میں نے ہیمنگوے پر نامردی کا الزام لگایا ہے[1]۔ لیکن آرچبالڈ نے اس کا یہی مطلب سمجھا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ "مسٹر ایسٹ مین نے مردمی کے جن ذاتی شہادتوں کا اس قدر نفاست سے اور بلاواسطہ طور پر ذکر کیا ہے ان سے تو میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں، لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ پیرس اور کنساس شہر کے اندراجات پیدائش کو دیکھ کر رازدارانہ طریقہ سے اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔"

بروس بلیون نے بھی جو اس خط کو پڑھ کر میری طرح متعجب ہوا تھا مجھے

---

[1] دیکھو صفحہ — نوٹ مصنف صفحہ ۱۵۷

مشورہ دیا کہ آرچبالڈ سے کوئی ایسی بات کہو کہ وہ ایسے الزام سے جو عاید ہی نہیں کیا گیا ہے ہیمنگوے کی بریت پیش کرنے کے عزم سے باز آجائے۔ اس نے کہا "اگر ایسا کیا گیا تو ہیمنگوے کو یقیناً ضرر پہنچے گا۔" چنانچہ ہم دونوں نے میکلش کو علیحدہ علیحدہ خط اس انداز سے لکھے کہ اس کا اشتعال دور ہو جائے اور وہ اپنی فطری اعتدال پسندی سے کام لے کر معاملہ پر غور کر سکے۔

بروس نے لکھا "مجھے بہت حیرت اور کوفت ہوئی ہے۔ ہمارے دفتر والوں میں سے کسی نے بھی ہیمنگوے سے متعلق آرٹیکل میں وہ خاص بات نہیں پائی جو آپ کو نظر آئی۔ میں نے حتی الامکان ہر ایک سے اس کے متعلق دریافت کیا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس تحریر کے وہ معنی نہیں لئے جو تم نے لئے جن لوگوں سے میں نے مشورہ کیا ان میں ایڈمنڈ ولسن، رابرٹ مورس لوویٹ، رابرٹ کینٹ ویل، جارج سولے اور سلیٹر براؤن شامل ہیں۔"

میرے خط کا مضمون یہ تھا "ڈیر آرچبالڈ میکلش آپ کے مراسلہ بنام بروس بلیون کو پڑھ کر مجھے صدمہ پہونچا اور بہت حیرت ہوئی۔ کسی شخص کے خلاف اپنی تحریرات میں طعن و تشنیع کی بوچھار کرنا یا کسی کی رسوائی کرنا میرے دماغ اور طبیعت سے بہت بعید ہیں۔ ارنیسٹ کے لئے تو میرے دل میں حقیقی محبت اور ادبی نقطۂ خیال سے ایک وسیع جذبۂ تحسین موجود ہے۔

اس خط کا جواب میکلش نے بہت ہی شائستگی سے دیا اور اس نے میری اس یقین دہانی کو کہ میری نیت اس کو نقصان پہنچانے کی نہ تھی تسلیم کرتے ہوئے لکھا "اپنی زندگی میں کسی تحریر کو پڑھ کر میں اتنا برافروختہ اور رنجیدہ نہیں ہوا

جلنا تمھارے مضمون کے مطالعہ سے" معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں اس نے اپنی غلط فہمی کے متعلق ارنسٹ کو بھی مطلع کردیا تھا کیونکہ "ہوانا" سے مندرجہ ذیل مضمون کا ایک خط "نیوری پبلک" کے مدیروں تغنی کے نام آیا اور اس میں دو طعن آمیز جملے کسے گئے تھے جن کو ایڈیٹوریل اسٹاف کے ارکان نے خوب سمجھ لیا ہوگا۔

جناب عالی! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ مسٹر میکس ایسٹ مین کو ان کے ان مریضوں جیسے خیالات کی جو انھوں نے میری مردانہ کمزوری کے متعلق ظاہر کئے ہیں وضاحت کرنے پر آمادہ کریں۔ یہاں انھیں مزے لے لے کر (بلند آواز سے) پڑھا جائے گا (ہماری تفریحات سادہ ہیں) اور اگر آپ نے پسند کیا تو مسٹر ایسٹمین کی نثر نگاری کو چمکانے کے لئے میں انھیں تصویریں مہیا کرنے میں خوشی محسوس کروں گا۔ مسٹر الیگزینڈر وولکاٹ اور ادھیڑ عمر کے مسٹر ایسٹمین دونوں میری مردانہ کمزوری کے متعلق پُرزور شکوک شائع کرچکے ہیں لہٰذا ایسی صورت میں کیا یہ توقع دوراز کار ہوگی کہ مسٹر اسٹارک ینگ بھی اس بارے میں کچھ بیان فرمائیں گے۔

آپ کا

ارنسٹ ہیمنگوے

یہ خط پڑھنے کے بعد میں نے ارنسٹ کو مندرجۂ ذیل خط تحریر کیا جس کا اس نے جواب نہیں دیا:

"ڈیر ارنسٹ! اگر تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں نے ایسی کوئی بات تمھارے متعلق کہی ہے یا میری تحریر سے اس طرح کا مطلب اخذ ہوتا ہے تب تو تمہارا

مراسلہ بنام اخبار نیوری پبلک، حق بجانب ہے لیکن تمھیں تو میرے متعلق زیادہ حسن ظن ہونا چاہیئے۔ میں نے افواہًا بھی کبھی یہ نہیں سُنا کہ تم جنسی اعتبار سے یا کسی اور طرح کمزور ہو، حالانکہ خود اپنے متعلق اس قسم کی افواہیں میں نے سُنی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں مرض آتشک میں مبتلا ہوں۔ مجھے تو یہ خیال ہی ایک قسم کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ دُنیا میں کچھ کام کرتے ہیں ان کی قدر شناسی اسی طرح کی جاتی ہے۔

میرے خیال میں کسی شخص کا ادبی تنقید کے رنگ میں نفسیاتی تجزیہ کرنا ایک خوش گوار امر ہے بالخصوص ایسے فرد کا جس کو تم اپنا دوست سمجھتے ہو، لیکن میری رائے میں ہماری طرف سے ظلم میں اضافہ کرنے کی کوشش کے بغیر ہی دُنیا ظلم سے بھری ہوئی ہے اور میرا اس قسم کے ظلم سے بچنے کے اصول کا حتی الوسع پُرزور اعادہ کرنا اپنے استحقاق سے تجاوز کرنا نہ ہوگا۔"

اس داستان کے دوسرے باب کا آغاز چار سال بعد اگست ۱۹۲۷ء میں شروع ہوتا ہے جب میں میکس ویل پرکنس سے ملا جو چارلس اسکر بنرز سنز کا ایڈیٹر اور نائب صدر تھا، میکس ویل ایک شرمیلا اور حساس آدمی تھا اس کے شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ جب وہ بولتا تھا تو بعض اوقات اس کے لب کانپنے لگتے تھے۔ اس کمزوری کو دبانے کے لئے اور شاید اپنے دفتر کی رئیسانہ روایات کے خلاف احتجاج کے طور پر وہ جب کام کرنے کے لئے اپنی میز پر بیٹھتا تو ایک پُرانا فیلٹ اپنے سر کے پچھلے حصّہ پر رکھ لیتا تھا۔ وہ بڑا چالاک لیکن ساتھ ہی فیاضانہ بلکہ مشفقانہ ہمدردی کرنے والا مُدیر و ناشر تھا۔ جس کی بہت سے لوگوں نے

تصدیق کی ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ میں گلدستۂ اشعار تیار کروں اور اس کو اپنی کتاب "لطفِ شعر" کے نئے ایڈیشن کے ساتھ فروخت کرنے کے لئے شامل کروں۔ یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں جس سال میکس ویل اس فرم میں شامل ہوا تھا اسکرینر نے شائع کی تھی، اور اس کی اشاعت میں وہ اسی وقت سے بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔

وہ اپنی میز کے پیچھے دروازہ کی طرف رُخ کیے بیٹھا تھا اور میں اس کے دائیں جانب اسی رُخ پر تھا۔ ہماری مزاجی کیفیت نرم اور خوش گوار تھی اور ہمیں غیر معمولی طور پر حیرت ہوئی جب ارنیسٹ ہیمنگوے ایک عظیم الجثہ موٹا تازہ پھرتیلا شخص بڑی اکڑفوں سے کمرہ میں داخل ہوا اور آتے ہی اس طرح مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہیلو۔ کتیا کے بڑے بچے!"

یہ کہہ کر وہ واقعی ہنسا یا محض میرا گمان ہے کہ وہ ہنسا، اور میں نے جواب دیا:

"ہیلو، ارنسٹ! بڑا؟ تم تو پہلے سے دوگنا بڑے معلوم ہو رہے ہو!" یہ کہہ کر میں نے اس کا بازو چھوا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس کا قد و قامت بڑھ جانے سے بازو میں ڈھیلا پن تو نہیں آگیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے؟" اس نے جواب دیا "میں اسپین جا رہا ہوں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تمہارا پی۔ او۔ یو۔ ایم[1] کیا کر رہا ہے؟ کیا پی۔ او۔ یو۔ ایم تمہارا نشان امتیاز ہے؟

---

(مصنف)

[1] اسپینی انقلابیوں کا ایک گروہ جو اسٹالن کی آمریت سے ناخوش ہو کر ٹرانسکی کے موقف کو اپنانا چاہتا تھا

میں نے کہا "میرا کوئی نشان امتیاز نہیں ہے ارنیسٹ! میں تو صرف سچ بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔" "اوہ۔ ہو۔" اس نے جواب میں کہا۔

اب تم اسٹالن کے اس شریر گروہ کے ساتھ نہیں ہو، گیا ہو؟" میں نے دریافت کیا۔ اور اس نے جواب میں پُرزور طریقہ پر کہا۔ "نہیں!" میں نے جواب دیا "یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔"

اب ہم اینڈریزن ( .Andersuin ) کے بارے میں گفتگو کرنے لگے جس کو ابھی جیل سے نکال کر اسٹالن کے پیروؤں نے قتل کر دیا تھا۔ وہ انقلابی تحریک کے افراد میں بہترین آدمی تھا۔ ارنسٹ نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ہر جگہ اس کی تعریف سنی ہے۔ میں نے کہا "گزشتہ موسم سرما میں کی ویسٹ ( .Key West ) میں تم سے ملاقات نہ ہونے کا بہت افسوس رہا۔ تمھاری بیوی بچوں سے مل کر اور تمھارے مکان کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔"

"بے شک۔ مجھے بھی افسوس ہوا۔" اس نے خوش گوار خلوص سے جواب دیا۔ پھر یکایک گویا کہ اس کو کوئی بھولا ہوا کام یاد آگیا وہ میرے قریب آکر کہنے لگا "میں تم کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی قمیص کا ایک بٹن کھولا اور اپنا سینہ ننگا کر کے اپنے موٹے اور حیرت انگیز طور پر سیاہ بال میرے سامنے کر دیئے۔

"کیا یہ مصنوعی بال ہیں؟" اُس نے پوچھا اور اپنی اُنگلیاں بالوں میں ڈالیں پھر اس نے میری قمیص کا ایک بٹن کھولا۔ ہم تینوں ہنس رہے تھے یا کم از کم میرا یہی گمان تھا، اور میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھے سمجھ لیا ہے۔" اس کی ہنسی ختم ہو گئی اور اس نے کہا "دیکھو! تم نے یہ کس غرض سے کہا کہ میں نامرد

ہوں۔"

"ارنسٹ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے یہ یا اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی۔ تمھیں خود ہی شرم آنی چاہیئے۔ ہم اتنے عرصہ سے آپس میں دوست بنے ہوئے ہیں اس لئے تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں ایسی طعن آمیز باتوں میں حصہ نہیں لیتا ہوں۔"

"بے شک تم نے ایسا کیا تھا اور تم ان بدمعاشوں سے ملے ہوئے ہو جو اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

میں نے کبھی نہیں سُنا کہ ایسی بات کہی گئی ہو، میرے خواب میں بھی نہیں کہ کسی شخص نے ایسی بات کہی ہو۔ کیا تمھیں میرا خط مل گیا تھا؟"

"ہاں مل گیا تھا اور میرے خیال میں وہ بھی بہت ناگوار تھا۔ اس کے علاوہ پیرس کے زمانۂ قیام میں تم نے ٹیکسی میں میری بیوی کا بوسہ لینے کی کوشش کی تھی۔"

"میں کبھی بھی تمھاری بیوی کے ساتھ ٹیکسی میں نہیں بیٹھا اور نہ کبھی مجھے اسکا بوسہ لینے کا خیال آیا۔"

"تم نے ضرور کیا اور میری پسِ پشت تم اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہو۔ اگر تمھارا مضمون یہاں ہو تو میں تمھیں دکھاؤں کہ تم نے کیا کیا کہا۔"

میں نے اپنے مجموعہ مضامین "آرٹ اینڈ لائف آف ایکشن" نسخہ اُٹھا کر جو پرکنس کی میز پر پڑا ہوا تھا اس کو دیا اور کہا "لو میرا مضمون یہ ہے۔ مجھے اور میکس کو بتا دُ اور وہی اس بات کا فیصلہ کر دے کہ میں نے کہیں صاف صاف یا اشارۃً یہ کہا ہو کہ تم نامرد ہو۔"

اس نے کتاب لے لی اور اس مضمون کے ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھے، پھر بڑبڑایا
تم نے اس میں سے نکال لیا ہے۔" پھر کہا، "لو یہ ہے میں ابھی تمھیں دکھاتا ہوں۔"
"میکس کو دکھاؤ"، میں نے اس سے کہا۔

وہ بولا "نہیں میں اس کو نہیں دکھاؤں گا میں تمھیں دکھاؤں گا۔ غور سے سنو"۔ یہ کہہ کر اس نے مضمون کا وہ حصّہ پڑھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے: "لیکن بعض حالات نے ہیمنگوے کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی کامل مردمی کی شہادتیں دکھاتا پھرے،، اور ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے "اس کے کردار کی یہ خصوصیت اتنی پختہ ہے کہ انگریزی ادب میں اس نے ایک نئے مذاق کی بنیاد قائم کر دی ہے اور اس سے افسانہ نگاروں کا ایک خصوصی مکتب پیدا ہو گیا ہے۔ اس ادبی اسلوب کو استعارۃً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنے سینے پر مصنوعی بال لگانا ہے۔"

اس نے دریافت کیا "اس کے کیا معنی ہیں؟ بعض حالات؟"

میں نے جواب دیا "اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حالات کا مجھے خود کوئی علم نہیں ہے، لیکن اس سے مراد جنسی کمزوری نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے پیراگراف میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ میں نے لکھا ہے۔ "ہیمنگوے جسمانی طور پر ایک مکمل انسان ہے جس کو میں بہت پسند کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا "کچھ پروا نہیں، میں اس کے متعلق نہیں بات کر رہا ہوں۔"

اس کی بدتمیزی اب بڑھتی جا رہی تھی اور جب اس نے غصہ میں یہ بات کہی تو مجھے زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ "تم خوب جانتے ہو کہ تمھارا کیا مطلب تھا

یہ کہہ کر اس نے کھلی ہوئی کتاب میرے منہ پر پھینک دی۔ اتنے زور سے تو نہیں کہ جس سے مجھے چوٹ لگتی لیکن توہین آمیز طریقہ پر ضرور۔

میں نے جو اس کا جواب دیا وہ اگرچہ غضب ناک اور فوری تھا لیکن محتاط تھا۔ میں جانتا تھا کہ مکہ بازی کے مقابلہ میں ارنسٹ مجھے آدھے سیکنڈ میں چت کر دیتا لیکن میں کشتی لڑ سکتا تھا۔ میں اس سے لپٹ گیا اور اتنا قریب ہو گیا کہ وہ مجھے مار نہیں سکتا تھا۔ کچھ چکر دے کر اور داؤ پیچ کر کے میں نے اس کو اس طرح سے پھینک دیا کہ اس کی پشت پر کنس کی ڈیسک پر اور اس کا سر فرش پر جا پڑا۔ میرا ہاتھ اس کے گلے پر تھا اور اگرچہ میری خواہش تو نہ تھی لیکن کسی قدر یہ خیال ضرور تھا کہ اس کے ساتھ کچھ زیادتی کروں۔ زیادہ صحیح تو یہ ہے کہ میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اپنی "عزت" کے تقاضے میں مجھے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ میں یہ بھول گیا کہ میں بھی اس کی زیادتی کے جواب میں ایک کتاب اُٹھا کر اس کے منہ پر مار دوں۔

ارنسٹ نے خود ہی اس مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا کہ وہ اپنے قدیم دوستانہ طریقہ پر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر میری پیٹھ تھپکنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا "خوب خوب تم اتنے نازک نہیں ہو جیسا کہ میں خیال کرتا تھا"۔ یا شاید یہ کہنا چاہتا ہو "ٹھیک ہے۔ میرے دونوں شانے فرش پر جا لگے"! اس کے اس انداز سے میں اور کچھ نہیں تو اپنی اصلی حالت پر آ گیا یعنی وہ حالت جس میں لڑائی جھگڑا۔ ناخوش گوار ہوتا ہے اور دوست ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لمحہ شریفانہ طبع

اور خوفزدہ میکس پرکنس نے نیچے کو جھک کر میرے کان میں کہا "میکس! مہربانی کرکے ایسا مت کرو!"

مجھے یاد ہے کہ وھٹنے ڈارو (Whitney Darrow Sr.) بھی اسی قسم کی کوشش دروازہ کی طرف سے کر رہا تھا اور بہت سے سکریٹری اور اسٹینوگرافر جن کے چہروں سے مسرت آمیز پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ غالباً دروازہ پر آکر جمع ہو گئے تھے۔ معاشرتی اعتبار سے اگر اور کچھ نہیں تو یہ صورتِ حال بہت تکلیف دہ تھی۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا کرنے میں مجھے راحت محسوس ہوئی ارنیسٹ بھی ہاتھ پاؤں جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں نے کتابیں جاذب قلم اور پینسلیں جمع کرنا شروع کیں جو ہماری زور آزمائی کے نتیجہ میں ادھر اُدھر بکھر گئی تھیں اور میز صاف ہو گئی تھی۔

پرکنس بولا "لڑکو! تم ان کو سمیٹنے کی تکلیف نہ کرو۔ لڑکیاں سمیٹ لیں گی"۔ میں نے جواب دیا "بہت ٹھیک میں تھکا ہوا ہوں"۔ اور یہ کہہ کر میں کرسی پر جا بیٹھا۔

"جونہی میں کرسی پر بیٹھ گیا ارنیسٹ اپنے اسی دوستانہ طریقہ پر مسکراتا ہوا میرے پاس آیا اور پھر میرے شانے ٹھونکنے لگا، لیکن پھر گویا وہ کوئی چیز بھول آیا ہے۔ وہ ڈیسک کے سامنے خالی جگہ پر چلا گیا اور وہاں کھڑے ہو کر زور زور سے مجھے برا بھلا کہنے لگا۔ "میں نے تمھاری کتاب ہی تمھارے منہ پر دے ماری۔ میں نے تم کو یوں ہی چھوڑ دیا، دیکھا؟"

جب میں نے غور کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ وہ دروازے میں یا برابر والے

کمرہ میں جو لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں ان کو سنانے کے لئے ایسی باتیں کہہ رہا تھا، لیکن اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے جذبات کے یہ تغیرات محض احمقانہ تھے۔ میں نے صرف اتنا کہا "ارنیسٹ! میں سمجھتا ہوں کہ تم پاگل ہو" لیکن یہ الفاظ سنتے ہی اس کا غصہ یا جو کچھ بھی اس کے وقتی جذبہ کو نام دیا جائے اور بھی بڑھ گیا۔ جب اس نے ایسا فحش کلمہ استعمال کیا جو مبارزہ طلبی کے لئے حرفِ آخر کا کام کرتا ہے تو اس سے دوبارہ اُلجھ پڑنے کے بجائے میں پرکنس سے مخاطب ہوا "میکس! تم سے کون ملنے آیا ہے؟ ارنیسٹ یا میں، میکس بہت ہی پریشانی کے عالم میں تھا۔ وہ کچھ خاموش رہا۔ اسی عرصہ میں ارنسٹ بول اُٹھا "اچھا میں سمجھ گیا۔ میں باہر جاتا ہوں" اور وہ اپنا کالر اور ٹائی ٹھیک کر کے چلتا بنا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے میکس سے کہا "یہ تو ہمارے گلدستۂ اشعار کے موضوع سے بالکل غیر متعلق معاملہ پیش آگیا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

اس نے تسلّی بخش بے ربطی کے ساتھ جواب دیا "خیر کچھ بھی ہو جیت تمھاری ہوئی" جب میں باہر نکلا تو ہیمنگوے جو اب دوسرے کمرہ میں موجود تھا چیخ چیخ کر لوگوں کی آنکھیں نکال لینے" کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ بظاہر یہ میرے اوپر ایک طنز تھا کہ میں بجائے اس کے کہ دور کھڑے ہو کر اس کو کوئی چیز مارتا اس سے کشتی میں اُلجھ گیا۔ یہ طنز جلد ہی کوئی بڑی انوکھی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ یہ طنز ٹھیک تو تھا، لیکن میں دیانت داری کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جان بچانے کے لئے جس ہتھیار کا انتخاب کیا اس کا مجھے کوئی افسوس ہے۔ چند ہفتہ بعد

جب میں میکس پرکنس سے ملنے کے لئے آیا تو اس نے کسی قدر میری دلجوئی کی۔

اس نے کہا "گزشتہ موقع پر یہاں تمھاری موجودگی کے وقت جو پریشان کن صورت حال پیش آئی اس پر میں کچھ اظہار خیال کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا میں ضرور کہوں گا کہ تمھارا طرزِ عمل بہت شاندار رہا۔ تم نے عادلانہ عمل کا مظاہرہ کیا تم اس قسم کی حرکت کا ردِ عمل پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے اور تم نے مناسب حد کے اندر رہ کر کارروائی کی۔"

ممکن ہے میرا طرزِ عمل عادلانہ رہا ہو لیکن اس وقت میرا مدعا اتنا صاف نہیں تھا۔ میں غصہ میں تھا، خوف زدہ اور حواس باختہ بھی تھا، خاص طور پر حواس باختہ ضرور تھا۔ ان حالات میں کسی مہذّب شخص سے کس قسم کے عمل کی توقع کی جا سکتی ہے؟

میں اس واقعہ کو اتنی تفصیل کے ساتھ اس لیے بیان کر سکا ہوں کہ ارنسٹ کے غلط طرزِ عمل کے پیشِ نظر مجھے یہ اندیشہ قوی تھا کہ وہ اس معاملہ کو افسانوی رنگ دے دے گا، اس لئے میں نے فی الفور گھر پہونچکر جو کچھ حادثہ پیش آیا اور جو کچھ کہا سنا گیا اس کو بلا کم و کاست لکھ ڈالا۔

میرا اندیشہ صحیح تھا اور جہاں تک اس مضمون کے ہیرو کا تعلق ہے۔ اس کی اصل داستان اب شروع ہوتی ہے۔ اس شب الینا اور میں اپنے ہمسایوں ایرک (Eric) اور جیر نائٹ (Jere Knight) کے ساتھ کروٹن بیس رات کے کھانے پر جمع ہوئے تھے اور میں نے اپنی یہ داستان ان کی ضیافتِ طبع کے لئے سُنائی۔ دو روز بعد صبح کے وقت ایرک شہر گیا اور دوپہر کو اخبار پوسٹ اور ورلڈ ٹیلیگراف کے

دو ٹیلیفون آئے جن میں مجھ سے دریافت کیا گیا تھا کہ اسکر بنرز کے دفتر میں جو واقعہ پیش آیا اس کی تفصیلات کیا ہیں۔ وہ اس داستان کو اخبار میں چھاپنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ کوئی غلط بات شائع نہ ہو جائے۔ میں نے پوسٹ کے نامہ نگار کو اصل واقعات اسی وقت زبانی طور پر بتا دیئے اور ورلڈ ٹیلیگرام کو (جو میرے خاص دوست تھے) میں نے ٹیلیفون پر اپنی لکھی ہوئی داستان کا خلاصہ پڑھ کر سُنا دیا۔ اس زمانہ میں ہیمنگوے اخبار والوں کی نظروں سے گرا ہوا تھا اس لیئے کہ اس کی عادت تھی کہ جو تبصرہ نگار اس کی کتابوں کو پسند نہیں کرتے تھے ان کی وہ بُری طرح خبر لیا کرتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ تمام اخباری دُنیا اس بات کی متمنی تھی کہ کوئی ایسا شخص ملے جو ہیمنگوے کی خبر لے۔ میں نے بڑی کوشش سے ان ہر دو نامہ نگاروں کو یقین دلایا کہ میں یہ فرض ادا کرنے سے افسوسناک طریقہ پر قاصر رہا ہوں۔ لیکن میرے اس اظہارِ معذوری سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ہر دو اخبارات نے اپنے پہلے صفحہ پر ایک بے تحاشا ہنستی ہوئی تصویر جو انھوں نے میری کتاب "لطفِ خندہ" کے گرد پوش سے چربہ لے کر تیار کی تھی چھاپ دی اور اس کے برابر ارنسٹ کی تصویر شائع کی جس میں اس کو بہت دل گرفتہ، منہ پھلائے ہوئے انداز میں دکھایا گیا تھا۔ اخبار پوسٹ کی سُرخی کے یہ الفاظ تھے:

"ارنسٹ! ہیمنگوے کی عزت خاک میں مل گئی۔ جب ایسٹمین نے ارنسٹ کی چھاتی کو بے نقاب کر دیا۔ اچھی طرح اس کی مرمت کر دی۔ ادبی موشگافی نے سلنڈر کی کُشتی کے شائق کو چاروں شانے چت گرا دیا اور عینکیں فاتحانہ شان سے نکل آیا۔"

اس سُرخی کے ذیل میں ایک طویل داستان لکھی۔ جوان الفاظ پر ختم ہوئی تھی۔ مسٹر ایسٹمین ایک مضمون تیار کر رہے ہیں جس کا عنوان یہ ہوگا "ارنیسٹ کو درست کرنے کی مسرّت"، ورلڈ ٹیلیگرام نے ذرا محتاط انداز اختیار کیا، لیکن ان دونوں اخباروں بلکہ ملک کے ہر ایک اخبار نے جن کو مشہور خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ سے خبریں ملا کرتی تھیں تقریباً وہی تفصیلات لکھیں جو میں نے بتائی تھیں نیبرٹ کو اپنے من گھڑت افسانہ شائع کرانے میں بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس میں اس کام کی اہلیت موجود تھی۔ اس نے نیویارک ٹائمز کے مراسلہ نگار سے اکربرز کے اداراتی دفتر میں جہاں ظاہر ہے کہ اس کی تردید کرنے والا کوئی نہیں تھا ملاقات کرنے کا انتظام کیا۔ چونکہ "ٹائمز" اس کو نامہ نگار کی حیثیت سے اسپین بھیج رہا تھا اس لئے اس کو یہ بھی یقین تھا کہ میری بات توجہ سے سُنی جائے گی۔ چنانچہ دوسرے دن کی اشاعت میں اس کا بیان حسب ذیل عنوان کے تحت نکلا۔

ہیمنگوے نے ایسٹمین کے منہ پر چپت رسید کی۔" نیویارک ٹائمز میں یہ قصّہ اس طرح شائع ہوا:

"مسٹر ہیمنگوے نے مسٹر ایسٹمین کے ایک مضمون "سہ پہر میں بیل" Bull in the Afternoon. پر تبصرہ کیا۔ مسٹر ایسٹمین نے لکھا تھا:

"ارنسٹ تمہاری چھاتی پر جو مصنوعی بال ہیں ان کے پردہ سے نکل آؤ۔ ہم سب تم کو خوب جانتے ہیں۔" جس کتاب میں یہ مضمون شائع ہوا تھا وہ اتفاق سے مسٹر پرکنس کی کتابوں سے لدی ہوئی میز پر موجود تھی۔ مسٹر ہیمنگوے کا بیان ہے کہ اس کتاب کو دیکھتے ہی میرے جذبات مشتعل ہونے شروع ہو گئے

مزاحیہ انداز سے اسٹین کے روبرو میں نے اپنی چھاتی کھول دی اور اس سے کہا لو اب دیکھو میرے بال مصنوعی ہیں یا اصلی۔ میں نے اسٹین کو بھی مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی چھاتی ننگی کر کے دکھائے اور اس کو بتایا کہ تمھاری چھاتی پر تو بال ہی نہیں ہیں۔ کل مسٹر ہیمنگوے نے کہا کہ ہم اسی طرح آپس میں دل لگی کر رہے تھے، لیکن جب میں نے اس کی طرف دیکھا اور مجھے کتاب کا خیال آیا تو میری خودداری کو ٹھیس لگی۔ میں نے کوشش کی کہ وہ خود اس کتاب میں سے تھوڑی سی وہ عبارت پڑھ کر مجھے سنائے جو اس نے میرے متعلق قلم بند کی تھی، وہ اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ بس اس پر میں نے کتاب اس پر دے ماری۔

نامہ نگار۔ "وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا یا کھڑا تھا؟" ہیمنگوے نے پرکنس کے کمرہ کی کھڑکی کی طرف جہاں ایک نشست بھی تھی اشارہ کرتے ہوئے کہا، "وہ یہاں کھڑا ہوا تھا میں نے اس کو مارا نہیں، اگر میں اس پر حملہ کر دیتا تو میں اس کو کھڑکی میں سے باہر "ففتھ ایوینو" (Fifth Avenue. ) پر پھینک دیتا۔ یہ بہت ہی مناسب ہوتا، کیوں ٹھیک ہے نا؟ اگر میں ایسا کرتا تو میرا افسر مجھ سے ناراض ہو جاتا اور وہ مجھے گرفتار کرا دیتا، اس خیال سے حالانکہ میں طیش میں تھا میں نے اسے صرف ایک چپت رسید کی اور اسی سے وہ زمین پر آ رہا۔"

لیکن تمھیں میز پر کس طرح دھکیل دیا گیا اور ایک کونہ میں تمھیں سر کے بل کیسے گرا دیا گیا؟" ہیمنگوے سے سوال کیا گیا۔

ہیمنگوے! "اس نے کسی کو بھی کہیں نہیں پھینکا، وہ ایک عورت کی طرح میرے اوپر جھپٹا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے نوچنا شروع کر دیا۔ میں نے

صرف اس کو روکے رکھا، میں اسے زخمی کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ مجھ سے دس برس عمر میں بڑا ہے۔"

ہیمنگوے سے دریافت کیا گیا۔ "پھر میز کے تمام کاغذات اور کتابیں کس طرح اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ ایسٹمین کا کہنا ہے۔"

"بے شک چند کتابیں میز کے اوپر سے گر پڑیں۔ وہ مجھ پر جھپٹ کر آیا، میں نے اس کو روکا اور قدرے دھینگا مشتی ہوئی۔ اس کو مجھ سے زور آزمائی کی ہمت نہیں تھی۔ وہ مسٹر پرکنس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ تم سے ملنے کون آیا ہے ارنسٹ یا میں؟ اب میں باہر آگیا، لیکن اس نے کوئی تعرض نہیں کیا، وہ بیٹھ گیا اور صبر کر لیا"

مسٹر پرکنس اور اسکریبنرز کے عملہ کے دوسرے لوگوں نے بجز اس امر کی توثیق کرنے کے کہ یہ جھگڑا ہوا تھا مزید کچھ کہنے سے انکار کر دیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ "یہ دو شریف انسانوں کا ذاتی معاملہ ہے۔"

لیکن ہیمنگوے کے لئے یہ کارگزاری باعثِ تسکین نہ تھی، اس نے یا تو ایک کتاب کہیں سے ڈھونڈھ نکالی یا خود تیار کر لی جس پر ایک دھبا پڑا ہوا تھا، اور ایک دوسرے اخباری بیان میں اس نے ظاہر کیا کہ یہ دھبّا ایسٹمین کی ناک کے زخم کا ہے۔ جب میں نے اس کے منہ پر ایک چپت رسید کی تھی۔" اس معمولی سے تحریری ثبوت سے تقویت حاصل کر کے اس نے ایک اور اخباری رپورٹر سے دورانِ ملاقات میں اظہار کیا کہ ہم نے یہ اقرار کیا تھا کہ اس قضیۂ نامرضیہ کے سلسلے میں کوئی بیان نہیں دیں گے، لیکن ایسٹمین نے اخبارات میں اپنا بیان شائع کر کے اس عہد کی خلاف ورزی کی۔ نیویارک ٹریبون میں جب وہ پہونچا تو اس نے

ایک ایسا افسانہ گھڑا جس سے واقعی اس کی ذہانت آشکار ہوتی ہے۔ اس افسانہ میں اس نے میرے مُنہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا کہ میں "پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور بے ہوش ہوکر کھڑکی کی نشست پر گر پڑا۔"

ایسٹمین کھڑکی کی نشست پر بیٹھا ہوا غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا "ارنسٹ تم بڑے غنڈے ہو۔" میں اب بھی برابر اس کی باتوں پر ہنستا رہا اور بالآخر میں نے کہا "میکس! اگر تم مجھ سے دس سال چھوٹے ہوتے تو میں تمھیں اُٹھا کر دے پٹکتا۔" اس پر وہ میری طرف لپک کر آیا اور میں میز کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور اب بھی ہنستا رہا۔ میں نے کہا "اس شخص کی حماقت کا خاتمہ کراؤ۔ یہ بے حد ضعیف ہے۔" میں نے صرف اس کو روکے رکھا میں اس کو چوٹ سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا . . .

اس کے بیان کی تنقیص اس سے ظاہر ہے کہ یا تو اس کو میرے ضعف کی اتنی فکر تھی یا اپنے بیان کے اختتام پر اس نے کھلم کھلا مجھے چیلنج دے دیا کہ ایک بند کمرہ میں جہاں کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو، میرے مقابلہ پر آؤ، اور میں یکہزار ڈالر کی تھیلی پیش کرنے کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر میں ہار گیا تو جس خیراتی ادارہ کو تم کہوگے دے دیئے جائیں گے یا تمھارے "علاج اور ہسپتال کے اخراجات" کے کام آئیں گے۔

ٹریبون اخبار کے مطابق میں نے اس مبارزت طلبی کا یہ جواب دیا "ہیمنگوے سے کہہ دو کہ میں اس وقت مقابلہ کرتا ہوں جب کوئی پیدائشی یا کوئی خود ساختہ غنڈہ مجھ پر حملہ کرتا ہے۔"

اخباروں کے کارٹون بنانے والوں اور کالم نویسوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ ایک طبقہ نے تو "ارنی" (ارنسٹ) اور میکیسی (ایسٹمین) کے "مقابلہ عمر" پر خامہ فرسائی شروع کردی اور دوسرے نے کروٹن کے درندہ اور ہوانا کے "بزغالہ" کو زیبِ داستان بنایا۔ نیویارکر کے کارٹون نگار ایلین نے بڑی جدت سے کام لے کر یہ دکھایا کہ ایک تنومند نوجوان بالوں سے بھرا ہوا سینہ ایک ڈاکٹر کو دکھا رہا ہے اور ڈاکٹر متعجب ہوکر اس سے پوچھتا ہے "کیا تم انشا پرداز ہو؟" اڈریڈ (Edred. نے آف دی ریکارڈ (Off Record ) کے کالم میں زچہ خانہ کے تین بچوں کی تصویریں بنائیں۔ ان میں ایک کو اسی کے مانند آراستہ کیا ہوا تھا۔ اور دوسرا حقارت آمیز طنز سے کہہ رہا تھا "اس نے اپنے باپ کی بال دار ٹوپی چرالی ہے کیونکہ اس نے سنا ہے کہ دایہ مردوں کو زیادہ پسند کرتی ہے۔" میرے حافظہ میں کسی تبصرہ نگار کا یہ فقرہ اب تک تازہ ہے کہ "ہر شخص جانتا ہے کہ جب ارنسٹ تیرنے کے لئے جاتا ہے تو وہ اپنے ساتھ اپنی بحری گھاس لے جاتا ہے،" اس کے ساتھ ہی مجھے یہ فقرہ بھی یاد ہے جو ویسٹ بروک پیگلر (West Brook Pegler.) نے ہیمنگوے کا سرِ راہ ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ہمارے پوستین پوش مصنفین میں ارنسٹ سب سے زیادہ لائق ہے۔"

اس طرب انگیز فضا میں کمیونسٹ اہلِ قلم نے ایک مضحکہ خیز لغو باب کا اضافہ کردیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے افراد نے ہیمنگوے کے اسپین کے سفر سے بڑی خوش آئند توقعات قائم کرلی تھیں۔ (اگرچہ بالآخر ان کو بڑی مایوسی ہوئی) اور ہیں چونکہ اسٹالن کی جانب سے بین الاقوامی مذمت حاصل کرچکا تھا اس لئے کہ اس نے

مجھے "قلمی ڈاکو"، کا خطاب دیا تھا جس کی وجہ سے کمیونسٹوں کے نزدیک ان کا نمبر اول کا دشمن تھا۔ "نیو ماسیز" اخبار نے میرے منہ پر کتاب پھینک کر مارنے کے واقعہ کو ایک "سیاسی چال" قرار دینا پسند کیا تھا۔ اسی زمانہ میں جب میلکم کاؤلی (Malcolm Cowley.) نے "نیو ریپبلک میں چھپنے کے لئے ایک مضمون بھیجا جو ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا۔ بحیثیت انشا پرداز کے ہیمنگوے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعات، حقیقت اور دراصل واقع ہونے والے اُمور کا پوری دیانتداری سے خیال رکھتا ہے" تو مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ بھی جماعت بندی کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔

جب میں نے اس مضمون کو پڑھا تو میں نے چاہا کہ "بحیثیت انشا پرداز" کے الفاظ پر خط کھینچ دوں، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کاؤلی غلطی پر تھا۔ مجھے ایسا اندازہ ہوا کہ ان فقروں سے وہ اسی چیز کی نشان دہی کرنا چاہتا تھا جن کو میں اپنے ابتدائی جذبۂ تحسین کے زیر اثر "صاف بیانی" یا "حقیقت پر مبنی گفتگو" کہا کرتا تھا یہاں تک کہ ایک اور جدید نقاد نے جب ہیمنگوے کی "ٹھوس ایمانداری اور شخصی دیانت" کا ذکر کیا تب بھی میں نے اس کی رائے سے کلیتاً اختلاف نہیں کیا۔ ایک شے ہوتی ہے ادیب یا شاعر کی اپنی راست گوئی اور تخیل سے سچی وابستگی اور دوسری چیز ہے کسی معزز ہستی کا صداقت اور حقیقت پسندی سے شغف ایسے حالات میں جبکہ دوسرے شخص کی خودداری کا سوال ہو، ان دونوں چیزوں میں کافی اختلاف ہے۔ ان ہر دو صفات کے لئے ضبط و نظم، قوتِ فیصلہ، تہذیب نفس اور یکسو اور ناقابل فراموش قوتِ ارادی کی ضرورت ہوتی ہے اور ان میں سے کم از کم

ایک صفت میں ہیمنگوے نے پورا کمال حاصل کر لیا تھا۔

یہ مسئلہ پھر مجھے اپنے ابتدائی مقصد پر لے آتا ہے یعنی یہ دریافت کرنے کی کوشش کہ ہیمنگوے کی ذات میں کیا چیز بزرگی اور عظمت کی حامل ہے۔ میرے خیال میں اس کی عظمت کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ اس نے نہ صرف جرٹروڈ اسٹین (Gertrudo Stein.) کے طفلانہ طرز انشا پردازی سے نجات حاصل کر لی بلکہ فاتحانہ انداز میں اس سے آگے بڑھ گیا جبکہ اسٹین کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے اور وہ خود بھی اس بات پر فخر کرتی ہے کہ اس نے ہیمنگوے کے اسلوب کو صحیح نہج پر ڈالا تھا، اسٹین کا یہ طرز اگرچہ بنیادی طور پر ضرر رساں تھا لیکن ہیمنگوے پر اس کا نہایت لطیف اثر پڑا تھا جب میں نے ہیمنگوے کے متعلق یہ تحریر کیا تھا کہ "وہ ایک پورا قد آور آدمی ہے جو شعر و ادب کی کلہاڑی گھماتا رہتا ہے تو اس رائے کا محرک بھی یہی خیال تھا میرے خیال میں اس وقت والٹ وہٹ مین (Whitman Man) کی نظم "چوڑی کلہاڑی کا نغمہ" تھی، میرے ذہن میں اس وقت والٹ وہٹ مین تھا جس کی نظم "یہ کوئی کتاب نہیں ہے، جو اس کو چھوتا ہے وہ انسان کو چھوتا ہے"۔ میں ابتدائی امریکہ کی نہ صرف جاگیردارانہ نظام اور امیرانہ روایات بلکہ ان تمام بھولی ہوئی نفاست پرستیوں کی مخالفت کا خلاصہ درج ہے جو علمی و ادبی زندگی کو دنیا کی عام زندگی سے جدا کرتی ہیں، اور مجھے مارک ٹوین .Mark Twain کا بھی خیال آتا تھا جو ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد کتابوں کا مصنف بننے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ "اولڈ ماسیز" اور "لبریٹر" کی اشاعت کے زمانہ میں میں نے

اس چیز کو یا اور ان بہت سی چیزوں میں سے اس کو ظاہر کرنے کے لئے ایک لفظ
"ادب زدہ" ( Literarious ) ایجاد کیا تھا جن کے خلاف مائینز کے پڑھنے والے
فنکار اور ادیب دونوں طبقوں کے لوگ، بغاوت پر کمربستہ تھے۔ اب جب میں انکا
خیال کرتا ہوں تو یہ دونوں رسالے گرین وچ ویلیج ( Green Wich Village
اور فحاشی کے جو اس لفظ کا مفہوم ہے مترادف معلوم ہوتے ہیں۔ درحقیقت "گرین
وچ ویلیج" کا مسلک ایک ایسی چیز تھی جس کے ہم سب مخالف تھے، اور اگرچہ
ہیمنگوے کے ابتدائی مضامین ہمارے ادارتی دفتر کے کسی کونہ میں پڑے
پڑے کھو گئے ہیں لیکن میرے خیال میں اس کا اسلوبِ نگارش اس مقصد کیلئے
زیادہ موزوں ہے۔ جس کے متعلق وہاں کوشش کی جاتی تھی بمقابلہ اس پیچیدہ
بے معنی طرز کے جس کے ذریعہ جرٹروڈ اسٹین اور اس کے احباب کو یہ فخر کرنے کا
موقع ملا کہ وہ بیسویں صدی کی ادبی ثقافت کے صفِ اوّل کے بہادر
جنگ جو ہیں۔

میں اس سے انکار کرنا نہیں چاہتا جسے خود انسٹ نے تسلیم کیا ہے
کہ اسٹین نے جو اُستادانہ تنقید اس کے مسودوں پر کی وہ اس کے لئے بڑی
قدر و قیمت رکھتی تھی۔ اس کو یہ قدرت تو حاصل تھی کہ کسی عمل یا کسی شخص کی ماہیت
کو بہت ہی لطیف استعارے کے ذریعے آشکارا کردے۔ اس کی اس خصوصیت
کی مثالیں اس کی تصنیف "تین زندگیاں" ( Three Lives ) میں پائی جاتی
ہیں اگرچہ اس کی نثر معمولی حیثیت کی ہے۔ اس کی دوسری تصنیف "دی میکنگ
آف امریکنز" ( The Making of Americans ) میں بھی جو اس کی

پہلی کتاب سے بھی زیادہ غیر دلچسپ ہے لیکن جس کے متعلق وہ پُر اثر شرمیلے پن کے ساتھ یہ کہتی تھی کہ "یہ یادگار تصنیف حقیقتاً جدید طرزِ تحریر کی بنیاد ڈالنے والی ہے" اس خصوصیت کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس بات سے کہ کبھی کبھی وہ بہت شگفتہ جملے ایجاد کرسکتی تھی۔ ہیمنگوے کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کے جملے ایجاد کرنے کے طریقہ سے واقف تھی، یہ چیز انشا پردازی کے بہت سے استادوں کی قابلیت سے بلند تر ہے۔ علاوہ بریں اس زمانہ میں ارنسٹ تجارتی صحافت کو جو فنِ تحریر کا وہ طریقہ ہے جس سے ہم ہر ایک شخص کو کچھ نہ کچھ خوش کرسکیں اور کسی ایک شخص کو بھی شکایت کا موقع نہ دیں۔ چھوڑ کر فنِ ادب کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا۔ یعنی شاعر کا وہ لا ابالی اندازِ بیان اپنا رہا تھا جس میں وہ صرف وہی لکھتا ہے جسے وہ خود پسند کرے۔ چونکہ اسٹین کو نہ تو اپنے قارئین کی پسندیدگی کا کچھ خیال تھا نہ اس کو اظہار وبیان کے اسالیب کی کچھ پروا تھی، اس لئے ایسے ادبی موڑ پر ہیمنگوے کا اس کے طرزِ نگارش سے مرعوب ہوجانا ایک فطری امر تھا۔ لیکن اگر آپ ان دونوں کا مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ہیمنگوے، جوٹروڈ کی اصلاح یا اصلاح کی ناکام کوشش کر رہا تھا نہ کہ جرٹروڈ، ہیمنگوے کی اصلاح کر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مختصر جملے، لفظ 'اور' کی غیر مختتم بھرمار، خودستائی کی تکرار جو میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold.) کی نقالی ہے اور جس کو جرٹروڈ حماقت کی حد تک یا یوں کہنا چاہیئے کہ دیوانگی کی حد تک لے جاتی ہے کیونکہ اکثر یہ اپنی توصیف میں قصیدہ خوانی معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام بچوں کی سی حرکات کو ہیمنگوے نے

اپنی چابک دستی سے تیز، سخت اور زوردار حقیقت پسندی میں تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے اس کی تصنیف "ہمارے عصر میں" ایک عجیب انداز کی بیدار کرنے والی کتاب بن گئی۔

جس وقت میں پیرس میں تھا اس وقت ارنیسٹ شاید اپنی کتاب "سورج بھی طلوع ہوتا ہے" ( The Sun Also Rises.. ) لکھنے میں مشغول تھا کیونکہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب "ہمارے عصر میں" کے بعد چھپنے والی کتاب کی حیثیت سے میری توقعات پر پوری نہیں اترتی۔ ایک بے رنگ، غیر مسلسل عبارت جس میں صرف "اور۔ اور" کی تکرار سے کچھ تسلسل پیدا ہوتا ہے اس قسم کا اسلوب مختصر افسانہ کے اندر صحیح صحیح واقعات بیان کرنے میں تو بہت موثر ثابت ہوتا ہے لیکن ایک طویل ناول میں کسی منظر کی تصویر کشی یا کسی شخص یا کسی تصور کی وضاحت کرنے میں لطف ہو جاتا ہے۔ اس وسیع تر پارچۂ تصویر ( Canvas. ) پر ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہیمنگوے اپنے اسلوب کو نمایاں کرنے کی غرض سے زبان کی خوبیوں کا خون کر رہا ہے۔ نتیجتہً یہ چیز ایک بار آور اختراع کے بجائے ترقیِ معکوس معلوم ہونے لگی اور ایسا لگتا تھا گویا پختہ اور ترقی یافتہ موضوع کو بچوں کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے۔ میری رائے اب بھی یہی ہے کہ ہیمنگوے کے مختصر افسانے اور اس کے ناولوں کے افسانوی اجزا اس کی نمایاں کامیابی کے شاہد ہیں۔ مختصر افسانوں کے اسلوب نے اس کے ذریعہ سے ایک نیا کمال حاصل کر لیا ہے، لیکن اپنی تمام تصنیفات میں اس نے رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اس چیز سے آزاد کر لیا ہے جس کا اسے پُرزور اور حقیقت پسند نظر آنے کی

خاطر اس پُر فریب طریقہ پر چلنے کا مقیّد ہونا پڑتا تھا۔ جب اس نے اپنا ناول "سہ پہر کو موت" لکھنا شروع کیا تو حقیقت پسندی کے لئے اس کی ضرورت نہ رہی تھی کہ وہ اپنے ترقی یافتہ ذخیرہ الفاظ اور بلندی تخیل سے کام نہ لے۔

مختصراً جب اس کی یادگار زمانہ معلّمہ جرٹروڈ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ارنسٹ حب الوطنی کی جانب مائل تھا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک رجحان "نوے فی صدی محب خلائق" ہونے کا رکھتا تھا تو آہستہ آہستہ اسے تبدیل کرنے کا عمل شروع ہو گیا ہوگا اور جب حسب معمول انکسار کے ساتھ ایک مرتبہ اور جرٹروڈ نے تسلیم کیا کہ اس نے اور شیر وڈ اینڈرسن (Sherwood Anderson) نے ہیمنگوے کی تشکیل کی ہے اور اس کام پر اتنا زیادہ وقت صرف کرنے کی معذرت بھی ان الفاظ میں کی کہ "یہ کیسی خوش آیند بات ہے کہ کسی کو ایسا شاگرد مل جائے جو سوچے سمجھے بغیر ہی اپنا کام کر لے"۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ مطلوبہ تبدیلی مکمل ہو گئی ہو گی۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ جرٹروڈ کے یہ الوداعی بیساختہ جملے اس تیزروی کی غمازی کرتے ہیں جس کے ساتھ ہیمنگوے اپنی بلند ترین منزلِ مقصود کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

وہ ماہرین خصوصی کے کسی چھوٹے بوہیمی (لاابالی) حلقہ سے تعلق نہیں رکھتا جو اپنے آپ کو بحیثیت "پیش رو" کے سراہتے ہیں۔ اسے اس کی بھی فکر نہیں ہے کہ وہ اپنے تمام ہم چشموں کو جدّت پسندی کی دَوڑ میں شکست دیدے اور اس طرح سب کو چھوڑ کر اپنے زمانہ سے آگے بڑھ جائے۔ وہ ہر زمانے میں زندہ ہے اور اس کی آب و تاب ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وہ دنیا میں گھر سے باہر

نکل کر زندگی بسر کرتا ہے اور ایسی ثقافت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے جو عشرت کدوں سے تعلق رکھتی ہو۔ وہ نیویارک کو پسند نہیں کرتا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو یہاں ایک سربرآوردہ ادیب کی حیثیت سے اس کی تحسین کے راگ گائے جاتے۔ وہ ان لوگوں کے ذوقِ حیات کا طالب ہے جو ادب یا فن کے متعلق خوش گپیوں کے علاوہ حقیقتاً کچھ کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی سب سے پہلی تصنیف "لطف شعر" کے ابتدائی صفحات میں ایسکیلیس (Aeschylus) کی تعریف جن الفاظ میں کی ہے ان کو دُہراؤں تو اندازہ ہو جائے گا کہ میں کن خوبیوں کی وجہ سے ارنیسٹ کو سراہتا ہوں۔

"جب اس شعر نواز ہیرو نے ایرانیوں کے حملوں سے اپنے ملک کو بچانے کے لئے جنگ میں شرکت کی اور سیلمس[1] (Salamis.) و میراتھن[2] (Marathon.) کے محاربوں میں بھی حصہ لیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا قدرت نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ وہاں تجربہ اپنے منتہائے کمال پر تھا لیکن مقصد اٹل تھا۔ اس قدر دانیٔ فنون کے عہد میں کتب خانوں اور چوک کے چھوٹے شعرا اور ان کے قدر دانوں کو اس عظیم الشان یونانی کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس کی موت اس عہد کے مشہور ترین صاحبِ کمال کی موت تھی لیکن اس نے اپنی شاندار قبر پر صرف یہ فخریہ الفاظ لکھوائے تھے کہ "اس کی اعلیٰ سپہ گری کی شہادت میراتھن کا جنگل دے سکتا ہے اور لمبے بالوں والا میڈ جس کو اس سے سابقہ پڑا۔"

ہیمنگوے کی ذات، اس کے کردار اور اس کی ہمّت و سخت کوشش کے اصولوں میں کچھ کچھ ایسکیلس[3] کی جھلک پائی جاتی ہے۔ پرومیتھس

[1] دیکھو نوٹ مترجم صفحہ ۴۶۱ [2] دیکھو نوٹ مترجم صفحہ ۴۶۱ [3] دیکھو نوٹ ۴۶۱

( Prometheus ) کی جھلک بھی نظر آتی ہے، کچھ ہومر کا رنگ بھی نظر آتا ہے اور ہومر کے کلام کے مترجم جارج چیمپین کا بھی جس نے یہ اشعار لکھے تھے:

مجھے کوئی ایسی روح عطا کیجئے جو زندگی کے متلاطم سمندر میں اپنے بادبانوں کو باد تند سے پُر کرنا چاہے یہاں تک کہ اس کے بادبان لرزنے لگیں اور مستول چٹک جائیں۔

اور اس کا سرمست جہاز ایک طرف کو اتنا جھک جائے

کہ وہ پانی پینے لگے اور اس کی پیندی ہوا کو چھونے لگے

ایسے شخص کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے جو یہ جانتا ہے

کہ موت اور زیست کی کیا حقیقت ہے۔ پھر ایسا کوئی قانون نہیں ہوتا جو اس کے علم میں نہ ہو۔

اس کے مختصر افسانوں سے قطع نظر کر کے میرے نزدیک ہیمنگوے کی ذات میں بحیثیت انسان اور انشا پرداز کے یہ قابلِ تعریف چیز موجود ہے۔ ان اوصاف میں فلپ ینگ ( Philip Young ) ایک اور صفت "ناقابلِ شکست قوتِ ارادی" کا اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ "ہیمنگوے خوف و ہراس کے دامن سے جس نے ایک وقت اس کو معذور کر دیا تھا اپنے آپ کو چھڑا کر اور ہمت سے کام لے کر ایسے بلند مقام پر فائز ہو گیا کہ دوسری جنگِ عظیم کے آزمودہ کار اور پیشہ ور جنگجوؤں کو اس کے متعلق یہ کہنا پڑا کہ "ہم نے جن آدمیوں کو دیکھا ہے ہیمنگوے ان میں سب سے زیادہ بہادر ہے"۔ یہ بات البتہ قابلِ مذمت ہے کہ یہ اعلےٰ صفات

اس کے دماغ میں مبالغہ آمیز قوتِ مردانگی کے ساتھ مخلوط ہو گئیں اور اس کو مجادلہ آرائی کے لئے آمادہ کر دیا۔ اس کے خیال میں بہادر ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ مُکّے باز بھی ہو، اور اس کے ذہن میں یہ خیال اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ حقیقتاً اس کی وجہ سے اس کے سینہ پر بالوں کی افزائش شروع ہو گئی۔ میرا یہ خیال اس کی نوجوانی کے زمانہ کی ایک تصویر کو دیکھ کر پیدا ہوا جس میں اس کو مارکوئی ساز کیز ( Marquesas. Keys. ) میں سمندر کے کنارے برہنہ حالت میں کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویر ہم دونوں کے ایک زندہ دل نوجوان دوست نے مجھے بھیجی تھی، اس کے ساتھ اس نے چند اشعار بھی بھیجے تھے جن کو میں یہاں لکھنا نہیں چاہتا، یہ اس وقت ہوا تھا جب ہماری "عمروں کی جنگ" کے بعد خط و کتابت کی جنگ ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی تصدیق کر دی ہے کہ پرکنس کے دفتر میں ہیمنگوے کے سینہ کے بال میرے بالوں سے زیادہ تھے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب اس نے اپنی ایک کتاب کا جو اس واقعہ کے بعد چھپی تھی اشتہار دیا تو اس کے ساتھ اس نے اپنی تصویر اس طرح شائع کرائی کہ وہ بغیر آستینوں کے ٹائپ رائٹر پر کام کر رہا ہے اور اس کے بازو بالوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اتنے طاقت ور نظر آتے ہیں کہ میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، لیکن ایک چیز جو اس ابتدائی زمانہ کی تصویر سے ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ اس زمانہ میں ارنیسٹ کے بازو بالوں سے بھرے ہوئے نہیں تھے اور وہ ایک بالدار بندر کی بہ نسبت اپالو ( Apollo. ) کے مجسمہ سے زیادہ ملتا جلتا نظر آتا تھا۔ وہ پورا جوانمرد تھا، اس کے بدن کی ساخت

بہت اچھی تھی اور وہ ابتدائی اور ثانوی جنسی خصوصیات سے پوری طرح بہرہ یاب تھا، لیکن آگے چل کر اس میں جو تبدیلیاں ہوئیں اگر ان کا اس کی اس وقت کی حالت سے موازنہ کیا جائے تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ آگے چل کر وہ ایک سمور دار مصنف بن جائے گا۔

تھیوڈور روز ویلٹ (Theodore Roosevelt.) کا ایک اصول تھا، جس کی رو سے وہ بھی ہمت اور جرأت پر اتنا ہی زور دیتا تھا جتنا کہ ہیمنگوے دیتا ہے۔ یہ دونوں امریکی نمایاں طور پر ایک دوسرے سے مشابہ تھے۔ بیلوں کی لڑائی کے بجائے سرکش گھوڑوں کی سواری کو اور جنگِ اسپین و امریکہ کے بجائے دوسری جنگِ عظیم کو اور بالائی امیزن کے جنگلوں کے بجائے افریقہ کی گرین پہاڑیوں کو لے لیجئے تو ہر دو ایک ہی نمونہ پیش کریں گے۔ دونوں سخت کوشی کے قائل تھے اور دونوں کا یہ خیال تھا کہ خوب دوڑ بھاگ کرنے اور جنگلی جانوروں کا شکار کرنے میں وہ اس طرح کی زندگی کا لطف اٹھا رہے تھے لیکن روز ویلٹ کا ضابطۂ حیات تنگ نہیں تھا اس میں مختلف شریفانہ اوصاف شامل تھے۔ وہ بھی ہیمنگوے کی طرح "نازک اندام" نہیں بننا چاہتا تھا۔ لیکن وہ صرف اسی کو انسانی فریضہ نہیں سمجھتا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہیمنگوے جیسا کثیر معلّم اخلاق صرف اس ایک ہی خوبی پر اتنی توجہ مرکوز کرنے پر کیسے قانع ہو گیا۔ لیکن اگر اس نے اپنے اور مذکورہ بالا لائبریری اور چوک کے چھوٹے شاعروں کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کرنے کے لئے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا تو مجھے اس کا زیادہ افسوس نہیں ہے۔ ایک عظیم الجثہ جانور کے کھوج کی طرح اس نے

اپنے عہد کے ادب کی خس و خاشاک چھانٹ کر صاف راستہ بنایا تھا۔ شاید یہ راستہ اس کو پھر جنگل ہی کی طرف لے گیا، لیکن اس کی اس کوشش سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم اب یہ اندازہ کرنے لگے کہ جس چیز کو ہم اس قدر "جدید" اور یادگارِ زمانہ" سمجھتے ہیں۔ اس کا کتنا حصہ ناپائیداری اور حماقت پر مشتمل ہے۔

ہماری آخری ملاقات دوستی کی فضا میں ہوئی اور میں اس کو یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۴۶ء میں میں اور ایلینا ہوانا (Havanna.) میں بار فلوریڈا کے قریب گھوم رہے تھے۔ ہم سنجیدہ دُبلے پتلے اور نازک ہاتھوں والے ڈائیکورس (Daicuiris) بنانے والے کو دیکھ رہے تھے جو وہ اپنے گاہکوں کے لیئے تیار کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس طرح چل رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہ وائلن بجا رہا ہے۔ بار کے پیچھے کے آئینہ پر میری نظر پڑی تو میں نے دیکھا کہ مجھ سے چار فٹ کے فاصلہ پر ایک موٹا تازہ خشونت آمیز چہرہ کا آدمی کھڑا ہوا ہے جو بڑا سا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سیاہ تھیں اور بال بھورے سیاہ رنگ کے تھے، یہ صورت کچھ جانی پہچانی سی تھی۔۔۔ بے شک۔۔۔ یہ ہونا چاہیئے لیکن اس قدر غور سے گھورنے والا، اُداس، وحشیانہ اور چمک دمک سے عاری۔۔۔۔۔ ارنسٹ ہیمنگوے۔ ارنسٹ ہیمنگوے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ میرا دل کچھ دھڑکنے لگا لیکن میں نے فوراً اس کے اور اس کے عقب میں کھلے ہوئے دروازہ کے درمیان جو فاصلہ تھا اس کا اندازہ کر لیا۔ وہ ایسی حالت میں تھا کہ اگر کوشش کی جاتی تو اس کو دروازہ میں سے باہر سڑک پر جو اس کے پیچھے تھی پھینکا جا سکتا تھا۔ یہ اندازہ ہو جانے پر مجھ پر وہ سراسیمگی طاری نہیں ہوئی جس سے ایک مرتبہ پہلے جب اس نے

دیکھو نوٹ صفحہ

میری تذلیل کی تھی مجھ کو تکلیف پہونچی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر بڑے سکون کے ساتھ کہا: "ہیلو، ارنیسٹ!"

اس نے مجھے گھورا اور میں اس کو اس طرح دیکھتا رہا جس طرح کوئی ریڈیو کی طرف منتظرانہ انداز سے دیکھتا ہو کہ اب یہ گرم ہو کر کچھ بولنے والا ہے۔ آخر اس نے کہا۔ "ہیلو میکس"، اور ہم نے مصافحہ کیا۔

"تم ایلینا سے واقف ہو گئے"، یہ کہکر میں پیچھے ہٹا تاکہ وہ ہمارے درمیان آجائے۔ اس نے ایلینا کو اور بھی زیادہ گرم جوشی سے خوش آمدید کہا اور جب ایلینا نے یہ الفاظ کہے تو مسکرانے لگا "کیا تم واقعی ارنیسٹ ہو؟ میں بار بار تمھیں دیکھتی رہی۔ لیکن یقین نہ کرسکی کہ تم ہی ہو"۔

اس نے پوچھا "مجھ میں ایسی کیا تبدیلی ہو گئی ہے؟"

ایلینا نے جواب دیا "تمھاری آنکھیں نیلی تھیں!"

بعد میں ایلینا نے مجھ سے کہا کہ یہ اس ساری تبدیلی کا خلاصہ ہے جو اس میں واقع ہوئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اس قدر بھینگی، سیاہ اور سخت شیشے کی مانند ہو گئی تھیں کہ وہ بہت مضحکہ انگیز نظر آرہی تھیں اور ہم اس پر خوب ہنستے رہے۔

وہ بولا: "کچھ پی لیجئے"۔

ہم وہیں کھڑے کھڑے تھوڑی دیر تک کاک ٹیل شراب کے گھونٹ پیتے رہے اور اپنے باہمی احباب کا ذکر کرتے رہے، کیوبا کے حسن پر گفتگو ہوئی، اس نے اپنے فرانس جانے اور راس سینڈر کے لڑکے سے ٹکرانے اور خود اپنے لڑکے کا ذکر

کیا جو اس وقت سپاہی تھا۔ ایک شخص کیمرہ لیئے ہوئے آگیا اور اس سے ہم کلام ہوا پھر واپس چلا گیا۔ ارنیسٹ نے اپنا بڑا چشمہ اُتار لیا اور مسکرا کر کہنے لگا: "اب میں پہلے کی طرح معلوم ہوتا ہوں؟"

ہم نے والڈو پیرس، ڈوس پاسوس، ہیڈلے، بل اسمتھ، جیرالڈ مرفی کا ذکر لیا۔ ارنیسٹ کا خیال تھا کہ وہ سب انتہا درجے کے نفاست پسند تھے۔ وہ خود بھی انتہائی نفاست پسند معلوم ہوتا تھا، اگرچہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک غیر مشاہدانہ انداز میں ہم سے ہٹ کر کسی چیز پر نظر ڈالتا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ میری ضرورت سے زیادہ متجسّسانہ نگاہوں سے ایک قسم کی اندرونی خلش محسوس کر رہا تھا۔

"میں پھر آپ لوگوں سے ملوں گا" یہ کہتے ہوئے وہ رخصت ہوگیا۔

# ایڈنا ملے[1] سے میری دوستی

ایڈمنڈ ولسن ( Edmund Wilson. ) اپنی کتاب "سواحلِ نور" ( Shores of Light. ) میں فرحت انگیز صاف بیانی سے لکھتا ہے کہ جوانی کے دَور میں کس طرح وہ اور اس کا جگری دوست "جان پیل بشپ" ایک ہی وقت میں ایڈنا ملے ( Edna Millay. ) کے دام محبت میں بُری طرح گرفتار ہوئے تھے اس کا کہنا ہے کہ ہر شخص کو اس تجربہ سے دو چار ہونا پڑتا تھا یعنی "اس زمانہ میں ایڈنا ملے سے نظریں چار ہونے کا ناگزیر نتیجہ یہی ہوا کرتا تھا۔" میں بھی اس کی طرح صاف بیانی سے کام لوں تو مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ میں نے ایک وقت ایڈنا ملے سے محبت پیدا کرنے کی کوشش کی یہ سمجھ کر کہ یہ رومان میری قسمت کا نوشتہ ہے

---

[1] دیکھو نوٹ مترجم صفحہ

لیکن مجھے اس میں افسوسناک ناکامی ہوئی۔ اس کے بہت عرصہ بعد گو ہم دونوں نہ صرف ایک دوسرے کے قریب بلکہ دلی دوست ہو گئے۔ لیکن ولسن کے الفاظ میں عوام کو مدہوش کرنے والے اثرات جن کی فضا میں رہ کر وہ نغمہ سرائی کرتی رہتی کبھی میرے تجربہ میں نہ آئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکثر وہ لوگوں کو اپنے اثر سے شدید جذبات اور خود شعوری میں اس طرح مبتلا کر دیتی تھی کہ زندگی جو بالکل فطری انداز پر رواں ہوتی تھی اس کی موجودگی کی وجہ سے ایک ڈرامائی انداز اختیار کر لیتی تھی۔

وہ اپنی بہن نورما (Norma) کی طرح ہیجان انگیز حسن کی مالک نہ تھی۔ اس کی ٹانگیں اور بعض اوقات اس کا چہرہ ایک کنواری عمر رسیدہ عورت کا سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں نہایت غیر معمولی تازگی لئے ہوئے بھوری اور سبزی مائل تھیں اور ان کے گرداگرد مسحور کن بل پڑے ہوئے تھے۔ اس کے جسم کا درمیانی حصہ سڈول تھا اور اس کی آواز وائلن کی طرح ہیجان انگیز تھی۔ وہ جب پورے جوش میں ہوتی تھی واقعی ایک حسین دیوی معلوم ہوتی تھی جیسا کہ ولسن نے بھی لکھا ہے، لیکن کم از کم مجھے تو وہ اس حالت میں اور بھی زیادہ بیگانگی اور بُعد کا اندازہ لیئے ہوئے نظر آتی تھی۔ کسی مرد کی شریکِ حیات ہونے یا کسی بچہ کی ماں بننے کے بجائے وہ ایک شاعرہ بننے کا پختہ عزم کر چکی تھی اور یہ اس صورت میں نہایت ضروری ہے جب کوئی عورت تخلیقی ادب میں مردوں کی مدِ مقابل بننا چاہے۔ غالباً اسی وجہ سے سادہ دل لوگ اس کے سامنے منفعل اور مجبور سے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے اس عزمِ راسخ میں کردار کی مضبوطی کا احساس

ہوتا تھا اور یہ چیز ہمیشہ کچھ نہ کچھ مرعوب کن ہوتی ہے۔

میں پہلی مرتبہ گرین وچ (Greenwich.) قصبہ میں ایک مختصر سی دعوت کے موقع پر ایڈنا ملے سے روشناس ہوا۔ اس نے اور اس کی بہن رما نے عوامی قسم کے ایک رقص و سرود کا مظاہرہ کیا جو وہ "مین" Main. میں واقع ایک گاؤں سے جہاں ان کی پیدائش اور پرورش ہوئی تھی سیکھ کر نیویارک آئی تھیں انھوں نے بہت چابک دستی سے اداکاری کی، ان میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور ان کا ذوقِ موسیقی بالکل صحیح تھا۔ لیکن میں اس سے خوش نہیں ہوا۔ مجھے تو وہ اسکول کی معمولی لڑکیاں معلوم ہوئیں جن میں تصنع اور خود نمائی پائی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ تک میں ایڈنا اور اس کی تحریرات سے بدظن رہا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز "فلائڈ ڈیل" (Filoyd Dell.) اس کے شاعرانہ کلام کے کچھ اجزا شائع کرانے کے لئے "لبریٹر" کے دفتر میں آیا تو میں نے اس سے کہا "ہم اس کے کلام کے اجزا کیوں شائع کریں؟ وہ ہمیں ایک پوری نظم کیوں نہیں بھیجتی؟"

اس نے کہا "ممکن ہے یہ میری جنبہ داری پر محمول کیا جائے لیکن اگر میں "سوین برن" (Swinbuurn.) کے غیر مطبوعہ کلام کے کچھ اجزا آپ کو لا کر دیتا تو میرے احساسات اس وقت وہی ہوتے جو اس وقت ہیں"۔ اس نے سوین برن ہی کا نام کیوں لیا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ بات صحیح ہے کہ فلائڈ پر جنبہ داری کا بھوت سوار تھا چنانچہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں ایڈنا سے اس کی محبت دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔

بہر حال میں ان اجزا کے متعلق اپنی رائے پر قائم رہا، البتہ اب مجھے
ان کو اپنے رسالہ میں شائع نہ کرنے کا افسوس ہے۔ میں خود بھی شاید اس سے
بہت بدظن تھا کیونکہ ۱۹۱۲ء میں جب مچل کینرلی" - ( Mitchell.
( Kennerley نے میرے اشعار کا پہلا مختصر سا مجموعہ "امیزنوں کا بچہ"
(Child of the Amazons) شائع کیا تو اتفاقاً اس کے ساتھ اس نے
ایڈنا کی مشہور طالب علمانہ نظم "نشاۃ ثانیہ" ( Renaissance.) بھی شائع کی۔
اس نظم کا اشتیاق لوگوں میں اتنا زیادہ تھا کہ اس کے باعث نہ اس نے اور نہ
کسی اور شخص نے میری کتاب پر ذرا بھی توجہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مطبع سے نکلتے ہی
میری کتاب گویا قانون کشش کے تحت سیدھی ردّی کی ٹوکری میں پہونچ گئی۔ میں
نہیں سمجھتا کہ اس وجہ سے میں ایڈنا کی شاعری سے بدظن ہو گیا، یہ بات محض ایک
امر واقعہ کے طور پر میرے ذہن میں محفوظ ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہر سوانح نگار جو
صحیح طور پر علم نفسیات سے واقف ہو گا یہی رائے قائم کرے گا۔ بہر حال یہ واقعہ
ہے کہ میں نے اس کی شاعری کے ابتدائی دور کی جس کو گرین وچ ویلج کا عہد
فحاشی ( Greenwich Village. Gemine. ) کہہ سکتے ہیں ایک نظم
بھی نہیں پڑھی جب تک وہ اس عہد کی خصوصیات سے آگے نہ بڑھ گئی۔ اس کی
ایک دیوانہ وار مدّاح الیزبتھ اٹکنس ( Elizabeth Atkins, S ) نے مجھ پر یہ الزام
لگایا ہے کہ میں نے اس کی ایک نظم بعنوان "مجھ تم سے محبّت کرنی چاہیے تھی"
( I think I should have loved you. ) کی نقل کی ہے، لیکن تادم تحریر
میں نے اس کی یہ نظم نہیں پڑھی اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ میری کون سی نظم کے متعلق

اس کا یہ گمان ہے کہ وہ ایڈنا کی نظم کا چربہ ہے۔

چونکہ میں ابتدا میں "ملے" کے ذاتی اور ادبی مسلک سے بالکل غیر متعلق رہا ہوں غالباً اس لیئے میں بعد کے بعض نکتہ چینوں کے مقابلہ میں اس کے بارے میں زیادہ احتیاط اور غیر جانب داری کے ساتھ لب کشائی کرسکتا ہوں۔ ونفیلڈ ٹاونلے اسکاٹ (Winfield Townley Scott.) نے اپنے رسالے "سیٹرڈے ریویو" (Saturday Review) میں اس کے مجموعہ نظم سے بحث کرتے ہوئے اس بات کا اقرار کیاہے کہ وہ اب ان نظموں کا قائل نہیں رہا۔ جن کو وہ کسی زمانہ میں رات کے وقت گلیوں میں گنگنا تا پھرتا تھا، اور جان کیارڈی (John Ciardi) نے اپنے ایک مضمون میں جو اس نے ایڈنا کی موت پر اسی رسالہ میں شائع کرایا لکھا تھا کہ عہد جوانی میں جن اشعار سے ہم متاثر ہوتے تھے، جو ہمارے دماغ پر چھا جاتے تھے اور ہم کو مست کردیتے تھے۔ اب ان کی اتنی بھی قدر نہیں ہے جتنی کہ سب سے پہلے سگریٹ کی۔" اب تو ان نظموں پر تنقید کرنے کی خواہش سے زیادہ ان سے ایسی الفت ہونے لگتی ہے جیسی زمانۂ رفتہ کی یاد سے۔ کم از کم ان لوگوں کا تو یہی خیال ہے جو اس وقت شباب کی لذتوں میں سرمست تھے لیکن جن کا نشۂ جوانی اب اتر چکا ہے، یہ لوگ جب ان مختصر سیاہ رنگ کی کتابوں کو جن کی جلدوں پر کتابوں کے نام لکھے ہوتے تھے پڑھنے کے لیئے کھولتے تھے تو ان کو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ ان کے بال ہوا کے ایک سناٹے سے کھڑے ہو رہے ہیں اور اس ہوا کے ساتھ ایک حسین دوشیزہ ان کی طرف لپکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی یہ جان کرو رینسم .John Crow Ransam

گو اپنے عہد شباب کی یاد میں اتنا مسحور نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کو بھی اپنی جوانی پر ناز ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے "صاحبِ دماغ" اور "مرد" ہونے کا ذکر اس قدر تکرار کے ساتھ کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے چہرہ پر سُرخی دَوڑ جاتی ہے۔

میں جب ایڈنا کی سیرت اور اس کے کلام سے بحث کرتا ہوں تو اس قسم کے توہمات سے خالی الذہن ہوتا ہوں، یہ امر کہ وہ بیس سال سے کم عمر تک بلا رُکے بے دریاں تھی میرے دماغ پر چھایا ہوا نہ تھا جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ یہ امر کہ جب وہ پڑھتی تھی تو اسے فاتحانہ کامیابی حاصل ہوتی تھی مجھ پر اثر انداز نہ تھا۔ کیونکہ اسکے پڑھنے کے انداز کو میں پورے طور پر پسند نہ کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ گیارڈی کے قول کے خلاف اس کے پڑھنے کی خوبی نیچے گھسٹنے والے گاؤنوں اور لمبے چوڑے اشاروں پر موقوف نہ تھی کیونکہ اشارے وہاں تھے ہی نہیں اور اس کے گون سیدھے سادے ہوتے تھے جو فرش پر لٹک جاتے تھے اور اتنے لمبے نہ تھے کہ گھسٹتے۔ اس کی نظمیں مرلی ضرور ہیں لیکن وہ اس قدر آہستہ پڑھتی تھی کہ اس کا ترنم بھی مجھے متاثر نہیں کر سکتا تھا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ مُرد ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورت کی حیثیت کو گھٹا دیا جائے۔ اب رہا "ذہنی دلچسپیوں کا فقدان" جو بقول تسیم اس کی خامیوں کا خلاصہ ہے۔ "اس کا کلام پڑھنے والے مردوں کو اس چیز کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے"۔ یہ خامی اس کی فطرت میں تو یقیناً نہیں پائی جاتی اور اس کے کلام کے متعلق بھی یہ فتویٰ دینا اتنا صحیح نہیں ہے جتنا اور بہت سے لوگوں کی غنائی شاعری کے متعلق صحیح ہوسکتا ہے۔ میں ٹامس ہارڈی (Thomas Hardy) کے اس قول سے کہ ہماری فلک بوس عمارتوں کے بعد امریکہ میں جس چیز کو میں سب سے

زیادہ پسند کرتا ہوں وہ ایڈنا ملے کی شاعری ہے، بالکل متفق تھا اور اس وقت سے اب تک میرے خیال میں ایسی کوئی بات واقع نہیں ہوئی ہے جس کی بنا پر ہمیں اپنی رائے بدلنا پڑے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں شاعری کی کل "جدید" تحریک کو اس کے تنزل سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس کا محض بزمیہ اور محلاتی رنگ اختیار کرنا، اس زمانہ کے سادہ الفاظ استعمال کرنے کے بہانہ سے عمیق اور پرشکوہ اسلوب سے گریز کرنا، دماغی دھندلاہٹ کو اعلیٰ مرتبہ دینا، استعارات کی برجستگی کا خیال کئے بغیر ان کی بھرمار کرنا، اسے موسیقی سے بلند قرار دینا، صنعت کارانہ شاعری کو معیارِ کمال سمجھنا اور اس کو ایک اصلاحی تحریک کا ہراول قرار دینا، شعر کو بجائے زندگی مقصود سمجھنا اور نظم میں ایسے غیر معروف حوالے ٹھونس دینا کہ کوئی مصروف آدمی ان کی تلاش کے لئے وقت نہ نکال سکے، یہ تمام خصوصیات جن کو خلاصتاً محض ایک لفظ "اظہارِ فضیلت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ خصوصیت ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ایک تازہ تصنیف "شعر اور شعرا" میں نہایت ناگوار صورت میں پائی جاتی ہے۔ اگر ہماری ثقافتی صحت مندی بحال ہو جائے تو میرے خیال میں یہ ایک بدنما داغ کی حیثیت سے مطعون کی جائے گی۔ مجھے یہ ترقیاں جن پر زمانہ حال کے نقادانِ سخن کو اس قدر ناز ہے درحقیقت فن شعر کو پستی کی طرف دھکیلنے والی معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے عنفوانِ شباب میں یہ لوگ زیادہ ہونہار اور صاحبِ ہمت تھے جو کپلنگ کے قول کے مطابق بے انتہا "قوتِ بالیدگی" اور پرجوش زندگی بسر کرنے "کا وقت ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس حالتِ درماندگی کے جو قبل از وقت ان پر

طاری ہو گئی ہے اور جسے کیارڈی اچھی اور بری دونوں حیثیت رکھنے والے شعور اور یاس انگیز عقلیت کی جانب نشو ونما پانے" کے مترادف بیان کرتا ہے۔

یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس "عقلیت پسندی" کو جس پر مذکورہ جدید ناقدینِ ادب بڑا فخر کرتے ہیں عمیق تخیل یا صحیح اندازِ تخیل سے متمیز کیا جائے۔ یہہ عقیدت پسندی، عمیق تخیل کی تقریباً نقیض ہے۔ یہ ایک ایسے دماغ کے خیالات تصورات اور جذبات کے بے قاعدہ مرکب سے لطف اُٹھاتا ہے۔ جو علم سے معمور ہونے کے باوجود جذبات سے مشتعل ہو۔ یہ اسلوبِ شاعری جان ڈن (John Donne.) کی وجہ سے جو بقول رینسم "عقلیت پسند حضرات کا ترجمان شاعر" تھا رواج پذیر ہوا اور وہ بلاشبہ اس قسم کے شاعرانہ آرٹ کا ماہر تھا۔ اس کے تخلیقات شعری کا مطالعہ واقعی ایک شاندار تجربہ ہے۔ یعنی اس کی دماغی کیفیات کو سمجھنے اور اس کے معنی تک پہونچنے کے لئے معمے حل کرنے کا تجربہ لیکن اس کو گہرے تخیل اور شعری موسیقیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ رینسم نے ڈن کے پیروؤں کی جو فہرست ترتیب دی ہے اس میں سے اگر صرف اول تین شعرا کے جو ہمارے عہد کے "عقلیت پسند" شاعر کہے جاتے ہیں کلام پر ہم نظر ڈالیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کا کلام ان لوگوں کے نزدیک جو حصول علم ادراک کے خواہاں ہیں۔ خیال آفرینی سے کس قدر دور ہے، ان میں سے ایک ازرا پاؤنڈ (Ezra Pound.) ہے جس کی علمیت برائے نام ہے اور اس کی نثر بھی اگر وہ اپنے خیالات کا اظہار نثر میں کرے تو اس کی دماغی ذکاوت اور عقل کے فقدان کی غمازی کرے گی، دوسرا ایلن ٹیٹ (Allen Tat) ہے جس کے مضامین نثر سے بھی یہ معلوم کرنا

---

لے دیکھو نوٹ مصنف (۳) صفحہ (۳) صفحہ ۴۵۷

مشکل ہوتا ہے کہ اس کا مافی الضمیر کیا ہے، تیسرا ولیم بٹلر ییٹس (William Butler Yeats.) ہے جس نے اپنے گرد نوآموزوں اور عطائیوں کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا اور ان کے غیر علمی خیالات کو اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا۔ رنیسم کے نزدیک ان شعرا کا امتیاز خصوصی ان کی "عقلی قوت" ہے اور وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں نے تلمیحات اور حوالہ جات کا میدان اتنا وسیع کر لیا ہے کہ بھولا بھالا نسوانی دماغ تو اس کا احاطہ ہی نہیں کر سکتا۔ رنیسم کے دماغ میں اس تحریر کے وقت بھی ایڈنا ملے موجود تھی۔

اگر یہ "عقیدت پسند" شعرا اپنے ذہنوں کو ایڈنا کی خصوصیاتِ شعری کو سمجھنے کے لئے استعمال کر رہے تھے تو ان کو سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ ان کا یہ تحقیر آمیز رویہ ایڈنا کی شاعری پر مبصرانہ تنقید نہیں تصور کیا جا سکتا بلکہ اس سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی یہ تنقید اس کے اسلوب سخن سے نفرت کا نتیجہ ہے۔ یہ اس امر کا نہایت واضح مظاہرہ ہے کہ ہمارے ذوقِ شعری کی مسلسل رَو میں انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے نہایت واضح مظاہرہ اس لیئے کہا کہ ایڈنا میرے خیال میں گزشتہ مذاقِ شعر کی ایک نہایت ممتاز نمائندہ اور اس عہد کے عظیم ترین شاعروں میں سے تھی۔ سارے امریکی ادب میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے اس کی نظم "نسلِ انسانی کا کتبۂ مزار" کی وسعتِ عقل و ادراک شکوہ اور فصاحتِ بیان کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ اگرچہ یہ نظم بہت مختصر ہے لیکن ملٹن کے بعد انگریزی زبان میں صرف ایک ہی نظم ایسی ہے جو فنی جسارت میں ڈانٹے (Dante.) اور لکریٹیس (Lucretius,)

سے ٹکرّ لے سکتی ہے۔ اس کا اختصار ایک خاص قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اگر ہم بدترین توہمات اور من مانے نظریات کو ترک کر دیں تو پھر انسان اور کائنات کے بارے میں بیان کرنے کے لئے کیا رہ جاتا ہے؟ یہ بات کس قدر نمایاں ہے کہ ان جدید اصول تنقید کو پروان چڑھانے والے اہلِ دماغ نے اس عظیم الشان نظم، اس کی زمیہ مناظر کشی، اس کی کامل دہشت انگیزی اور اس دماغ کی مردانہ جسارت سے متعلق قرار واقعی اظہار رائے نہیں کیا جس نے آخر کار مافی الضمیر کہنے کی جرأت پیدا کی۔

مجھے اپنی سرگزشت کی ابتدا ہی میں یہ کہنا ہے کہ ایڈنا سے زیادہ صاف، ٹھوس، بیدار اور منطقی دماغ سے مجھے آج تک سابقہ نہیں پڑا۔ یہی نہیں بلکہ بہت اشیا کے متعلق اس کی غیر معمولی وسیع اور ہمہ گیر واقفیت نے بھی مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ فطرت زبان و ادب اور اس کے فن سے متعلق ہر چیز پر اس کو دسترس حاصل تھی۔ ان موضوعات میں اس کی فطرت اہلیت اور نظم و ضبط ایک محقق کے مانند ہے۔ "عقلیت سے بے پروائی" کرنے کے بجائے جیسا کہ رنیم نے بڑی بے تکلفی سے کہدیا ہے وہ میرے معیار کے مطابق ذہنی اور اخلاقی نظم و ضبط سے ضرورت سے زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔ اس میں ایک معلمہ کی سی شان پائی جاتی تھی اسی خصوصیت نے (یہ عجیب بات ہے کہ جنسی خواہشات کی تسکین میں اس کی حیا کی کے ساتھ یہ صفت بھی برابر کی شریک تھی) میرے اس خواب کو جو میں نے اس سے رشتۂ محبت استوار کرنے کا دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

ایک مرتبہ جب میں موسم بہار میں اٹلی میں کوہ پیمائی کر رہا تھا تو حیرت انگیز طور پر یکایک اس خواب نے میرے دل و دماغ پر تسلط جما لیا۔

میں اپنی زندگی کی سب سے پہلی محبت کو کھو چکا تھا یا خود اپنے ہاتھوں برباد کر چکا تھا اور اب یورپ میں اسی تنہائی کی حالت میں آیا تھا کہ خود اپنے اوپر بھی بھروسہ نہ تھا، تاہم اپنی عادت کے موافق اس جذباتی آزادی میں قسمت آزمائی کا آرزو مند تھا۔ یہ ۱۹۲۲ء کا موسم بہار تھا اور یہ پہاڑ جنیوا سے بیس میل کے فاصلہ پر ساحل پر تھا۔ میں جنیوا میں جنگ عظیم کے بعد دولِ عظمیٰ کے مشہور اجلاس میں بحیثیت نامہ نگار شرکت کرنے آیا تھا۔ اسی سال ایڈنا کی کتاب "سیکنڈ اپریل" (Second April) شائع ہوئی تھی اور مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ میں نے جنیوا میں اس کتاب کا مطالعہ کیا یا کسی دوسری جگہ اس مجموعہ کی چند استادانہ غزلیں پڑھیں، لیکن اب میں بخوبی سمجھنے لگا تھا کہ ایڈنا کی عظیم شہرت کے اصلی اسباب کیا ہیں۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ وہ پیرس کے گرد منڈلاتی پھر رہی ہے، میں خود بھی پیرس کا چکر کاٹ رہا تھا اور اب پھر وہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ اشتیاق ہمیشہ سے پرورش پا رہا تھا کہ میری محبت کا ہدف کوئی ہستی ہو جو میری کھوئی ہوئی محبوبہ کے مماثل نہیں بلکہ میری امنگوں، میرے دماغ اور میرے جسم سے زیادہ مماثل ہو، یہ اور بھی اچھا ہو کہ وہ شہرت کی بھی مالک ہو، کیونکہ میں جس سے محبت کرتا ہوں اس کی تعریف و توصیف کرنا بھی پسند کرتا ہوں۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ جوں جوں میرے قدم آہستہ آہستہ پہاڑی راستہ پر اٹھ رہے تھے۔ اسی طرح ایڈنا ملے کی محبت کا جذبہ بھی بڑھ رہا تھا اور اسی خیال میں میں ایک غزل لکھ رہا تھا جسے میں اس کے پاس بھیجنا چاہتا تھا۔ اس غزل کی ابتدا تو اس طرح تھی "میں تمھاری محبت میں

ایک آفتاب بردوش پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔" بیچ کے اشعار مجھے یاد نہیں رہے لیکن اس کے آخری اشعار یہ تھے: "اس دارو گیر اور کشمکش سے آلودہ زمانہ کی مخالفت عناد اور غیظ و غضب سے بے پروا اور اس کے تمام اسلحہ اور زخموں سے بے نیاز ہو کر تم نے اپنے نغمہ کا بیباک صاف ستھرا اور نازک عَلم بلند رکھا ہے، اس کی قوت اور خوب صورتی قائم رہی ہے اور وہ فضا میں گل و سیم بکھیرتا رہا ہے۔"

یہ دن میری زندگی کے نہایت طرب انگیز دنوں میں سے ایک تھا جس کی یاد اب تک مجھے نہیں بھولی ہے، اور وہ محبوبہ جس کو میں سراہ رہا تھا، میری زندگی کے بہترین محبوبوں میں سے تھی۔ میری یہ محبت ایسی ہی تھی جیسی ڈانٹے کی محبت بیٹرس سے جس سے نہ کبھی بات ہوئی اور نہ جسے چھوا گیا۔ ڈانٹے کی نسبت اس محبت کی مدت کم تھی، لیکن پیرس واپس جانے تک یہ میرے دل پر مسلط رہی۔ وہاں میں نے ایڈنا کو گھومتے ہوئے دیکھا، مجھے صحیح تو یاد نہیں رہا کہ اس سے کہاں ملاقات ہوئی غالباً مانٹ پرناس پر کیفے ڈوم میں ملنا ہوا جہاں امریکہ کے تمام اوباش، اہل قلم، فن کار اور قلیل آمدنی والے خارج الوطن لوگ اپنا قلیل سرمایہ رنگ رلیوں میں صرف کرتے ہیں۔ ہم نے کھانا ساتھ کھایا، خوب باتیں کرتے رہے اور قہوہ نوشی کے بعد میں نے اس سے اپنے کمرہ واقع بوارڈس میں آنے اور کچھ نظمیں سنانے کی درخواست کی۔ صد افسوس کہ میں ابھی تک اس کے دام محبت میں گرفتار نہیں ہو رہا تھا لیکن اُمید تھی کہ شاید ایسا ہو جائے۔ وہ میرے کمرہ میں آئی اور چونکہ میری قیامگاہ اتنی مختصر تھی کہ اس میں صرف ایک چارپائی ہی بیٹھنے کے لئے تھی ہم اسی چارپائی پر بیٹھ گئے یا یوں کہیئے کہ

لیٹ گئے اس طرح کہ ہم دونوں کے سر ایک ہی تکیہ پر ٹکے ہوئے تھے۔ ایک یا دو نظموں کے بعد جن کا اس کی ذات سے کم تعلق تھا اس نے مجھے ایک سانیٹ[1] (Sonnet..) سنایا جس میں ایسے جذبۂ عشق کی حمایت اور تعریف کی گئی تھی جو عارضی نوعیت کا ہو اور جس میں کچھ الجھنیں بھی نہ ہوں، لیکن اس وقت تک مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ میرا خواب باطل ہو گیا ہے، ہم ایک .......... دوسرے کے قریب نہیں معلوم ہوتے تھے، ہم اب بھی مصروفِ گفتگو تھے، کسی مخصوص خلا نے اس فضا کے جس میں ہم سانس لیتے تھے دو حصّے کر دیئے تھے۔ پندرہ سال اور گزر جانے والے تھے جب ایک خفیف لیکن بے ساختہ ادا کے ذریعہ اس کی عیش پسندانہ دل کشی مجھ پر حملہ کرنے والی تھی اور میں حُسن کے ان "نشہ آور اثرات" کو پورے طور پر محسوس کرنے والا تھا جن کا ذکر ایڈمنڈ ولسن نے کیا ہے۔

اس رومان میں ناکام ہو کر میں نے پیرس میں اپنے قیام کو طول نہیں دیا، اور ایک ایسے نصب العین کا تعاقب شروع کر دیا جو میری ذات سے بہت کم تعلق رکھتا تھا۔ میں نے ماسکو جانے کی تیاری شروع کر دی کیونکہ میرا اصلی مقصد یہی تھا جنیوا تو میں تھوڑے وقفہ کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ روس میں جو نیا اشتراکی معاشرہ قایم ہو رہا تھا میں اس کی حقیقت دریافت کرنے کے لیۓ وہاں جا رہا تھا جب کہ اطالوی دامنِ کوہ میں اس بے موقع درخشاں رومانی تخیّل نے مجھے راستہ میں روک لیا۔

میں قریباً دو سال روس میں مقیم رہا اور ایک سال ریو یرا میں صرف ہوا۔ پھر میری ملاقات ایڈنا سے ہوئی۔ اس عرصہ میں اس نے میرے ایک عزیز ترین دوست

---

[1] انگریزی نظم جو چودہ مصرعوں کی ہوتی ہے۔

یوجین باسیوین (Eugene Boessevain) سے جو ایک بے مثل رفیق حیات ہے شادی کر لی تھی۔ میں اور وہ دونوں سینٹ لیوک پلیس (St. Lukes Place) میں ایک کمرہ میں رہتے تھے اور ہم دونوں کے مطبخ کے لئے گرجے کی طرف سے ایک ہی ملازمہ تھی جس کا نام این تھا۔ روس روانہ ہونے سے قبل دو سال تک ہم نے ساتھ ساتھ بہت عمدہ زندگی بسر کی تھی، اس لئے اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایڈنا میرے ہی خاندان میں چلی آئی ہے، لیکن ماسکو پہونچ کر میں نے بھی شادی کر لی تھی اور میری شریک حیات اور بھی بے مثل تھی۔ اس میں یہ نادر خوبی تھی کہ وہ حقیقت پسندی سے زندگی کا مقابلہ کرتی تھی اور دعاؤں کا وسیلہ ڈھونڈھنے کے بجائے ہنسی خوشی زندگی گزار دینے کی عادی تھی۔ ہم چاروں بہترین اور ایسے دوست بن گئے جن میں رقابت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہم میں سے کسی کے متعلق یہ رائے قائم کرنا مشکل تھا کہ کون کس سے زیادہ اُنس رکھتا ہے۔ ایک سال تک میں اور ایلینا اس کوشش میں رہے کہ اسٹیپل ٹاپ کے قریب جو آسٹرلٹز (Austerlitz) میں یوجین اور ایڈنا کی جائے قیام تھی ایک فارم خرید لیں، لیکن جب مارتھا وائن یارڈ کے پاس ساحلِ سمندر کی دلفریبی نے ہمیں اپنی طرف کھینچ لیا تو یہ خیال دل سے نکالنا پڑا۔ ہم اکثر ہفتہ اور ہمیشہ ہفتہ کے آخری ایام ان کی دیہاتی قیام گاہ میں جو برک شائر کے دامن کوہ میں ہے ساتھ ساتھ سفر کیا کرتے تھے، باقیماندہ ہم اپنے مختصر سے مکان میں جو کروٹن آن ہڈسن میں ہے اور جہاں ایک مختصر سا ٹینس کورٹ بھی تھا گذارتے تھے، اور ایک مرتبہ ہم نے ایک یادگار تعطیل کا دن مارتھا وائن یارڈ میں سنسان ساحل پر سمندر میں تیرنے اور برہنگی کی حالت میں

دھوپ کھانے میں گذارا۔

اسی زمانہ میں ایڈنا نے اپنی عظیم ترین نظمیں لکھیں "برف میں ہرن" (The Buck in the Snow.) ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ انگلستان میں اس نظم کا بہت شاندار خیر مقدم ہوا۔ اگرچہ امریکہ کے تبصرہ نگاروں نے اس پر کچھ مایوسی کا اظہار کیا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ ایڈنا کی طویل خاموشی نے اس کو ایک افسانوی شخصیت بنا دیا تھا اور اس کے متعلق یہ تاثر قایم ہو گیا تھا کہ اس کی شاعری میں خیال آفرینی سے زیادہ غنائیت یا موسیقیت کا رنگ غالب ہے۔ حالانکہ اب حالت بالکل بدل گئی تھی۔ اب اس کے طویل اور آزاد کلام میں شوخی کی بہ نسبت جذبات زیادہ پائے جاتے تھے، تخیل زیادہ تھا لیکن روشن تصوّرات زیادہ نہیں پائے جاتے تھے۔ میرا گمان ہے کہ یہ امر ابھی تک طے شدہ نہیں کہ ابتدا میں اس کے کلام کی کس خوبی کو اس کی قابلیت کا اصل جوہر سمجھا گیا تھا۔ جو لوگ اس کے کلام کی غنائی کمال کے قائل تھے ــ یعنی وہ لطیف جوہر کلام جو فن عروض میں دستگاہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس کو ہمیشہ وہ لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں جو خود شاعر نہیں ہیں اور اس کو شاعری کی جان سمجھتے ہیں ــ بلاشبہ ایسے لوگوں کی نظروں میں اس کے کلام کی گرمی اور خیال آفرینی اس کی شاعری کے انحطاط کی نشان دہی کرتی تھی، اور وہ شدید جدّت پسند تنقید نگار جو ایک زمانہ میں اس کے غیر پختہ کلام کو سڑکوں پر گنگنایا کرتے تھے ــ زیادہ تر اس وجہ سے کہ یہ اس زمانہ کا رواج تھا۔ یہ لوگ پہلے ہی ایک نئے اسلوب کی راہ پر گامزن تھے۔ میں چونکہ خدا کے فضل سے پُرانی روش ہی پر قائم رہا اس لئے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایڈنا

کی یہ نظم " برف میں ہرن " ہماری زبان کی اعلیٰ غنائی نظموں میں شمار ہوسکتی ہے موت وزیست کی کیفیات کا جو نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے اس کی مثال کسی زبان میں نہیں ملتی، یہ خود اس کا ذاتی کمال ہے، کوئی دوسرا ایسا کلام نہیں لکھ سکتا۔

"سفید آسمان ان شیکران کے پودوں پر جو برف سے جھک گئے تھے۔ کیا تم نے سر شام سینگوں والے ہرن اور اس کی ہرنی کو سیب کے باغ میں کھڑا ہوا نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ یکایک وہاں سے بھاگ گئے اس حالت میں کہ ان کی دُمیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ اور وہ دلکش انداز میں آہستہ آہستہ چھلانگیں لگا رہے تھے، وہ پتھریلی دیوار پر شیکران کے درختوں میں جو برف سے جھک گئے تھے چلے جارہے تھے۔ اب وہ یہاں پڑا ہوا ہے اور اس کا گرم وحشی خون برف کو جھلسا رہا ہے۔ موت کیسی عجیب چیز ہے جس نے ہرن کو گھٹنوں اور سینگوں کے بل برف پر گرادیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس وقت یہاں سے شاید ایک میل دور بوجھل شیکرانوں کے نیچے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اپنا برف کا بوجھ پروں کی طرح اپنے پتوں سے گرا کر ہلکا کرتے ہیں۔ ہرنی کی آنکھوں سے زندگی فکر میں ڈوبی ہوئی نظر آرہی ہے۔

اس کی نظم " نسل انسانی کا کتبۂ مزار بھی اسی زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ جب ہم گہرے دوست تھے۔ نیز سانیٹ " مہلک ملاقات " ( F:Fatal Interview. :W) ایک اور نظم بھی اسی زمانہ میں لکھی گئی، جسے اس کے نوجوان قدر دانوں نے اپنی اس کوشش کے سلسلے میں کہ ایڈنا کی بلیغ شاعری کو بے وقعت ثابت کیا جائے بڑی حد تک نظر انداز کر دیا ہے۔ ہوریس گریگری ( Horace Gregory.: ) اور ماریا زا

ٹورینسکا (Marya a Zaturenska. ka) نے اپنی کتاب " امریکن شاعری کی تاریخ ۱۹۰۰ تا ۱۹۴۰ " میں ان شاندار نظموں میں سے ایک کا بھی ذکر نہیں کیا' اس ادعائی تصنیف میں جسے حوالے کی ایک معیاری کتاب فرض کر لیا گیا ہے۔ ایڈنا ملے کی مختصر تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ " اس کی خوبیاں نوجوانی کی پر تکلف نمائش سے آزاد دل فریبیوں اور ہلکے اور جلد ختم ہو جانے والے غموں پر مشتمل ہیں " اور اس کی شاعری غالباً لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کی آنے والی نسلوں کو واردات نوجوانی سے شاعرانہ انداز میں روشناس کرے گی "۔ تاوقتیکہ یہ ذاتی رنجش پر مبنی نہ ہو اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ کے تنقیدی ذوق کا عام تنزل اس حیرت انگیز تبصرہ کی بنیاد ہے۔

بہت سے اشخاص جنھوں نے اس دل شکستہ کرنے والے جذبہ کو "جو مہلک ملاقات" کے پرسکون و منظم اشعار میں پایا جاتا ہے محسوس کیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے کہ یہ اشعار اس وقت لکھے گئے تھے کہ "جب شاعر آٹھ سال پرانے شوہر کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہی تھی"۔ ایلزبتھ اٹکنس نے ایک مسودہ جس میں مذکورہ جملہ درج تھا یوجین کو دکھایا اور وہ بیان کرتی ہیں کہ یوجین نے نہایت نامکمل تبصرہ ان الفاظ میں کیا کہ جو مفروضہ اس میں پیش کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ میں نے اس سوال پر اپنے دونوں دوستوں میں سے کسی سے گفتگو نہیں کی لیکن میں یوجین کی شہادت کی تصدیق کرتا ہوں کہ اگرچہ وہ گرم جوشی سے اور قابل تحسین انداز میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے تاہم جس کیفیت کا ان الفاظ سے اظہار ہوتا ہے کہ " وہ اپنے آٹھ سال پرانے شوہر کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہی تھی "

ایڈنا کے مزاج کی ان ایام کی کیفیت سے بہت مختلف ہے، اور جو فقرہ یوجین کے جواب کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس سے بھی یوجین کے مزاج کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی۔ اس نے کبھی اس کی پرستش سے اور غیر معمولی عقیدت کے ساتھ اس کی نگہداشت سے سرتابی نہیں کی اور اس کی یہ نگہداشت ایک شوہر کی نسبت اس نرس کی نگہداشت سے زیادہ مشابہ تھی جو وہ ایک نہایت حسین بچہ کی خاطر کرتی ہو۔ لیکن وہ ایک مرد تھا اور مرد جنسی اعتبار سے آوارہ گرد ہوتے ہی ہیں، اس کے علاوہ اصولاً شادی کے معاملہ میں وہ اس نظریہ کا قائل نہ تھا کہ فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے پر کلیتہً قبضہ کرلے۔ امریکہ میں جب عورتوں کی تحریک زور پر تھی تو اس وقت یوجین کی شادی انیز ملھولینڈ (Inez Milholland, سے ہوئی تھی۔ اس شادی کے نجی معاہدوں میں ایک بنیادی معاہدہ ان دونوں کے درمیان یہ ہوا تھا کہ فریقین کو جذباتی تجربہ کی آزادی حاصل رہے گی۔ افسوس کہ شاندار انیز اتنی جلدی وفات پاگئی کہ اس نئی قسم کے معاہدۂ شادی کے خواب کی جو انھوں نے عہد شباب میں دیکھا تھا فیصلہ کن آزمائش نہ ہوسکی، لیکن میرے پاس یہ تصوّر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یوجین نے ایڈنا کو اس سے کم فراخ دلانہ ہدیۂ محبت پیش کیا ہوگا۔ میرے خیال میں یہ حقیقت کہ اس کو بذاتِ خود کلیتاً قبضہ میں یا نگرانی میں رہنے کی ضرورت نہ تھی ہر اُس شخص پر واضح ہوجائے گی جو کچھ عرصہ تک اس کی شاعری کا مطالعہ کرے گا۔

کوئی بھی سرگزشت اگرچہ بالکل صحیح صحیح بیان کیا جائے گا ہرگز مسلسل نہیں ہوسکتی اور وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بیان کی جائے گی کیونکہ بعض اجزا انسان کے

حافظہ میں صاف صاف باقی رہ جاتے ہیں اور ان کے ساتھ کی دوسری باتیں تمام فراموش ہو جاتی ہیں۔ ہم اپنے مکان پر کروٹن میں شراڈ (چیستاں) کا ایک حقیقت پسندانہ کھیل کھیل رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ اس پارٹی میں ژیل (Yale) سے ایک ملائم بالوں والے نوجوان کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہ لفظ جس کے معنی ہمیں ایکٹ کر کے نمایاں کرنے تھے "باتھ شیبا" (Bathsheba.) تھا۔ آخری سین میں ایڈنا کو چھت پر جا کر باتھ شیبا کا اور اس نوجوان کو ادھر سے گزرتے ہوئے ڈیوڈ (David) کا کردار ادا کرنا تھا اس نوجوان نے جوش کے ساتھ کہا "یہ اونچی میز چھت کا کام دے گی، میں بغلی دروازہ سے داخل ہوں گا اور تم وہاں غسل کے لباس میں ہو گی ..." ایڈنا نے کہا "غسل کے لباس میں! غسل کے وقت کوئی لباس نہیں پہنا جاتا!" نوجوان نے ڈیوڈ کا کردار جو اس کے ذمہ تھا کسی قدر شرماتے ہوئے لیکن بڑی جرأت کے ساتھ ادا کیا۔

ایڈنا اور میں ایک شام ان لغو خیالات پر گفتگو کر رہے تھے جو بناوٹی شرم کرنے والے رسم پرست اشخاص ان لوگوں کے بارے میں رکھتے ہیں جو جنسی تعلقات کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ یہ بات کہ امریکی رسم و رواج میں "اخلاقی" اور "غیر اخلاقی" الفاظ کے معنی کو اتنا محدود کر دیا گیا ہے کہ ان کا اطلاق صرف اس دقیق مسئلہ پر ہوتا ہے کہ آیا کوئی شخص جنسی تعلقات میں کسی قاعدہ کی مطابقت کرتا ہے یا اپنے ذوقِ سلیم کی موافقت کرتا ہے۔ ہم دونوں کے نزدیک نہایت افسوسناک تھی لیکن اگر ان امور میں لوگ سیدھے سادے طور پر عمل کرنے لگیں تو تحلیل نفسی کے ماہرین کیا کریں گے؟ اس نے کہا "ان لوگوں کی کوئی ضرورت نہ ہو گی، یہ سب افسوسناک حد تک ہچکچاہٹ یا محرومیت کے شکار ہوتے ہیں اسی لئے وہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کی تہ میں جنسی عوامل کام

کرتے ہیں" اور اس نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ کسی پارٹی میں تنہا بیٹھی تھی اور اس کے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ اس وقت ایک نوجوان ڈاکٹر آیا اور کہنے لگا کہ میں آپ کو کچھ دیر سے دیکھ رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اگر آپ مجھے اس کی اجازت دیں' اور اس نے یہ تجویز پیش کی "کیا آپ لائبریری میں میرے ساتھ آجائیں گی جہاں ہم نجی طور پر گفتگو کر سکیں"، ایڈنا نے کہا "بخوشی ایسا کروں گی"۔ اس نے یہ بات آرام حاصل کرنے کی اُمید سے زیادہ محض شوقِ تجسّس سے کہدی۔ جب وہ محفوظ طور پر تنہا رہ گئے اور دو بڑی کرسیوں پر آرام سے بیٹھ گئے۔ تو وہ اُٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر واپس آیا اور اس نے چند سوالات کرنے کی اجازت چاہی۔ ایک طویل اور پُرپیچ تمہید کے بعد اس نے بڑے پس و پیش اور چند ابتدائی غلط جملوں کے بعد یہ شاندار جملہ ادا کیا "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا کبھی آپ کو ایسا معلوم ہوا ہے کہ آپ میں (اگرچہ یہ غیر محسوس طور پر ہوا ہو) کبھی اپنی ہی جنس کے کسی فرد کے لئے عاشقانہ ہیجان پیدا ہوا ہے" ایڈنا نے جوش کے ساتھ جواب دیا "کیا تمھارا یہ مطلب ہے۔

اس کا میرے درد سر سے کیا تعلق ہے؟"

یوجین کی ایک خصلت جس کو میں اس کی طبیعت کے ولندیزی عنصر سے منسوب کرتا ہوں (کیونکہ اس کی والدہ آئرلینڈ کی باشندہ تھیں) یہ تھی کہ اسے اپنی اشیا سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اپنی ہر چیز کی بہت زیادہ اور بعض اوقات اضطراب کے ساتھ حفاظت کرتا تھا۔ ایک گرمی کی شام کو جب ایلینا اور میں اس سے ملنے کے لئے آسٹر لیز گئے اور ہم چاروں مکان کے اگلے حصّہ میں دوہرے دروازے کی

کھول کر محوِ خواب تھے یوجین غسلخانہ میں گیا تو اس نے ان چھوٹے سفید تولیوں میں سے جو مہمانوں کے لئے وہاں لٹکے ہوئے تھے ایک میں کٹنے کا نشان دیکھا بظاہر کسی شخص نے اس سے سیفٹی ریزر کے بلیڈ کو بے احتیاطی سے صاف کیا تھا' لیکن اس نے یہ فرض کر لیا کہ میں نے یہ کام کیا تھا اور بڑی سنجیدگی سے مجھے بلا کر پوچھا۔ کم از کم مجھے یہ خیال ہوا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں نے وہ حرکت نہیں کی تھی اور میرا ردِ عمل جنگ جویانہ تھا لیکن اسے یقین تھا کہ یہ میں نے ہی کیا تھا اس لئے یہ جھگڑا طے نہ ہو سکا۔ . . .

اس قصہ کو ختم کرنے کے لئے اب مجھے اس مضمون سے ہٹ کر کچھ بیان کرنا ہے۔ میں ناظرین کو بتانا چاہتا ہوں کہ روسی زبان میں حروف تعریف یا تنکیر یعنی "دی" (The) یا "اے" (A) نہیں ہوتے، اس لئے جب ایسے مانوس نام جیسے کہ چراغ یا کیتلی بولے جاتے ہیں تو ایک انگریز کے کانوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان کو ذی روح تصور کیا جا رہا ہے۔ ایلینا اور میں، جب ہم نے رفتہ رفتہ روسی زبان کا استعمال ترک کر دیا' انگریزی میں بھی اکثر اپنے ان غیر ذی روح ساتھیوں کا ذکر اسی محبت آمیز انداز میں کرتے تھے۔ اب میری کہانی پھر شروع ہوتی ہے . . . ٹھیک اُس وقت جب ہم سو جانے کے قریب تھے اور مذکورہ تنازعہ کے باعث پژمردہ سے تھے میں نے تاریکی میں کہا "یوجین!" کرخت لہجہ میں اس کا جواب ملا "جی ہاں"۔ میں نے کہا "مجھے چھوٹے تولیہ کے بارے میں بہت افسوس ہے"۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس جملہ میں حرف تعریف کا حذف بمقابلہ اس عذر خواہی کے جو میں نے یوجین سے کی (یا کم از کم دونوں باتوں کا مجموعی اثر

ایڈنا کو بہت زیادہ متاثر کرنے کا باعث ہوا۔ وہ اپنے بستر سے اچھل کر اٹھی اور رات کے باریک ریشمی لباس میں دوڑ کر میرے پاس آئی اور مجھے اپنے گرم آغوش میں لے لیا اور مسرت آمیز محبت سے مجھ سے بغلگیر ہوئی۔ اس وقت سے وہ رکاوٹ جو ہمارے درمیان اس کی ذاتی عظمت اور میرے فقدان خود اعتمادی کے باعث واقع تھی دور ہو گئی اور انجام کار میں نے وہ "نشہ آور اثر" جس کا ایڈمنڈ ولسن نے ذکر کیا ہے محسوس کیا اور اس حقیقت کو سمجھا (اگرچہ بہت دیر سے) کہ اٹلی میں دامن کوہ پر جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ سراسر خیالی پلاؤ نہ تھا۔

اگرچہ ہم ایک دوسرے سے قریب آ گئے تھے اور ہماری دوستی میں خدنگِ محبت بھی داخل ہو گیا تھا تاہم اس کے اندر کوئی خصلت ایسی تھی جو میرے لئے باعثِ پریشانی تھی۔ میرا خیال ہے وہ خصلت اس کا کٹر پن تھا یعنی علمی معاملات اور ذوقی و اخلاقی اصول کے بارے میں ایک قسم کی شدّت پسندی، میرا اشارہ اس چیز کی طرف نہیں ہے جسے ایڈمنڈ ولسن نے "ٹھوس عقلی پہلو" کہا ہے۔ کیونکہ اس وصف کا تو میں دل دادہ تھا۔ اور میں لفظ "اخلاقی"، کو ایسے مفہوم میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جو جنسی تعلقات کے تصوّر سے گراں بار ہو۔ جنسی تعلقات کے معاملہ میں ہم چاروں ایسی آزادی کے قائل تھے جس پر اگر کوئی پابندی ہو تو عقل و فراست کی ہو رسم و رواج کی نہ ہو۔ بہت لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آزادی امریکہ میں صرف ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان جب کہ جنگ کی گرج فضا میں موجود تھی حاصل ہوئی تھی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کو دوسرے زمانوں سے صرف یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے دوران میں مذکورہ آزادی کو بمقابلہ ان زمانوں کے

جب کہ مہم پسند حضرات پختہ کار ہو گئے تھے کسی قدر ناشائستہ طور پر برتا گیا تھا۔
جب وہ کسی مثالی اصول کے ہو بہو معنی یا کسی اطلاع یا جمالیات سے متعلق کسی
فیصلہ پر اصرار کرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ کوئی کٹر مذہبی عورت ہے یا
کوئی سخت گیر فوجی افسر۔ وہ خود جفاکشی کی طالب تھی۔ وہ لوگوں سے بمقابلہ ان
فیصلوں کے جن کی بنیاد واقعی اور مضمر صلاحیتوں کے امتزاج پر ہوتی تھی مطلق
معیاروں سے اخذ کردہ نتائج پر عمل کرانا چاہتی تھی۔ ہارپر فرم کے ایک رکن کے
نام جس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وہ اپنی نظموں کے ساتھ کچھ ایسے حواشی شامل
کردے جن میں ان کے لکھنے کا مقصد اور موقع درج ہو اس نے جو مکتوب (اس
کے مجموعۂ خطوط میں نمبر ۲۵۴ پر) لکھا وہ اس کی مذکورہ کیفیت مزاج کی ایک
مثال کا کام دے سکتا ہے۔ اس نے اس انداز میں جواب دیا تھا کہ گویا اس بیچارے
نے جمالیات کے کسی مسلمہ اصول کی خلاف ورزی کی تھی۔ میں نے اپنی کتاب
"پچاس برس کی نظمیں" (Poems of Five Decades.) کے دیباچہ میں
لکھا تھا کہ سات سو سال پیشتر ڈانٹے نے اپنی عشقیہ نظمیں شائع کرکے اس قسم کی
کتاب کے لئے ایک اسلوب قائم کردیا تھا، لیکن ایڈنا کے اس خط میں مجھے بھی
ضمنی طور پر نشانہ بنایا ہے اور ایسا دعویٰ کیا ہے کہ گویا اس کا انتہا کو پہنچا ہوا
ذوقِ کم گوئی ایک ابدی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے خط ۲۵۳
میں اس کی کتابوں سے روپیہ پیدا کرنے کے ایک نئے طریقے کے متعلق ہارپر
کی ایک اعتدال پسندانہ تجویز کا بھی اس نے بہت بے توجہی سے جواب دیا،
اتنا ضرور ہے کہ آخر میں اس خشم آگیں جواب کو ایک شگفتہ انداز میں اس طرح

ختم کیا ہے "مجھے یقین ہے کہ ایک سال تک اور ہار پرا بینڈ برادرس میرے بارے میں یہ کہتے رہیں گے کہ اگرچہ میں ان کی تجویزیں مسترد کر دیتی ہوں لیکن ان کی مرسلہ رقوم قبول کر لیتی ہوں"۔ لیکن اس خصلت کی جسے میں بیان کر رہا ہوں ایک دوسری مثال میں اس نے اپنے کڑے پن کو نرم کرنے کی کوئی ایسی کوشش نہیں کی اور آخر میں کوئی متبسم انداز اختیار نہیں کیا، اگرچہ ایسا کرنے کی خاص طور پر ضرورت تھی۔

میرا اشارہ امریکی شعرا کی اکیڈیمی اور ایڈنا کے باہمی تعلقات کی جانب ہے۔ اس اکیڈیمی کی تنظیم اولاً ایک نیلی آنکھوں والی خاتون میری بلک (Marie Bulloch.) نے کسی قدر سادہ لوحی سے کی تھی اور اس کا مقصد ریاستہائے متحدہ میں شاعری کو فروغ دینا تھا۔ مسز بلک کی آنکھوں سے ایک وسیع خیالی نصب العین کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی ذات میں کام کرنے کی استعداد اور خوش اسلوبی کے اوصاف موجود تھے، اور سرمایہ دار لوگوں سے اس کا میل جول تھا۔ اس کے اس کسی قدر بلند بانگ ادارے کی طرف سے (جس کا میں اس کی ظاہری نمود و نمائش پر کچھ اعتراضات کرنے کے بعد چانسلر ہو گیا تھا) ...۵ ڈالر کی تیرہ فیلوشپ ان شاعروں کو دی گئی ہیں جنھیں اس کے چانسلروں نے منتخب کیا تھا اور اس وقت ...۵ ڈالر کے فنڈ سے نظم کی ان کتابوں کی طباعت میں مدد دے رہا ہے جن کو ناشرین پسند کرتے ہیں لیکن انھیں شائع کرنے میں مالی نقصان کا جو خطرہ ہوتا ہے اسے برداشت کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ بہ الفاظ دیگر یہ ادارہ امریکی شاعری کے لیے سراسر نفع بخش ثابت ہوا ہے اور میرے خیال میں اس حقیقت کو اب ملک کے تمام شعرا اور شاعری

کے دلدادہ حضرات تسلیم کرتے ہیں، لیکن شروع میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا جذبہ میری بلک میں اتنا زیادہ تھا کہ خوش قسمت شعرا کو ۵۰۰۰ ڈالر کا وظیفہ دینے کے لئے بعض سخت قیود عائد کردی گئیں تھیں۔ ایک ذیلی قانون یہ تھا کہ ہر شخص اپنے فیلوشپ کے سال کے اندر کم از کم تین مرتبہ اور ہر مرتبہ اپنے سہ ماہی وظیفے کی ادائگی کے مقرّرہ وقت سے ۳۰ دن کے اندر کارپوریشن کے سکریٹری کو اس امر کی تحریری اطلاع دے کہ فیلوشپ کے مقاصد کے سلسلہ میں اس کی سرگرمیوں کی عام کیفیت کیا رہی ہے۔ ادارہ کی تشکیل کے سرٹیفکٹ میں ایک فقرہ ایسا شامل تھا جو غریب شاعر کو پریشان کرنے کے لئے مذکورہ شرط سے بھی زیادہ موثر تھا۔ وہ فقرہ یہ تھا:۔ حسب ذیل اشخاص فیلوشپ کے مستحق ہوں گے۔

"مسلمہ قابلیت کے شعرا خواہ وہ پیدائشی امریکی شہری ہوں خواہ انھوں نے امریکی شہریت قبول کرلی ہو اور ان کی مستقل سالانہ آمدنی پانچ ہزار ڈالر سکۂ رائج الوقت امریکہ سے زیادہ نہ ہو۔ فیلوشپ پانے والا کوئی شخص کسی ایسے نفع بخش کام میں پورے وقت یا وقت کے کسی حصہ کے لئے مشغول نہ ہوگا جسکو کارپوریشن کے چانسلروں کی اکثریت شعر گوئی کے ساتھ ساتھ جاری رکھے جانے کے لئے غیر موزوں قرار دے۔"

میں نے ان دستاویزوں کو اس وقت پڑھا جب ایڈنا نے مجھے ان کی جانب ایک خشم آلود خط کے ذریعہ توجہ دلائی۔ اس خط میں اس نے ادارۂ مذکور کے چانسلروں کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کیا تھا۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک سخت ملامت آمیز خط تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ شاعری میں حصول کمال

کا انعام" نہیں ہے۔ شاعر کو اپنی روزی کے لئے گیت سنانا لازمی ہے۔ وہ قلم جس سے اس نے اعلیٰ قدر و قیمت کے اشعار لکھے ہیں اسی سے اب ایک کارپوریشن کے سکریٹری کو ایسے خطوط لکھنا ضروری ہیں جن میں وہ "اپنی سرگرمیوں کی عام کیفیت" کا حال بیان کرے۔ کیا اس بالغ نظر فن کار کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا جا رہا ہے کہ گویا وہ ایک لائق بچہ ہے جس کی صلاحیتیں ہنوز غیر ترقی یافتہ ہیں؟ نہیں، اس کے ساتھ اس سے بھی بدتر برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس کی اہم اور شرمناک ذمہ داریاں صرف یہیں ختم نہیں ہوتیں، نہ صرف ایک سال کے اندر تین مرتبہ بلکہ سال کے ہر دن "اس کی فیلوشپ کے سال کے دوران میں،" اس پر یہ پابندی عائد رہے گی کہ وہ کسی ایسے نفع بخش کام میں پورے وقت یا وقت کے کسی حصہ میں مشغول نہ ہو جو ججوں کے ایک بورڈ کی رائے میں شعر گوئی کے ساتھ ساتھ جاری رہنے کے لئے غیر موزوں ہو۔" اپنی آزادی کے یعنی افلاس سے آزادی کے عوض "اس مسلمہ قابلیت کے شاعر" کو اپنی فیلوشپ کے دوران میں ٹھیک ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے جیسا کہ ایک ایسے قیدی کو اختیار کرنا پڑتا ہے جو اپنا قول دے کر عارضی رہائی حاصل کرتا ہے۔

مجھے شیلے کے چند اشعار یاد آتے ہیں جو اس نے "ایک نصیحت" (An Exhortation.) میں لکھے ہیں۔

تاہم دولت یا طاقت سے داغ دار کرنے کی ہمت نہ کرو۔
ایک شاعر کے آزاد اور پاکیزہ دماغ کو
روحیں جو چاند کے پرے سے آتی ہیں

اور وہ بخشش قبول کرنے سے انکار کرتی ہیں!

اس کا خط اگرچہ وہ میرے نام تھا تمام چانسلروں کو بھیجا گیا اور میری بلک کو بھی ارسال کر دیا گیا۔ ایک تشریحی خط میں جو میرے نام تھا اس نے بہت پر مذاق باتیں لکھی تھیں اور اس خط میں جو مسز بلک کے نام تھا اس نے اپنی خشم آگیں فصاحت کو اس خوش گوار سوال سے معتدل بنانے کی کوشش کی تھی: "کیا آپ کسی طریقہ سے اپنے ڈائرکٹروں کے بورڈ کو اس بات کے لئے آمادہ نہیں کر سکتیں کہ وہ حرکت میں آئیں، چند غیر ضروری دفعات کو منسوخ کر دیں، چند وکلاء کو اونچے عہدوں سے علیحدہ کر دیں اور اس تعجب خیز اور دہشت انگیز عطیہ کو زیادہ سادہ اور زیادہ قابلِ قبول بنانے کے لئے کچھ کارروائی کریں؟"

مسز بلک نے اپنی فراخ دلی یا غالباً اپنی لچک دار ذہانت کا اس طرح اظہار کیا کہ ایڈنا کی تجویز کے بالکل مطابق وہ اپنے آپ کو حرکت میں لے آئی، بجز اس کے کہ وکلا کے ساتھ کسی قدر زیادہ توجہ کے ساتھ برتاؤ شروع ہو گیا۔ ناگوار شرائط کو ذیلی قوانین اور کارپوریشن کی تشکیل کے سرٹیفکٹ دونوں سے نکال دیا گیا اور صرف یہ معقول شرط باقی رکھی گئی کہ عطیہ حاصل کرنے والے اشخاص "کسی ایسے نفع بخش کام میں مشغول نہ ہوں جو شعر گوئی کے ساتھ ساتھ جاری رکھے جانے کے لئے غیر موزوں ہو"۔ جس وقت تک میں ایڈنا کے خط کا جواب دینے کے لئے تیار رہا اس وقت تک مذکورہ تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔ لیکن یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے میں اپنا جواب نقل کرنا چاہتا ہوں۔

ڈیرایڈنا!

میں نے تمہارا وہ خط جو مجھے بحیثیت "چانسلر" لکھا گیا تھا وصول پایا یہ ضرور ہوا کہ وہ بجھے دیر سے ملا اور ایک گرم ملک میں جہاں میں ایک جائز تعطیل منانے گیا تھا۔ میں نے اسے پڑھ کر بڑی شرم محسوس کی کیونکہ میں ہر اس چیز سے جو تم نے اس میں رکھی تھی اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق متفق تھا، لیکن مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ آیا میں نے کبھی ذیلی قوانین یا امریکی شعراء کی اکیڈمی کی ہیئتِ تشکیل کے سرٹیفکٹ کو دیکھا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ مجھ سے ان خوفناک قوانین میں سے کسی پر عمل درآمد کرنے کے لیے نہیں کہا گیا اور نہ کوئی ایسا سخت فیصلہ کرنے کے لئے کہا گیا اس کی طرف ان دستاویزوں کے اقتباسات میں جو تم نے لئے ہیں اشارہ کیا گیا ہے۔ جو کچھ میں نے اب تک کیا ہے یہ ہے:

(الف) اس شاعر کے لئے ووٹ دیا جس کو ۵۰۰۰ ڈالر ملنے والے ہیں۔

(ب) اس چانسلر کے لئے ووٹ دیا جو کسی ایسے چانسلر کی جگہ پر کرنے والا ہے جس کی میعادِ عہدہ ختم ہو گئی ہے۔

(ج) ایک مختصر سی نفیس کاک ٹیل شراب کی پارٹی میں شرکت کی جو میرے پرانے دوست رجلی ٹارینس۔

کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی اور ان کو ایک نظم پڑھتے ہوئے سنا۔ جو انھوں نے نہایت سادگی کے ساتھ بہت اچھی طرح پڑھی۔

اب گھر آنے پر معلوم ہوا کہ تمہارے خط کے نتائج پہلے ہی برآمد ہو چکے ہیں، کم از کم وہ بدترین جلسے جن پر تمہیں اعتراض تھا نکال دیئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی شعرا کی اکیڈیمی مسز بلک پر مشتمل ہے جس کا شاعری کے لئے پُرخلوص جوش نہایت پسندیدہ اور دلکش ہے۔ وہ پدرانہ سختی اور نظم و ضبط کی قایل نہیں ہے جیسا کہ ان چند جملوں سے جن پر تم نے اعتراض کیا ہے ظاہر ہوتا ہے مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ جملے وہاں کیوں کر رکھ دیئے گئے۔ میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں کہ مسز بلک کا اصل منشا ان سے صرف یہ تھا کہ وہ اس امر کا یقین کر سکے کہ اس ادارے سے دراصل شاعری کی اعانت ہو رہی ہے نثر کی نہیں۔

۱۹۵۰ء تک امریکی شعرا کی اکیڈیمی چار سال کام کر چکی تھی اور اس وقت تک کسی امداد حاصل کرنے والے شاعر پر کوئی پابندی عائد کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اور کسی چانسلر کو سوائے اس کے کچھ نہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنا نام اس رائے دہندگی کی چٹ پر لکھ دے جو اس کو بذریعہ ڈاک بھیجی جاتی تھی اور جس کے ساتھ ٹکٹ لگا ہوا ایک جوابی لفافہ بھی آتا تھا۔ اس سال ایڈنا ملے کے حق میں ووٹ ڈالا گیا تھا۔ علاوہ ازیں ایڈنا کو اس وقت روپے کی بہت ضرورت تھی کیونکہ یوجین کا گزشتہ اگست میں انتقال ہو چکا تھا اور خود اس کی حالت اور اس کا مزاج ایسا ہو گیا تھا کہ اس کے لئے کوئی تخلیقی کام اور پھر منفعت بخش کام کرنا ناممکن تھا۔ اکیڈیمی نے روپیہ حاصل کرنے کے لئے ایک دلفریب ضیافت رٹز ہوٹل میں منعقد کی۔ مشہور برٹش جنرل ویول ممتاز ترین مقررین میں سے ایک تھے اور ایک کثیر مجمع انھیں دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے لئے وہاں جمع ہو گیا۔ مسز بلک بلاشبہ اسی ضیافت میں مذکورہ عطیہ کا اعلان کرنا چاہتی تھی اور میں اس خیال کے تحت کہ ایڈنا کے لئے یہ عطیہ نہ صرف مالی اعتبار سے بلکہ

شہرت کے اعتبار سے بھی بہت قدر و قیمت رکھتا تھا اس امر کا دل سے خواہشمند تھا کہ اس کا اعلان ہو جائے۔ لیکن مسز بلک کے نزدیک یہ صحیح نہ تھا کہ اس کے قبول کیے جانے کی یقین دہانی کے بغیر اعلان کیا جائے کیونکہ ایڈنا نے ان تبدیلیوں کو جو ذیلی قوانین میں کی گئی تھیں کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ اس مسئلہ پر اس سے اسپیکر کی میز پر گفتگو کرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایڈنا کی ضمانت کے لئے پیش کیا کیونکہ مجھے کافی بھروسہ تھا کہ وہ اتنی بااخلاق اور سمجھدار ضرور ہے کہ اس عطیہ کو قبول کرلے گی۔ لیکن مسز بلک کو اطمینان نہ ہوا اور آخر کار میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ میں اسٹرلنڑ. مین فون پر اس سے بات کرکے اس کی یقین دہانی حاصل کرلوں۔ اس سے بات کرنے کا موقع حاصل کرنے میں مجھے تقریباً ایک گھنٹہ لگا کیونکہ اس کے فون کا رسیور نیچے رکھا تھا اور ایک ہمسایہ کو اس کے پاس اپنی کار میں جاکر رسیور اوپر رکھنے کے لئے کہنا پڑا جب میں نے اس سے بات کی تو اسے سنگِ خارا پایا۔ اسے امریکی شعرا کی اکیڈیمی سے کوئی واسطہ رکھنا منظور نہ تھا اور اس کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہ تھی کہ انھوں نے اس کے کہنے پر بعض تبدیلیاں کردی تھیں۔ مزید یہ کہا "میکس یہ سچ ہے کہ مجھے روپیہ کی سخت ضرورت ہے لیکن میں یہ روپیہ نہیں لے سکتی، اگر میں نے اس معاملہ میں اپنے اعلےٰ اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ تو میں خوش نہ رہ سکوں گی۔ بحث و تمحیص سے کچھ فائدہ نہیں ہم نے پندرہ منٹ اور بحث و تمحیص میں گزارے لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے نزدیک اس معاملہ میں کسی بہ قیمتِ اصول کا سوال درپیش تھا، لیکن میرے نزدیک اس کے موقف کے لئے

کوئی ٹھوس دلیل پیش نہ کی جا سکتی تھی میں، سپیکر کی میز پر اپنے کھانے پر جو سرد ہو چکا تھا واپس آیا، میرے جذبات ناخوش گوار طور پر مخلوط تھے۔ ایک طرف تو میرے دل میں اس کے کردار کی غیر متزلزل استواری کی قدر تھی اور دوسری طرف مجھے احساس تھا کہ اس نے کسی ایسی چیز سے انحراف کیا ہے جسے میں اپنے دل کی گہرائی میں صحیح سمجھتا تھا اور میرے خیال میں اس چیز کو "سمجھ بوجھ" سے بہتر نام نہیں دیا جا سکتا تھا جب لیونورا اسپیئر (Leonora Speyer, ) نے اس کے جواب کو جسے میں نے مسز بلک سے بیان کیا سُنا تو اس نے کہا "وہ احمق ہے"، اور میں اس سے اختلاف نہ کر سکا۔

ایڈنا کے کردار میں اخلاقی تشدد کا جو شائبہ تھا اس کا نتیجہ خود اس کی ذات کے لئے مذکورہ واقعہ سے بھی زیادہ تباہ کن اس طرح ثابت ہوا کہ دوسری جنگِ عظیم کے نازک موقعوں پر اس نے عام پروپگنڈے کو نہایت ایمانداری کے ساتھ نظم میں منتقل کرنا شروع کر دیا، اس قسم کی نظموں سے اس کو جو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ سب ریڈ کراس کے لئے زخمیوں کی گاڑیاں خریدنے میں صرف کر دیتی تھی۔ وہ بےحد پرخلوص تھی۔ اتنی پرخلوص کہ اگر اس کے خیال میں یہ بات آجاتی کہ وہ کسی اسلحہ ساز فیکٹری میں کام کرنے کے لئے جا سکتی ہے یا بنڈل باندھنے یا سپاہیوں کے لئے موزے بُننے کا کام کر سکتی ہے تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتی۔ اگر وہ ایسا کرتی تو جنگ کی جدوجہد کے لیئے یہ تحفہ ناقص شاعری سے زیادہ بہتر ہوتا۔ لیکن یہ اپنی ذات کی قربانی نہ ہوتی جس کا مطالبہ نیو انگلینڈ کے متشدد اخلاقی نظریات کرتے ہیں۔

ایڈنا نے اپنے نام کو اتنا مشہور سمجھ لیا ہو گا کہ اس کی نظمیں اخباروں میں شائع

ہو کر ملک کو جنگ کے لئے آمادہ کرنے میں اہم حصہ لیں گی، لیکن میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ اس کا یہ کہنا کہ "میرے پاس صرف ایک چیز ہے جو میں ملک کی خدمت کے لئے پیش کر سکتی ہوں اور وہ شاعری کے میدان میں میری شہرت ہے۔" میرے نزدیک پروپیگنڈے کی جدید دماغی بیماری کی نہایت ناقص پیداوار ہے۔ یہ نیکی کی کجروی ہے اور احساس فرض کی دیوانگی بھی، اور قدرتی طور پر اس کا نتیجہ اعصابی انتشار کی صورت میں نمودار ہوا۔

اس نے اپنی بیماری کے اسباب ایڈمنڈ ولسن کو بتانے کے سلسلے میں لکھا ہے۔ "پانچ سال تک سوائے پروپیگنڈے کو نظم کرنے کے میں نے کچھ نہیں کیا، اور میں تمھیں اپنے ذاتی تجربہ سے بتا سکتی ہوں کہ دنیا میں کوئی چیز ایک اچھے شاعر کے اعصاب پر اتنا مضر اثر نہیں ڈال سکتی جتنا کہ گھٹیا درجے کی شاعری۔"

اپنی کتاب تیروں کو چمکاؤ ( Make Bright the Arrows. )

جس کا سرورق نہایت خوبصورت تھا ہمارے پاس روانہ کرتے ہوئے اس نے کتاب کے ایک خالی صفحہ پر یہ دردناک کتبہ لکھا، "بخدمت میکس اور ایلینا جو اس کتاب کے بہت سے خراب مصرعوں کو پسند نہ کریں گے، لیکن وہ اس مقصد کو پسند کریں گے جس کی تکمیل کے لئے یہ لکھی گئی ہے اور وہ میری راسخ الغت و محبت کی اس توثیق کو پسند کریں گے۔۔۔" بہت سے امریکی مصنفین نے (ان میں سے اکثر نے) بعض اوقات اپنے فن کی پاکیزگی کو روپیہ کمانے کی خاطر اعلیٰ معیار سے گرا دیا ہے۔ کم از کم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایڈنا کا گناہ شریفانہ قسم کا تھا، بہرحال وہ گناہ ضرور تھا، بعد میں اس نے تسلیم کیا کہ ایثار و قربانی کی یہ فراوانی ایک غلطی تھی

اور اسے اس غلطی پر بہت افسوس تھا، لیکن یہ افسوس بعد از وقت تھا، وہ اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل نہ کر سکی، اس نے بعد ازاں کوئی عظیم نظم نہیں لکھی۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اسے بعض شرائط سے محدود کرنا چاہیئے یا اسے زیادہ احتیاط سے بیان کرنا چاہیئے۔ جب میں نے صحیح بارہت کے متعلق ایڈنا کے خیالات کی بابت یہ کہا تھا کہ وہ سختی اور درشتی کا پہلو لیئے ہوئے تھے (یا غالباً میں نے کٹرپن کا لفظ استعمال کیا تھا) تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ شاعر کے کردار کے متعلق ایڈنا کے اعلیٰ تصوّر کو بے وقعت ثابت کیا جائے۔ وہ شیلے[1] کی طرح یہ یقین رکھتی تھی کہ شاعر کو اپنے زمانہ بلکہ ہر زمانہ کی سیاسی اور معاشرتی جدوجہد میں وہ موقف اختیار کرنا چاہیئے جو آزادی اور انصاف پر مبنی ہو۔ وہ اپنے اس عقیدے میں بہت زیادہ اور بڑی دلیری کے ساتھ قایم تھی یہاں تک کہ اس نے بوسٹن کا سفر اختیار کیا اور قید و بند اور اپنی عظیم ہردلعزیزی کے برباد ہوجانے کے خطرہ میں پڑ کر "عوامی اظہارِ ناراضی" کے سلسلے میں عوام کے جلوس میں شریک ہوئی تھی جو ۱۹۲۷ء میں ساکو (.Sacco) اور وینزیٹی (.Vanzeth.i) کی سزائے موت کے خلاف نکالا گیا تھا۔ اس پرخطر اور مشتبہ کارروائی میں اس کی شرکت اس کے ابتدائی ادبی تنقید نگاروں کی اس تنقید کا کہ وہ ایک آوارہ تماشائی لڑکی تھی اور امریکی ادب میں اس کا کام نوجوانوں کو ان کی نوجوانی کا احساس دلانے سے زیادہ نہ تھا ایسا جواب ہے جو ان لوگوں کے جواب میں لکھی ہوئی میری تحریروں سے بہت زیادہ زوردار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی بھی یہ فخر نہیں کر سکتا کہ وہ اس پُرخطر موقع پر بیکن ہل (.Beacon Hill) پر

---

[1] دیکھو نوٹ مترجم صفحہ ۔

پہونچا ہو یا کبھی اپنی مایۂ ناز پختگی کا ایسے ہی دلیرانہ انداز میں مظاہرہ کیا ہو۔ اگرچہ اس کے اشعار نزاکت لئے ہوئے ہیں اور اتنے ڈرامائی نہیں جتنے غنائی ہیں تاہم ایڈنا ان شعراء کے زمرہ میں شامل ہے جن کی کتابیں پڑھ کر ہم ان کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں ۔ ایسے شاعر جو دُنیا میں اہل دماغ اور صاحب قوت تھے اور محض قافیہ پیمائی کرنے والے نہ تھے۔

شاید یہ امر ناگزیر تھا کہ غنائی نظم کی آزادروی کا مذکورہ قسم کے ضابطۂ اخلاق کے ساتھ گٹھ جوڑ کبھی کبھی زاہدانہ درشتی یا مذہبی تشدد کی شکل اختیار کرلے اور نتیجتہً وہ میری کشیدگی کا باعث بنے۔ شاید یہ میری ہی طبیعت کی نرمی کا نتیجہ ہو یعنی میری اس خواہش کا کہ ہر قیمت پر معاملات خوش گوار رہیں کہ میں ایڈنا میں کسی غیر معتدل تیزی اور درشتی کے بجائے اس کی طرف زاہدانہ درشتی منسوب کر رہا ہوں۔ بہر صورت نازی ازم کے خلاف جنگ کرنے میں جو جوشِ عقیدت اس نے دکھایا میں اس پر نکتہ چینی نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف اس کی ایک تباہ کن غلطی پر اعتراض کر رہا ہوں جو زاہدانہ درشتی اور مذہبی جنون سے بھی بدتر تھی اور وہ غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے فن کی دیانت داری کو مذکورہ جنگ پر قربان کر دیا۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ نفس کشی کے مذکورہ تشدد مظاہرے سے کافی پہلے اس کے غنائی کمال کے سرچشموں کا بہاؤ مسدود ہو گیا تھا اور بالکل ممکن ہے کہ مذکورہ نفس کشی کے اسباب میں یہ بات بھی شامل ہو اس کی کتاب "نصف شب کی گفتگو" (Conversation at Midnight.) جو

بالکل سادہ اور بے اثر نثر اور کچھ نظم پر مشتمل ہے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد ایک عظیم شاعرہ کی حیثیت سے اس کی زندگی ختم ہو گئی۔ مجھے اس انحطاط کے تمام اسباب کا علم نہیں ہے۔ اس تمام عرصہ میں وہ زیادہ تر پراسرار طور پر علیل نظر آتی تھی اور اپنے اخلاقی نظریات کے باوجود اس زمانہ میں اس کے اندر سپاہیانہ اوصاف کا فقدان تھا۔ اس نے بیمار بنے رہنے کی عادت پیدا کر لی اور بلا لحاظ نفع و نقصان اس سے فائدہ اٹھاتی وہ زیادہ تر اوپر کی منزل میں اپنے کمرہ میں رہتی تھی اور ذرا سی ناگوار خاطر بات پر نیچے کی منزل سے اوپر اپنے کمرہ میں چلی جاتی تھی۔ کسی شور کرنے والے مہمان کی آمد کسی ہمسائے یا دوست کا بے وقت آنا اسے اوپر بھگانے کے لیئے کافی تھا۔ آخری مرتبہ جب میں اسٹیپل ٹاپ میں قیام کے لئے ٹھہرا تو مجھے ایک سائن بورڈ کو کسی قدر غصہ سے نظر انداز کرنا پڑا جو اس کے پھاٹک کے قریب ایک درخت پر لگا ہوا تھا کہ "ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر کرنا ضروری ہے۔" ایڈنا بچپن ہی میں بدمزاج ہو گئی تھی ابتدائی عمر ہی میں جب اس نے اپنے زندگی کو شاعری کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ بھی سمجھ لیا کہ وہ خاص طور پر نازک اعصاب رکھنے والی لڑکی یا کسی قدر فوق البشر تھی لیکن اس انداز فکر سے اسے تکالیف پر غلبہ پانے میں کوئی مدد نہ ملی اس نے آپ کو شیر خوار بچہ سمجھ لیا تھا اور یوجین نے بھی اس کی اسی انداز میں نگہداشت کی۔ ہر اس عذر کو جو اس کی قوت صرف نہ کرنے کے لئے پیش کیا جاتا تھا بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قوت محفوظ رکھنے کی جانفشاں کوشش میں بہت زیادہ قوت صرف ہو جاتی ہے۔ دائم المریض کا

لفظ اس کے اندازِ فکر کو بیان کرنے کے لیئے زیادہ ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ اسٹیپل ٹاپ میں داخل ہونے پر آدمی یہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی نہایت نازک چینی کی چیز جو بے حد بیش قیمت ہے اوپر کی منزل میں غیر محفوظ حالت میں رکھی ہوئی ہے اور اگر ہوا کی لہریں بھی ذرا تیز ہو جائیں تو اس کا توازن بالکل جاتا رہے گا۔ یوجین یقیناً ہوا کی لہروں کو جتنا چاہتا تھا متحرک کر سکتا تھا، اور ایک پر شور و شغب ورزشی بلند آواز سے ہنسنے والا شخص ہونے کے باعث وہ اس کے سکون میں بہت کچھ خلل ڈالتا تھا، لیکن وہ اپنے اس نازک سرمایہ کی "اپنے بچہ" کی طرح کہ بعض اوقات وہ اسے کہا کرتا تھا ایسی حفاظت کرتا تھا کہ گویا وہ اس خزانہ کا محافظ اژدہا ہے۔ کسی شاعر نے کبھی ایڈنا سے زیادہ محفوظ زندگی بسر نہ کی ہوگی، لیکن مجھے شک ہے کہ اس صورت حال نے اس کی شاعری کی پیداوار میں اضافہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ ایڈنا کی شاعری کے تنزل کا جو نہ صرف اس کی کمیت میں بلکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی کیفیت میں بھی ہوا۔ ایک دوسرا ناخوش گوار سبب بھی تھا جس کا بیان کرنا میرے لئے خوش کُن نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ ہماری باہمی دوستی اور اس کی شاعری پر اثر انداز ہوا اس لیئے میں اسے بیان کرنے سے گریز نہیں کر سکتا۔ وہ اور یوجین اپنی محبّت کے ابتدائی ہجوم جذبات میں دیہات میں خلوت کی زندگی بسر کرنے کے زیادہ شائق ہو گئے تھے۔ نظریہ یہ تھا کہ ایڈنا نظمیں لکھے گی اور ستاروں کا مطالعہ کریگی اور یوجین کاشت کا کام کرے گا اور ایڈنا کی شاعری کو فروغ دینے اور اسکی نظموں کو فروخت کرنے کا انتظام کرے گا۔ برسبیلِ تذکرہ اس کام کو اس نے بڑی

ماہرانہ ہنرمندی اور کامیابی سے انجام دیا، اس طرح وہ قدرتی مناظر کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ خوشی کی زندگی بسر کریں گے اور علائق دُنیوی انھیں زیادہ نہ گھیریں گے اور پھر خاص طور پر دارالسلطنت کے جھگڑوں سے وہ بالکل دور رہیں گے۔ محبت میں مبتلا ہونے والے بہت سے لوگ ایسا خواب دیکھتے ہیں اور کچھ عرصہ کے لئے اس کو عملی جامہ پہنا لیتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں پر جن کی پرورش ولولہ انگیز تفریحات، معاشرتی و خود پسندانہ لطف اندوزی اور طویل شاموں میں "کچھ نہ کچھ کرنے" کی غذا پر ہوئی ہو یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ حقیقت اور خواب بالکل دو مختلف چیزیں ہیں۔ رُومانی زندگی وقت گزرنے پر نظم و ضبط کی پابند ہو جاتی ہے اور زندگی کی تازگی برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یوجین اور ایڈنا نے اس مقصد کے لئے یہ کیا کہ شراب سے اپنے دلوں کو متحرک اور دماغ کی جھلیوں کو سست بنانے لگے۔ یہ ایک مختصر راستہ ایسی حالت پیدا کرنے کے لئے ہے جو شاعرانہ انبساط سے قریب ہے اور جس میں اصل عمل کی جانب قدم اُٹھائے بغیر احساسات تیز ہو جاتے ہیں۔ شراب سے جیسا کہ ہر شخص کے علم میں ہے بہت کچھ لطف حاصل ہوتا ہے اور ایلینا اور میں نے یوجین اور ایڈنا کے ساتھ اس لطف میں بارہا شرکت کی۔ لیکن یہ علم رکھنے کے باعث کہ اس لطف کی قیمت کیا ادا کرنی پڑتی ہے ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ وہ اس لطف اندوزی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ ان کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے یہ چیز ناگزیر ہو گئی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ ایڈنا سے کہا "اگر میں پورے سال اسٹیپل ٹاپ میں

رہوں تو مجھے معاشرتی سرگرمیوں سے پیدا ہونے والے ہیجان کی کمی محسوس ہونے لگے گی جس کی مجھے اپنا کام ختم کرنے کے بعد ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے پرجوش لہجہ میں جواب دیا کہ "نارمنڈل کے طلوع سے پیدا ہونیوالا سرور و ہیجان میرے لئے کافی ہے"

میرے دل میں اس کے لئے یہ جواب تھا: "پیاری ایڈنا! اس وقت جب کہ تم کاک ٹیل شراب کے پانچویں گلاس سے سرور حاصل کر رہی ہو تم یہ رومانی جواب دے رہی ہو" لیکن یہ ان کثیر جوابوں میں سے ہے جن کو میں نے اپنی زندگی میں زبان پر لانے سے گریز کیا ہے۔

لیکن اس کے بعد ایک خط میں جو کسی دیگر موضوع پر تھا میں نے یوجین اور ایڈنا دونوں کو لکھا کہ وہ بہت زیادہ مے نوشی کرتے ہیں۔ انھوں نے فوری طور پر جواب بھیجا اور اس میں تسلیم کیا کہ میرا کہنا درست تھا اور ایسا کہنے کی جرأت پر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ اپنے طرز زندگی کی اس طرح از سر نو تنظیم کر رہے ہیں کہ اس غلط طریقہ کی اصلاح ہو جائیگی۔

در اصل انھوں نے کبھی اس کی اصلاح نہ کی، ان کا طرزِ زندگی بد سے بدتر ہوتا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایڈنا کی تیز ذہانت اس کیمیاوی مےکی بدولت کند ہو گئی۔ اگرچہ اس کے سوا ہر طرح اس کی نگہداشت اعلےٰ طریقہ پر ہو رہی تھی اس کی بدولت ہم چار اشخاص کی گہری دوستی بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی، کیونکہ پُرانی خوش گوار بات چیت کا انحصار اب ابتدائی گرمجوشی بڑھانے کے عمل پر تھا؛ اور اس کے لئے اتنی شراب کی ضرورت ہوتی تھی

کہ ایلینا اور میں اپنی روزانہ عادت کے مطابق نہ پی سکتے تھے یا پینا نہیں چاہتے تھے۔ ہمارا آنا جانا رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اور اس طرح ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے گئے۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے زیادہ دور ہو گئے کہ جب ۱۹۴۹ء میں سرطان شکم کے آپریشن کے بعد بوسٹن میں یوجین کا انتقال ہوا تو مجھے اس سانحہ کا کئی ماہ تک علم نہ ہوا۔

جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے ایڈنا کو فون کیا اور کہا کہ ایلینا اور میں سٹیپل ٹاپ میں آ کر اس سے ملیں گے۔ اس نے جواب دیا "ہاں ٹھیک ہے لیکن براہ کرم یہاں رات گزارنے کا منصوبہ نہ بنایا جائے کیونکہ بعض اوقات میں بے قابو ہو جاتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے ایسی حالت میں دیکھو۔"

اس کے اس جواب کے بعد ہمارے لیے اپنی پرانی دوستی تازہ کرنے کا بہت کم موقع دیا گیا اور میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ دراصل موجودہ اندوہناک حالات میں ہمارے ساتھ دوستی کو ازسرنو تازہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تنہا بھی جا سکتا تھا اور بعض اوقات مجھے پشیمانی ہوتی ہے کہ میں کیوں نہ گیا، لیکن اس کی گفتگو میں جس تن آسانی کی کیفیت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس نے اس کے کردار کی اس خصوصیت کے متعلق میرے احساسات بیدار کر دیئے جسے میں بہت ہی کم پسند کرتا تھا۔ میں یہ پسند نہ کرتا تھا کہ اس کا اپنے آپ کو ایک بچہ تصور کرنے کا رجحان تنزل کر کے پشیمانی میں تبدیل ہو جائے۔ میں شاید ایک بزدل انسان تھا، یا کیا میں اتنا عقلمند تھا کہ میں نے ایک حسین اور پرشوکت یاد کو برقرار رکھنا پسند کیا جو اس وقت زمانۂ رفتہ کی چیز ہو چکی تھی؟

# سنتیانا ایک خانقاہ میں

اپنے عہدِ شباب ہی سے جب کہ اس نے میرے اس تذبذب کی کہ یونانیوں کی حکمت و دانش عیسائیت کی حکمت و دانش کے مقابلہ میں قابلِ ترجیح ہے تصدیق کر دی تھی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جارج سنتیانا میرے دل سے بہت قریب ہے، کم از کم ذہنی ارتقا کا جو راستہ میں طے کر رہا تھا اس میں وہ میرا ہر وقت کا ساتھی نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی بہت سی تصانیف گہرے جذبۂ تحسین کے ساتھ مطالعہ کی ہیں اور اس نے بھی کم از کم میری چھ کتابوں کو پڑھا ہے اور ان کے متعلق مجھے بڑے خیال آفریں اور ہمت افزا خطوط لکھے ہیں۔ ایک خط میں اس نے تصور سے کام لے کر میرا ایک "اکثر یاد آنے والا" خاکہ کھینچا جس میں میں ہارورڈ میں بحیثیت ایک طالب علم کے اس کے کمرۂ درس میں رواقی فلسفہ کے معتقدین اور اسپی نوزا (.Spinoza) کے بارے میں ایک سانیٹ پڑھ رہا تھا۔ میں کبھی ہارورڈ کی درسگاہ میں اس کے درس میں شریک نہیں ہوا اور نہ کبھی میں نے رواقیوں، اور اسپینوزا پر کوئی نظم لکھی، لیکن یہ بات میں نے اس سے نہ کہی۔ اگر مجھ میں اور اس میں کچھ اختلاف ہوتا تو میں ضرور یہ حقیقت اس پر ظاہر کر دیتا۔ مجھے اسی میں لطف آیا کہ میں

اس کے گوناگوں تجربات میں ایک مبہم سی شے بنا رہوں۔ میں نے جو اپنے زمانہ میں اس کی موجودگی اور اس کی کتابوں سے بیش بہا نعمت حاصل کی اس کو صرف ذہنی اور تصوراتی رفاقت ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

میں سنتیانا سے پہلی مرتبہ اُس وقت ملا جب اس کی عمر اٹھاسی سال کی تھی۔ میں نے "نیلی راہباؤں کی خانقاہ" (Convent of the Blue Nuns.) میں جو روم میں کولیسیم کے عقب میں پہاڑی پر واقع ہے اس سے پانچ یا چھ بار ملاقات کی۔ "نیلی راہبائیں" آئرلینڈ کی پرہیزگار لڑکیوں کا ایک گروہ ہے جو زردی اٰئل نیلے رنگ کی پوشش سر پر پہنتی ہیں۔ وہ ادارہ جو ان کے زیر نگرانی چل رہا ہے اس کی دیواریں بہت اونچی اور مرعوب کن ہیں اور اس کو کاویری ہسپتال (Calvary Hospital.) کہا جاتا ہے۔ اندر کی طرف سے یہ عمارت صلیب کی شکل کی ہے اس کا ایک بازو تو وہ خانقاہ ہے جہاں یہ تیمارداری کرنے والی نرسنگ سسٹرز (Nursing Sisters.) رہتی ہیں۔ صلیب کا اصلی حصہ وہ شفا خانہ ہے جہاں یہ بیماروں کی خدمت کرتی ہیں۔ دوسرا بازو ایک مہمان خانہ ہے جس میں تندرست لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس کو "آسپیزیو" کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اتنا مرفہ حال تھا کہ اپنے لیے ایک شاندار مکان خرید سکتا تھا لیکن پچھلے دس سال سے وہ اسی مہمان خانہ کے ایک کمرہ میں قیام کیے ہوئے تھا۔ اس میں علیحدہ غسل خانہ نہیں تھا۔ ایک زرد پھول دار چھینٹ کا پردہ اس کے بستر اور غسلخانہ کو عام نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے پڑا ہوا تھا۔ یہ بیچ کا پردہ اتنا نیچا تھا کہ بستر پر لٹکی ہوئی صلیب بھی نظر آتی تھی۔ اس کی زندگی کا دیگر اثاثہ صرف ایک میز، چند کرسیاں، کتابوں کی ایک الماری

اور ایک آرام کرسی پر مشتمل تھا۔ ڈو اونچی کھڑکیوں میں سے باہر کی گلی نظر آتی تھی۔ جس میں سے دوسری جنابِ عظیم کے زمانہ میں حملہ آور یا مدافعت کرنے والی فوجیں روم سے باہر نکلتی یا اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آتی تھیں ان فوجوں کی وجہ سے سنتیانا کو کچھ کوفت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اخبارات اور تازہ رسالے پڑھا کرتا تھا اور واقعاتِ حاضرہ سے پورے جوش کے ساتھ باخبر رہتا تھا، لیکن وہ غیر ضروری طور پر متفکر نہیں ہوتا تھا۔

انتیس سال کی عمر میں اس میں ایک باطنی انقلاب پیدا ہوا تھا۔ یہ تصورات کی دُنیا میں ایک طرح کی گوشہ گیری کا رجحان تھا جس کو تبدیلیٔ مذہب سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ وہ اس تبدیلی کو "تمام ارضی تقاضوں اور وابستگیوں سے کنارہ کشی" کہا کرتا تھا۔ تھوڑی مُدت میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس کی پیاری بہن سوسانہ نے شادی کر لی تھی، اس کو اپنے ایک بچپن کے رفیق جس سے وہ اپنے چھوٹے بھائی بلکہ اپنی ہی ذات کی طرح محبت کرتا تھا انتقال کی خبر ملی تھی، اور وہ ایک جانور کی طرح جو اپنے کھونٹے سے بندھ کر بے بس ہو جاتا ہے وہ زندگی کی بندشوں میں جکڑ گیا تھا۔ اس فقرے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو ہارورڈ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھانے کے لئے مدرس کی جگہ مل گئی تھی۔ ان پریشانیوں نے حیاتِ مادی سے اس کے فطری تنفّر سے مل کر اس کی باطنی ہستی کو ظاہری ہستی سے بالکل الگ کر دیا اور وہ خارجی اشیاء سے بڑی حد تک بے تعلق سا ہو گیا۔ اس وقت بھی جب کہ میں اس سے ملا وہ خارجی اشیا سے مقابلتاً بے تعلق ہی تھا گو مطلق طور پر نہیں۔

میں مشہور شخصیتوں کی نجی زندگی کی تفصیلات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا

ہوں، چنانچہ جب میں خانقاہ کے بڑے دروازہ کے قریب پہنچا تو مجھ میں کچھ جھجک سی پیدا ہوئی۔ لیکن میں نے سنتیانا کے متعلق اتنی باتیں سُن لی تھیں کہ مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ اس سے ملاقات کا جو ایک موقع ہاتھ آیا ہے اس کو ضائع کر دوں۔ اگر ناظرین میں اتنی قوت صبر ہے (اور اگر نہ ہو تو پھر کسی فلسفی کے حالات معلوم کرنے کی زحمت ہی کیوں کی جائے) تو میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس وقت میں اس دروازہ کے قریب پہونچا تو میرے خیالات کیا تھے . . . .

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کالج سے بی۔اے کرنے کے ایک سال بعد میں نے اس کی ایک تصنیف کا مطالعہ کیا تھا، اس وقت وہ چالیس سے زیادہ سال کا تھا اور اس نے شعر کہنا بند کر دیا تھا اس لئے کہ اس کے اشعار کو کوئی نہیں پڑھتا تھا۔ اس نے اب شاعری، مذہب اور محبت کے متعلق کچھ خیالات لکھنے شروع کئے تھے۔ اس کے خیالات صاف و شفاف تھے اور ایسی خوبصورتی کے ساتھ بیان کئے گئے تھے کہ اس سے بہتر شگفتہ اسلوب میرے مطالعہ میں نہیں آیا، لیکن اور بہت سی صاف تحریروں کی طرح یہ بھی گرمی اثر سے محروم تھے۔ اس کا اعلیٰ تصور عشق اس بات کا متقاضی نہ تھا کہ محبوب کا قرب حاصل کیا جائے یا اس کو چھوا بھی جائے بلکہ وہ اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ ڈینٹے Dante. کی محبوبہ بیٹرس (Beatrice.) کی طرح اس کا محبوب دنیا سے پردہ کر جائے اور صرف عالم خیال کی زینت بنا رہے۔ اس کی تصنیف سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ شعر زندگی کی حقیقی اور ٹھوس اقدار کا عکاس نہیں ہے بلکہ روح کی محض ایک عارضی اور غیر یقینی ہم آہنگی ہے جو حقیقی زندگی کا مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ زندگی جمود

جدل" کی عام کیفیت میں بسر کی جاتی ہے۔

چونکہ میں اس وقت اپنی ایک تصنیف "لطفِ شعر" (Enjoyment of Poetry.) کی تالیف میں مشغول تھا اور میرے خیال میں حیاتِ انسانی کے حقیقی تجربات اس فن کی بنیاد ہیں اس لئے میں اس کی کتاب "شعر اور مذہب" (Poetry and Religion.) کا بغائر مطالعہ نہ کر سکا لیکن اس کے دل کش اسلوب نے مجھے مسحور کر دیا اور میں بمشکل اس کی سحر بیانی سے آزادی حاصل کر سکا۔ اس کے بعد سنتیانا نے اُنتیس کتابیں شائع کیں اور اس کے حسین اندازِ بیان نے بہت سے لوگوں کو گرویدہ کر لیا ہے۔ اس کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں عالمِ جوہر (The Realm of Essence,) عالمِ مادّہ (The Realm of Matter.) عالمِ روح (The Realm of Spirit.) یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام کتابیں اعلیٰ معانی کی حامل ہیں اور ان میں فلسفہ کا ایک پورا نظام موجود ہے۔ ہمارے امریکی اہلِ علم تو اس فلسفہ سے بہت مرعوب ہوئے ہیں۔ آپ ایسے حضرات کا شمار کرنا چاہیں جو یہ بتا سکیں کہ اس فلسفہ کی ماہیت کیا ہے تو صاحبانِ علم و دانش میں بھی ایسے لوگ بہت کم ملیں گے، البتہ اس نکتہ پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ دلکش اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے، اور چونکہ اس طرزِ تحریر کی بنا پر سنتیانا بھی افلاطون۔ ہابس، شوپنھار اور چند دیگر فلسفیوں کے ہم پلہ شمار ہونے لگا ہے اس لئے اس سے کسی حد تک مرعوب ہونا واجب ہے۔

پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سنتیانا کو سمجھنے کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ ہم کسی قدر بے احترامی اختیار کریں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم فلسفے کا احترام

ترک کردیں۔ میری نظر میں فلسفہ کے نظام کسی سنجیدہ یا غیر سنجیدہ شخص کے بے چون و چرا تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ دماغی تجسس اور فن کا اعلیٰ نمونہ ہونے کی وجہ سے ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ کائنات کا علم جو ہمیں حاصل ہے وہ محدود ہے اور بتدریج جزواً جزواً حاصل ہوا ہے اور اسی طریقہ سے حاصل ہوتا رہے گا۔ اگر ہم اس کو ایک عام کلیہ میں مقید کرنا چاہیں تو اس کے لئے ہمیں اپنے ذہنی طریقۂ کار میں ایسے بھدے اور حیلے اختراع کرنا پڑیں گے جو ظاہر ہونے کی صورت میں عیاری پر مبنی قرار پائیں گے۔ اس لئے میں نے ہستیٔ مطلق کے ان عوالم میں سے کسی کا مطالعہ دل سے نہیں کیا جن کی سنتیانا نے نشان دہی کی ہے۔ خود اس فقرہ ہی میں ایک قسم کی پُرفریب ترغیب موجود ہے۔ کسی عالم کا وجود نہیں ہے بجز اس کے کہ اقلیم آسمانی اور اقالیم دُنیا کی مدھم سی آواز بازگشت سننے میں آتی ہے، لیکن ان آوازوں سے قطع نظر کرکے اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس کی تعلیمات دراصل واضح اور قابل فہم ہیں۔ اس بات میں وہ زیمقراطیس ( Democritus. ) سے متفق الرائے ہے کہ ہر شے میں جو چیز متحرک پائی جاتی ہے اسی کا نام مادہ ہے، لیکن اس نے یہ بھی کہا ہے کہ مادہ سے روحیں پیدا ہوتی ہیں اور روحوں کے اعلےٰ مقاصد ہوتے ہیں۔ ہر روح کی مسرّت اس بات میں ہے کہ جو مقصد بھی اس کی انفرادی فطرت سے میل کھاتا ہے اس کے حصول میں متواتر جدوجہد کی جائے پرسکون مسرت اور یکے بعد دیگرے آنے والی خوشیوں میں جو فرق ہے اس پر وہ بہت زور دیتا ہے اور زیمقراطیس کی طرح مادیت پر اخلاقی فراست کی بنیاد

قائم کرتا ہے۔ اس کی تصانیف کے مطالعہ سے جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں جمالیات کے متعلق میرے ابتدائی خیالات جو سقراط، افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ اب پختہ ہو گئے مان یونانی فلاسفروں نے ہمدردی کے مطمح نظر کو اپنی تعلیمات میں، خاص مقام نہیں دیا ہے، لیکن اخلاقی مطمح نظر کی بحث میں انھوں نے ایک سادہ دیانت دارانہ اور دنیادارانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے جو مجھے صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس قسم کے کچھ سنجیدہ خیالات اپنے دماغ میں لئے ہوئے میں انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی پرانی دیواروں کے پاس سے گزرتا ہوا خانقاہ کے بڑے گنبد کے پاس پہونچا۔ مجھے یہ خیال تھا کہ اندر داخل ہونے میں مجھے کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک غیر معمولی ذہانت والے انسان نے جو دنیا سے الگ تھلگ عالمِ استغراق میں وقت گزار رہا تھا متجسّسانہ طبائع کی دخل اندازی سے محفوظ رہنے کے لئے کافی انتظام کیئے ہوں گے۔ نیلی راہبہ نے ایک معمولی سے اشارے کے ساتھ یہ کہہ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا "اس غلام گردش میں ہو کر سیدھی طرف آخری دروازہ میں چلے جاؤ"۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ عظیم المرتبت انسان ڈھیلا فلالین کا پاجامہ پہنے خوابگاہ میں پہننے کے جوتے پاؤں میں ڈالے اور ایک غسل کا پرانا بھورا لبادہ اوڑھے ہوئے میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور پراپرٹیس ( Properuus. ) کی ایک نظم کا ترجمہ کر رہا تھا۔ جوں ہی میں اندر داخل ہوا وہ بڑی خوش اخلاقی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا نام بتایا اور اس کو یاد دلایا کہ ہمارے درمیان سلسلہ

مراسلت قائم ہے۔ اس نے کہا "معاف کیجئے۔ زمانۂ قریب کی یادیں میرے حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں لیکن آپ کو دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔

اس کی مسکراہٹ بمنزلۂ قہقہہ کے تھی۔ ہم بیٹھ گئے اور سلسلۂ گفتگو کچھ ایسی بے تکلفی کے ساتھ شروع ہوا کہ اگر وہ مجھے اچھی طرح سے پہچان بھی جاتا تو اس سے زیادہ پُرتپاک گفتگو نہ ہوتی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے میری طرف تعجب خیز توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔

"اوہ اب مجھے یاد آیا تم کون ہو! تم میرے سامنے بیٹھا کرتے تھے لیکن میں تم سے بہت خوش تھا۔ اس کے برعکس تمہارے ساتھی اپٹن سنکلیر (Upton Sinclair.) سے مجھے اختلاف رائے بھی تھا اور میں اسے پسند بھی نہ کرتا تھا!"

میری حیرت انگیز فلسفیانہ اور غیر سیاسی تصانیف کا عمیق مطالعہ کر چکنے کے بعد اس کے یہ الفاظ مجھے کچھ زیادہ خوش نہ کر سکے، لیکن تقریب گفتگو کے لئے یہ ایک مبارک ابتدا تھی اور آگے چل کر اس قسم کی چھ ملاقاتیں ہوئیں میں نے ان ملاقاتوں کے درمیان اس کے دو تذکرے جو "اشخاص و مقامات" (Persons and Places.) اور "درمیانی فصل" (The Middle Span.) کے نام سے شائع ہوئے تھے ان کو پڑھ ڈالا اور ان کا مطالعہ ان باہمی گفتگوؤں میں مفید ثابت ہوا۔

سب سے پہلے ہماری گفتگو فنِ شعر اور مذہب پر ہوئی۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ فنِ شعر پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں ہم میں کافی اختلاف ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے اس کو یاد دلایا کہ اس نے ایک خط میں میری کتاب "ادبی

ذہن" (Literary Mind. ) پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ "تم نے شعر کی جو تعریف لکھی ہے اس کے مفہوم سے میں متفق ہوں، میں اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جمالیاتی ذوق ہمارے عمل اور ذہنی وسعت میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے" مجھ کو یہ جملہ زبانی یاد تھا کیونکہ میں نے جمالیات کے ایک پروفیسر کی تردید میں جس نے کہ میرے نظریۂ شعر و فن کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے سنتیانا کا حوالہ دیا تھا اسی جملہ کو دُہرا کر اس کو قائل کیا تھا۔ عمل کی رکاوٹ کو سنتیانا مجھ سے بھی زیادہ اہم خیال کرتا ہے کیونکہ اس کی رائے یہ ہے کہ اس مادی ہستی کے سمندر کی گہری تہ سے غوطہ لگا کر ہم حقیقت کی دُنیا میں داخل ہوتے ہیں میں تو اس کو صرف دُنیاوی تجربہ کے بہتے ہوئے چشمے کو روکنا ہی سمجھتا ہوں یا حقیقی احساس کی ایک وجدانی کیفیت جو موجودہ دُنیا کے لئے سائنس سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

مذہب کے متعلق چونکہ ہمارے زاویۂ نگاہ مختلف تھے اس لئے بحث نے کچھ طول کھینچا۔ مادہ پرست ہوتے ہوئے بھی سنتیانا اپنے کو مذہب پرست اور عبادت گذار سمجھتا تھا۔ وہ کیتھولک مذہب کی ظاہری رسوم اور شعائر سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے بنیادی عقائد سے اس کو پورا شغف تھا اور ان کی تمام جزئیات سے واقف تھا اور ان کو بڑے والہانہ جوش کے ساتھ بیان کرتا تھا لیکن وہ ان کی صداقت کا قائل نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علاماتی طریقہ پر یہ ان اعلیٰ مقاصد کے مظاہر ہیں جن کی روح کو اس مادی دُنیا سے گزرتے ہوئے بطور رہنما کے ضرورت ہوتی ہے۔

اس نے کہا "کلیسائی تصوّرات کے پیچھے کوئی سند نہیں ہے۔ کچھ عرصہ سے میں اس لفظ "سند" کو کافی اہمیت دے رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض مادی حقیقتیں یا اگر نہ تک پہونچا جائے تو صرف طبعی سائنس کے حقائق ہی مستند ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تو یہ ایک خرافات معلوم ہوتی ہے کہ باضابطہ رسوم کی پیروی کی جائے اور جن واقعات کے متعلق ہمیں یہ علم ہے کہ وہ کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے اور جن شخصیتوں کو ہم محض فرضی سمجھتے ہیں ان کی نسبت فہم وادراک پر مبنی تصوّرات قائم کر لئے جائیں۔

میں نے کہا "یہ تو ایسا ہی ہے جیسی کاغذ کے کھلونے بنا کر ہم ان سے زندہ چیزوں کا سا برتاؤ کرنے لگیں۔" اس نے جواب دیا "تمھارے خیالات کی وجہ یہ ہے کہ تم نے پروٹسٹنٹ گھرانے میں تعلیم و تربیت پائی ہے۔ تم ان روایات کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو ان فرضی قصوں اور غیر حقیقی طرز عمل کو مذہبی تقدس عطا کرتے ہیں۔ میں نے اسپین میں رہ کر انہی روایات اور افسانوں میں بچپن سے نشوونما پائی ہے۔ جس ماحول میں میں بڑھا اور پلا وہ کیتھولک ماحول تھا۔"

مجھے اس نے اس عالم سے باہر ہی چھوڑ دینے پر اکتفا کی، اس کے اندر داخل کرنے کی اس نے کوشش نہ کی اور میں بھی اس سے باہر ہی رہنے پر مطمئن تھا۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ پختہ مذہبی اعتقاد کے بغیر مذہبی رسوم سے وابستہ ہونا کیتھولک مذہب ہی کا کوئی مخصوص مظہر ہے یا یہ کہ ایسا مظہر کہیں وجود میں ہے۔ سنتیانا کے متعلق عجیب بات یہ تھی کہ وہ نہ صرف اس خصوصیت کا کھلے دل سے اعتراف کرتا تھا بلکہ بڑی جسارت کے ساتھ اس کا مظاہرہ بھی کرتا تھا۔ وہ غیر مخلص ہونے میں

پورے خلوص سے کام لیتا تھا یا یوں کہیئے کہ بغیر کسی مذہب کو مانتے ہوئے وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔

میں نے اس سے کہا کہ آپ کی اس طرز کی مذہبیت کے متعلق نہ معلوم نیلی راہباؤں کا کیا رجحان ہے؟ وہ اس بات پر ہنسا لیکن طنزاً نہیں۔ اپنی آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے اس نے جواب دیا" وہ میرے لئے دعا کرتی ہیں۔ میں نے ان سے یہ خواہش کی ہے کہ وہ یہ دُعا نہ کریں کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے بہشت میں داخل کیا جائے، البتہ مجھے اعراف میں رکھا جائے تاکہ میں اپنے دوستوں سے ہم کلامی کا کچھ لطف اُٹھا سکوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بات وہ سمجھ گئیں"۔

زندگی سے کنارہ کشی کے باوجود یا اس کی بنا پر سنتیانا نے زندگی سے خوب لطف حاصل کیا۔ بعض اوقات ویٹیکن[1] کے اعلٰے مذہبی علماء اس کے پاس آتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح یہ ان مذہبی عقائد کو حرف بحرف ماننے بھی لگے جن سے اس کو لگاؤ تھا۔ اس کے ایک دوست ڈینیل کوری نے جو اس کا منشی تھا مجھے بتایا کہ ایک موقع پر جب ان مقدس علماء کی بحث بڑی سرگرمی سے جاری تھی ان میں سے کسی نے سینٹ ٹامس ایکوناس کا ایک قول دوہرایا۔ جب وہ کہہ چکا تو سنتیانا نے جواب دیا" جب تم یہ استدلال پیش کر رہے ہو تو مہربانی کر کے اس کی صحت بھی کر لو اور یہ کہہ کر اس نے وہ قول صحیح کر کے لاطینی زبان میں پڑھ کر سنا دیا!"

سنتیانا نے اس واقعہ کی صحت سے بالکل انکار کیا اور مجھے اس کی بات کا یقین ہے، لیکن یہ ایک دلچسپ بات ہے اور اہم بھی ہے۔ اس کے ذوقِ ظرافت نے مجھے متحیر کر دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی تصانیف میں لطیف قسم کی

---

[1] پاپائے روم کا صدر مقام

ظرافت نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس نے میری ایک تصنیف "لطفِ خندہ" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مجھے ایک خط لکھا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ تفکر پسند سنجیدگی کا دل دادہ ہے۔ اس وقت میں اس خط کے مضمون کا حوالہ نہ دے سکا، مجھ کو صرف اتنا یاد رہا کہ اس خط کے مضمون نے مجھے بہت زیادہ تعجب میں ڈال دیا تھا، لیکن اب میں اسے بیان کرتا ہوں اور چونکہ میرے تصور میں اس کی ہنستی ہوئی شکل موجود ہے مجھے اس سے اور بھی زیادہ تعجب ہوتا ہے اس خط کا مضمون اس دعوے سے شروع ہوتا ہے کہ وہ میری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھ سکا!

میں تمھارے خود کے الفاظ کو سمجھ سکتا ہوں! ذر بلا شبہ تم نے ظرافت ومزاح کے اقسام بیان کرنے میں جو دلائل پیش کئے ہیں اس کا کچھ حصّہ بھی میرے لئے قابلِ فہم ہے۔ میری دشواری خود اس مضحکہ خیز کائنات کو سمجھنے میں ہے۔ اس سے متعلق میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی کیونکہ اس میں جو چیز مضحکہ خیز سمجھی جاتی ہے وہی نیکی کا ایک جزو بھی شمار ہوتی ہے یہ مضحکہ خیز واقعات مجھے وحشت ناک معلوم ہوتے ہیں' اور لطفِ خندہ، بجائے اس کے کہ تم اس کو اپنے لئے آنام اور دردِ دل کا باعث سمجھتے ہو۔ تم نے اس کو اپنی کتاب کا موضوع بحث بنا لیا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ میں تمھاری کتاب کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

کیا تمھیں اس بات پر حیرت ہوگی کہ جب میں نے اس پر ایک خوش آیند ہنسی کا اتنا غلبہ دیکھا کہ وہ اس کے تمام چہرے پر پھیل گئی تھی تو مجھے بہت تعجب ہوا، یہی نہیں بلکہ معمولی سی تحریک پر بھی وہ قہقہہ لگانے کے لئے تیار نظر آتا تھا

میں نے تعجب کا اظہار کیا اور جواب میں اس نے کہا "کیا تم نہیں جانتے کہ میں ہنس مکھ فلاسفر ڈیمقراطیس ( Domocritus. ) کا معتقد ہوں۔ میرے اکثر دوستوں کا خیال ہے کہ میں بہت زیادہ ہنستا ہوں، وہ سمجھتے ہیں کہ میں کچھ بیوقوف ہوں، لیکن میرے خیال میں ہنسی بہت اہم چیز ہے۔ ان دو چیزوں میں سے ایک ہے جو میں اپنے دوستوں میں دیکھنا چاہتا ہوں، یعنی ہنسنے کی قابلیت اور پرستش کرنے کی اہلیت"۔

میں نے اس موضوع بحث کو یہیں چھوڑ دیا کیونکہ میں اس کو یہ یاد دلانا نہیں چاہتا تھا کہ اس نے میری تصانیف کے بارے میں مجھے خطوط لکھے تھے، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کی ان باتوں سے مجھے کچھ الجھن ہوئی اور اب بھی ہوتی ہے۔

میں نے کہا "میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک مادہ پرست کے نزدیک پرستش سے کیا مطلب ہو سکتا ہے"۔ اس نے جواب دیا "اس سے میرا مطلب کسی اعلیٰ نظریہ کی پرستش ہے یعنی اپنی ذات سے ماورا کسی کی پرستش"۔

میرے ہر سوال کا جواب وہ اسی طرح مستعدی اور آسانی سے دیتا رہا۔ میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جس کے خیالات ایسی روانی کے ساتھ اسکے دماغ سے نکلتے ہوں۔ ان میں کوئی چیز سختی یا رکاوٹ لئے ہوئے نہیں معلوم ہوتی تھی، غلط فہمی یا تناقض سے بچنے کے لئے کوئی کوشش نہ تھی وہ ایسی ہی روانی کے ساتھ اس کے دماغ سے اُبلتے تھے، کسی اور طریقہ سے ان کا اخراج نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی تصانیف میں تو یہ چیز بعض اوقات بُری لگتی ہے۔

تم اپنے دل میں کہو گے کہ "یہ شخص ایک ہی طریقہ پر اچھا لکھتا چلا جاتا ہے"۔ لیکن گفتگو میں یہ طریقہ بہت خوش گوار معلوم ہوتا تھا، اس کی وجہ سے پہلی ہی ملاقات میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی شخصیت میں بڑی دلکشی ہے اور اگر تم اس سے ملتے رہو تو یقینی طور پر اس سے انس کرنے لگو گے۔

اس کا سامنے کا دانت بہت بھدّا اور لمبا تھا جو شیطان کے دانت سے مشابہ تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی کسی قدر شیطانی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس کی آنکھ کے پردے بھونرے کی طرح سیاہ تھے اور کچھ اس طرح واقع ہوئے تھے کہ جب وہ جوش میں ہوتا تھا تو آنکھوں کی سفیدی ہر طرف پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں باب ہوپ (Bop Hope.) کی آنکھوں سے مشابہ تھیں، البتہ ان میں متانت تھی۔ لیکن ان آنکھوں سے بہت پُرخلوص اور پرجوش التفات ظاہر ہوتا تھا اور گفتگو کے اختتام پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان آنکھوں میں شیطنت کے بجائے بچوں کی سی معصومیت جھلکتی تھی۔

اگر امریکہ میں ذہنی ترقی زیادہ بلند ہوتی تو میرا خیال ہے کہ جارج سنتیانا میری زندگی بھر امریکہ کا ممتاز ترین انشا پرداز سمجھا جاتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس معاملہ میں کون اس سے بازی لے جا سکتا تھا، لیکن وہ ایک فلسفی تھا اور اس کی اٹھائیس تصانیف میں سے اکثر کتابیں دماغی پردوں کے لئے وہ کام مہیا کرتی ہیں جس کے لئے عام امریکی اہل علم پوری طرح تیار نہیں، ایک پرانے طالب علم نے جو ہارورڈ میں اس کا شاگرد رہا تھا مجھ سے کہا کہ وہ اپنی تقاریر میں سننے والوں کو تجریدی خیالات کی ایسی سرد بلندیوں پر لے جاتا تھا کہ لڑکے اس کے لکچر سنتے وقت

بھاری لمبے گرم کوٹ پہن لیتے تھے، لیکن بہتر سال کی عمر میں وہ ان بلندیوں سے اتنا نیچے اُتر آیا کہ اب اس کا ایک ناول "آخری پوریٹن" (The Last Puritan') ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگا تھا، یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اس سے پہلے تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد اس نے اپنے تین سوانح حیات لکھے، اس میں اس نے اپنے زمانہ کے نمایاں مردوں اور عورتوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ نہایت جاذبِ توجہ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے اپنی تمام زندگی انہی لوگوں کے درمیان بسر کی ہے۔ دُنیوی معاملات میں چاق و چوبند ہونے کی ان علامات کے باوجود عام طور سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سنتیانا امریکی ادب کی عام سطح پر نہیں بلکہ اس سے بہت بلند مقام پر فائز ہے۔ اس کے اسپین نژاد ہونے اور وہاں کی شہریت رکھنے کی وجہ سے اس خیال کو اور بھی تقویت ہوئی اگرچہ وہ آٹھ سال سے اُنچاس سال کی عمر تک بوسٹن میں یا اس کے اردگرد سکونت پذیر رہا۔ اور خود اس کے حیرت افزا بیان کے مطابق اس نے ایک بھی ہسپانوی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔"

اس نے مجھ سے کہا "انگلینڈ ایسی جگہ ہے جہاں میں گھر کا سا اطمینان محسوس کرتا ہوں میں وہاں قیام کر لیتا لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں انگریزوں کے تمام تعصبات جذب نہ کر لوں۔ دیگر قوموں کے تعصبات میری فطرت کے لئے ایسی دلکشی نہیں رکھتے۔"

سنتیانا نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ خانقاہ کی چاردیواری کے اندر رہ کر گزارا۔ اس سے ہمارے اس خیال کی مزید توثیق ہوتی ہے کہ وہ اہلِ امریکہ

کے عام طریقوں اور دلچسپیوں سے بالکل نامانوس تھا۔ ایک راہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ دُنیا سے کنارہ کشی کر کے وہ کسی مردانہ خانقاہ میں معتکف ہو گا نہ کہ راہبات کی خانقاہ میں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دُنیا سے کنارہ کش نہیں ہوا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ میری عزلت گزینی محض اخلاقی رہی ہے۔ زہد و ریاضت کے مقصد سے نہیں ہوئی اور یہ کنارہ کشی میں نے ۱۸۹۳ء میں اختیار کی تھی۔ نیلی راہباؤں کے شفاخانے میں رہنے کی وجہ اس نے محض مالی مجبوری بتائی اس نے بیان کیا "وجہ یہ تھی کہ امریکہ سے مجھے جو روپیہ ملتا تھا وہ بند ہونے والا تھا، اور میں نے اس سلسلہ کے سربراہ سے مل کر یہ انتظام کیا کہ جتنا روپیہ مجھے یہاں ملتا ہے اتنا ہی مجھ کو شکاگو میں مل جایا کرے جہاں ان کا بہت بڑا شفاخانہ ہے یہ انتظام ہو گیا۔ تین سال تک مجھے تیس ہزار لیرہ جیب خرچ کے لئے ملتے رہے بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ خزانہ سے میرے بھتیجے کو شکاگو میں جو رقم ملتی تھی وہ بند کر دی گئی ہے اور مجھے اور اس کو جنگ کے بعد واجبات ادا کرنے کے لئے حکومت سے اجازت حاصل کرنے میں بڑی دقّت ہوئی"۔

راہباؤں نے اس کو بہت آرام پہونچایا۔ وہ اپنی روح کی آئندہ بہتری کے لئے ان کی دعاؤں کو سُن کر خوش ہوتا تھا لیکن اس نے اپنے اعتقادات میں کوئی شکوک پیدا نہیں ہونے دیئے۔ مزید برآں اب وہ ضعیف ہوتا جارہا تھا۔ اپیکوریس ( Epicurus، ) کی طرح اس کا بھی یہ اعتقاد تھا کہ تعیش کی زندگی

روحانی صحت مندی کے لیے بری ہے۔ اپنی زندگی کے آخری اور پُرمسرّت لمحے گزارنے کے لئے یہ جگہ بہت اچھی تھی اور جب موت کا پیغام آئے تو اس زندگی سے مسرّت آمیز سکون کے ساتھ رخصت ہو جائے۔

سنتیانا نے اس خانقاہ میں قیام کرنے کے لئے جو وجہ بتائی وہ تو اپنی جگہ پر تھی لیکن ان نیلی راہباؤں کی رفیقانہ نگہداشت میں اتنا طویل وقت گزارنے کی ایک اہم وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے ۱۸۸۴ء میں اس نے ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک تمثیلی تماشہ میں ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا اور اس کے دو سال بعد ایک اور تمثیل میں اس نے اپنے رقص کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ اور بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے بچپن میں جب اس کا بھائی شیکسپیر کا ڈرامہ زور زور سے پڑھا کرتا تھا اور یہ سنتا تھا تو اس کو جولیس سیزر کا ڈرامہ بہت پسند تھا لیکن رومیو جولیٹ اس کو ناقابلِ بیان طور پر احمقانہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ بات اس کے سنجیدہ لیکن خوش دلانہ نظریہ سے بالکل ہم آہنگ ہے کہ فرشتے اگرچہ ان کا وجود نہیں ہے طبقۂ ذکور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سنتیانا نے اپنی کتاب "معاشرے میں معقولیت" (Reason in Society.) میں ایک نہایت بلیغ مقالہ محبّت پر لکھا ہے، لیکن اس کی سرگزشت سے یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ جنسِ لطیف کے ساتھ اس کو کبھی اس قسم کے جذبہ کا تجربہ ہوا ہو۔ مجھے شک ہے کہ کسی اور سوانح نگار نے اپنے ذاتی حالات درج کرتے ہوئے اپنے احباب کے ساتھ اس قدر سرگرم التفات کا اظہار کیا ہو جتنا سنتیانا نے کیا ہے۔ وہ بہت ہی محبت بھرے الفاظ میں اور مزے لے لے کر

ان کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن اس کی ماں اور اس کی پیاری سوتیلی بہن سوسانہ کو چھوڑ کر یہ تمام تذکرے مردوں کے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ انگریز ملک الشعرا ابرٹ برجز (Robert Bridges, ) کے علاوہ میرے تمام بہترین دوست نوجوان تھے جو عمر میں مجھ سے کم تھے وہ سب معقول آدمی تھے اور ہم سب دوست اگرچہ دماغی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب ہو گئے تھے لیکن ہماری دوستی جذبات سے لبریز تھی۔ اپنے ایک کم عمر دوست ایڈورڈ بیلی (Edward Bayley ley) کے متعلق جس کے ساتھ وہ چند ہفتوں اسکول سے گھر تک آیا کرتا تھا لکھتا ہے:

"خاموشی لیکن پختگی کے ساتھ ہم دونوں میں رشتۂ خلوص قایم ہو گیا تھا۔ باوجودیکہ اس سال کے بعد ہماری ملاقات پھر نہیں ہوئی اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی قایم نہیں رہا۔ لیکن ہماری دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ عجیب قسم کا جادو تھا! آج بھی اس نوجوانی کی دوستی کا خیال جس میں نہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی نہ اس کا کوئی پس منظر تھا اور نہ کوئی نتیجہ برآمد ہوا میرے دل میں ایسی حرارت پیدا کرتا ہے جیسی کہ بادۂ کہنہ کے ایک جام سے پیدا ہوتی ہے۔

جس طرح ایک قسم کی خاموشی ہمدردی کا ایک جزو ہے اسی طرح وقت سے بے اعتنائی کی بھی ایک قسم ہے..... دل کی صفائی اور گہرائی ذہن کی صفائی اور گہرائی کی طرح ہر چیز کو ابدیت کی سرحد تک پہونچا دیتی ہے.... کم از کم میرے دل میں ساٹھ سال تک جو اعتماد موجود رہا اس سے زیادہ فطری، مکمل یا خاموش اعتماد کی کوئی مثال ملنا مشکل ہے۔"

اگر بیلی تقدیر کی مرضی سے لڑکی ہوتا یا اگر سنتیانا افلاطون بن جاتا جس کے بعض

اوقات وہ بہت قریب پہونچ جاتا تھا، تو مذکورہ بالا بیان میں صرف ایک لفظ کی تبدیلی کرنی پڑتی۔ لفظ "ہمدردی" کے بجائے کلیدی لفظ "محبت" ہوتا اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔

میں سنتیانا کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ میں ان ماتوتی ماہرینِ نفسیات میں سے نہیں ہوں جو کسی مشہور انشا پرداز کی تصانیف پر ایک نظر ڈال کر تو اس کے "لاشعور" کے متعلق ہر چیز بیان کر سکتے ہیں لیکن کسی شخص کے متعلق کوئی معمولی سی ابتدائی دریافت کو بھی بتانے کے لیئے پچاس ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے ڈیڑھ سو ہفتہ تک روزانہ پانچ گھنٹے کام کرنے کی اُجرت طلب کریں گے۔ میں صرف اس امر کی طرف توجہ منعطف کرا رہا ہوں جو سنتیانا نے عمداً اور صاف بیانی کے ساتھ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنے متعلق لکھا ہے اس سے اس کے فلسفہ پر روشنی پڑتی ہے لیکن آج تک ان لوگوں میں سے کسی شخص نے بھی جو اس کے فلسفے کو سمجھنے میں اُلجھن محسوس کرتے ہیں کسی وجہ سے اس ذریعہ سے استفادہ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔

ایک زیرک، زندہ دل اور شریف الطبع نوجوان کی حیثیت سے وہ بوسٹن کے علمی حلقوں میں بہت کامیاب خیال کیا جاتا تھا۔ بالخصوص کسی قدر اوباشانہ گروہ میں جو مسز جیک گارڈنر کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا جس کی حیاسوز فحاشی کے صدمہ سے اہل بوسٹن قریب قریب مردہ ہو چکے تھے، لیکن اس نے ایک نہایت بیش بہا فنی میوزیم کا تحفہ پیش کر کے ان سب میں نئی روح پھونک دی اور ان کی زبانوں پر مہر لگا دی۔ ان رنگیلے اجتماعات میں اس کا سابقہ دلفریب

اور سحر آفریں دوشیزاؤں سے ضرور پڑتا ہوگا۔ لیکن اس نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ ۱۸۸۰ء کے اسلوب بیان کے مطابق، کیونکہ یہ اسی زمانہ کا ذکر ہے، وہ تحریر کرتا ہے "میں نے ان سے کبھی محبّت نہیں کی، میں صرف کھانے کے وقت انکے قریب بیٹھنا پسند کرتا تھا، جب روشنی، پھولوں، لذیذ کھانوں اور مرغوب شرابوں کے دور میں باہمی گفتگو زیادہ مہذب رُخ اختیار کر لیتی تھی۔ اس عیش و عشرت کے ماحول اور شائستہ مدہوشی کا ایک اہم جزو بے شک خواتین کا دلفریب حسن ہوا کرتا تھا، البتہ میرے لئے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی، لیکن اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے"!

بظاہر اس بیان سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی امریکی خاتون سے شادی کرنے کے خلاف تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو غیر ارادی طور پر آوارہ وطن تصور کرتا تھا اور ہماری سرزمین میں اپنے آپ کو بالکل غیر سمجھتا تھا، لیکن کوئی شخص جس کو ان خواتین سے محبت کا کچھ بھی لگاؤ پیدا ہوا وہ اپنے اس مدبرانہ فیصلہ کی توجیہ مندرجۂ ذیل قسم کے الفاظ میں کبھی نہیں کرے گا۔ وہ کہتا ہے "مجھے تین یا چار زیادہ عمر کی عورتوں سے حقیقی لگاؤ ہوا اور اس کے بعد پچاس سال کی عمر تک اس کے جو تعلقات صنفِ نازک سے رہے ان کے ذکر کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ اس تحریر سے نتائج اخذ کرنا عبث ہے۔ غالباً وہ اس بارے میں اپنے مخصوص ذاتی تجربات کو طشت ازبام کرنا نہیں چاہتا تھا اور عشق و محبّت پر اس نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اس کو اس قسم کے تجربات پیش نہیں آئے۔ لیکن ساتھ ہی وہ صاف طور پر یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اپنی بھرپور جوانی کے

زمانہ میں بھی اس کو عورتوں سے بحیثیت جنسِ لطیف کے کبھی زیادہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی سوتیلی بہن سوسانہ جیسا کہ وہ پہلے کہہ چکا ہے "میری زندگی میں میری کامل ترین محبت کام کر رہی اور پوری طرح میری زندگی پر اثر انداز" اس طرح اس نے بالکل صفائی کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ اس کو کسی عورت کی طرف کبھی غیر معمولی رغبت نہیں ہوئی ــــ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس سے صاف صاف یہ سوال کرنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ زیادہ عمر کی عورتوں کو پسند کرتا تھا اور کھانے کی میز پر ان کی ہم نشینی سے لطف اُٹھاتا تھا۔

محبت پر مضمون لکھنے کے بعد ہی اس نے دوستی پر ایک مقالہ قلم بند کیا ہے جو میرے خیال میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے:

"دوست ہم جنس ہی ہوا کرتے ہیں کیونکہ مردوں اور عورتوں میں نتائج پر تو باہمی اتفاق رائے ہو سکتا ہے لیکن ان کے دلائل ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔ اگرچہ مردوں اور عورتوں میں ذہنی ہم آہنگی آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی پُر مسرت اور ساحرانہ خاصیت محض اس وجہ سے ہے کہ یہ ہم آہنگی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ یہ مغائر خصوصیات کی ایک سازش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جیسے تاریکی میں بوسہ لینا۔ بنی نوع انسان کی تنظیم ذہنی اور دماغی زندگی کے اعتبار سے شہد کی مکھیوں کی طرح واقع ہوئی ہے۔ مرد تو محض ایک محنت کش ہے جس کی خواہشات نفسانی مردہ ہو چکی ہیں اور لازماً اس نے اپنی زندگی کو بے غرضانہ عالمگیر صنعت کاری کے لئے وقف کر دیا ہے اور عورت ایک ملکہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں بے پناہ افزائش نسل کی اہلیت موجود ہے لیکن وہ انفعالی ہے اور اس میں

بہت زیادہ وجدان ہے لیکن طریقہ و اسلوب نہیں ہے بالکل ایسے ہی جیسے کسی میں جذبات کا وفور ہو لیکن انصاف کا فقدان ہو۔ عورت کے ساتھ دوستی یا تو کم ہے یا زیادہ، کم تو اس لئے کہ مرد اور عورت میں دماغی مساوات نہیں ہوتی اور زیادہ اس لیئے کہ تعلقات کے جذبات سے بالکل خالی ہونے کی صورت میں بھی جیسے کہ زیادہ عمر کی عورتوں کے ساتھ ہوتے ہیں، عورت کے دماغ میں کوئی نہایت عجیب اور معجزانہ خصوصیت ہوتی ہے جو ایک فطری جذبۂ احترام پیدا کر دیتی ہے اور یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے اقوال کو مردانہ معیار سے جانچا جائے۔ عورت کاہنوں جیسی جبلّی فہم کی حامل ہوتی ہے اور غیر منطقی ہونے کے باوجود اس کا حق معقولیت مسلّم ہے۔ عورت سے ہم کلامی کے وقت ایک قسم کا ذہنی احترام تمام گفتگو پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے ٹھیک۔ اسی طرح جس طرح کہ بچوں یا خدا رسیدہ لوگوں سے تخاطب کے وقت تواضع اور خوش اخلاقی برتنے کا خیال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، لیکن احترامانہ مراعات کی یہ عادت جذبۂ دوستی کے قطعاً منافی ہے کیونکہ اس سے ذہنی مغایرت کا پتہ چلتا ہے جو ایسی ہی شدید سمجھی جاسکتی ہے جیسی کہ انسانوں میں اور بے زبان جانوروں میں ہے۔"

مجھے تو اس سے صرف یہ بات ظاہر ہوئی کہ سنتیانا نے کبھی کسی عورت سے محبت نہیں کی۔ اگر وہ کسی کے دام الفت میں گرفتار ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ عورتوں میں بھی خاصی مردانہ صفات پائی جاتی ہیں جس طرح کہ مردوں میں خاص کر خود اس میں نمایاں طور پر نسائیت کا سراغ ملتا ہے۔ سنتیانا نے دوسرے فلاسفروں پر جو تنقید کی ہے اس میں کافی مردانگی پائی جاتی ہے۔ یہ تنقید منطقیانہ

ہے' خاص اسلوب پر مبنی ہے اور واضح طور پر ان کے دلائل کو پاش پاش کرنے والی ہے لیکن جب وہ خود اپنے فلسفہ کو پیش کرتا ہے تو اس کا اظہار ایسے پراسرار اور ملہمانہ طریقہ پر ہوتا ہے کہ منطقی علماء اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ "مجرد" خیال میرے لئے مشکل ہے' جب تک میں متفق تخیلات اپنے دماغ میں پیدا نہ کروں میری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور میں صحیح سمت سے ہٹ جاتا ہوں میں کبھی شطرنج نہیں کھیل سکا۔۔۔" سنتیانا کی نثر نگاری کی تعریف کرنے والوں میں کوئی بھی ایسا شخص ہے جو اس کا یہ حق تسلیم نہ کرتا ہو کہ وہ غیر منطقی ہوتے ہوئے بھی معقول تھا۔

کائنات کے متعلق سنتیانا کے طرز استدلال پر مذکورہ واقعات سے جو روشنی پڑتی ہے اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم فوائد کے نفسیاتی تجزیہ کے ماہر ہوں۔ میرا تو یہ یقین ہے کہ ان پر غور کیے بغیر یہ ناممکن ہے کہ ہم اس کے ایک اخلاقی فلسفی ہونے کے دعوے کو سمجھ سکیں، یعنی اس کو ایسا شخص مان سکیں جو زندگی کی بہترین اقدار کی جستجو میں فہم و ادراک سے کام لیتا تھا، لیکن اس کی پوری تصویر مرتب کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک دو اور چیزوں سے بھی مدد لی جائے جو اس نے ہمیں بڑی صاف گوئی سے بتائی ہیں۔

وہ اسپین میں ایسے والدین کے گھر پیدا ہوا جو مضبوط رشتۂ الفت میں وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر الگ الگ رہتے تھے۔ وہ خود کہتا ہے کہ میری ماں میں محبّت کا شدید جذبہ بالکل موجود نہیں تھا بلکہ وہ تمام مردوں سے بحیثیت مردوں کے اور اپنے دو شوہروں کے ساتھ بھی سرد مہری، نکتہ چینی اور غم ناکی کا طرزِ عمل

روا رکھتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ناگزیر اور مایوس کن تقدیری حادثہ کا شکار ہے۔" جب کم سن جارج جو بہت ہی حسّاس بچّہ تھا سات برس کا ہوا تو اس کی ماں نے رختِ سفر باندھا اور بوسٹن چلی گئی۔ بچہ کو باپ کے پاس چھوڑ گئی جو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتا تھا۔ ایک چچا سنتیاگو اور اس کی باورچی خانہ میں کام کرنے والی بیوی اور ایک لڑکی اُن کے ساتھ رہنے کے لئے ان کے گھر میں آگئیں۔ اس ہیبت ناک وقت کا ذکر کرتے ہوئے سنتیانا لکھتا ہے: "میں نے نہ تو اچھی طرح محسوس کیا اور نہ سمجھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لیکن کسی نہ کسی طرح اس واقعہ نے میرے نوخیز دماغ پر پورا اثر ڈالا اور میرے لیے حقیقت کا ایک معیار قائم کر دیا۔ یہ پر ہجوم، غیر صحت مند، نفاق سے پُر اور المناک خاندانی زندگی میرے سامنے ایک ایسا نمونہ ہے جس پر میں حقیقی زندگی کو جانچتا ہوں، جو مجھے بسا اوقات منتشر، دہشت ناک اور بے کار نظر آتی ہے۔"

بہت سے دوسرے نوخیز بچے جن کی زندگی اس طرح شکستہ اور زخم خوردہ ہو گئی ہو آگے چل کر اس کا مداوا رومانی زندگی میں تلاش کرنے لگتے ہیں، لیکن جو شخص رومیو جولیٹ کے ڈرامہ کو بے حد احمقانہ سمجھتا ہو ظاہر ہے کہ اس کیلئے اس قسم کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ سنتیانا پر اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ وہ حقیقت سے بالکل دور جا پڑا۔ اب اس کے لئے یہ بات بالکل مصدقہ ہو گئی کہ حقیقت تو بالکل بیکار ہے اور تصوّراتی اُمور ہی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اب اسکی یہ رائے پختہ ہو گئی کہ یہ عالمِ وجود خود بالکل بے قرینہ اور غلط انداز پر ہے۔

بڑھاپے میں اس رائے کا اعادہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ عہدِ جوانی کی مبالغہ آمیزی کو کسی قدر نظر انداز کرتے ہوئے میں یہی کہوں گا کہ "اب بھی میں اسی رائے پر قائم ہوں۔"

یہ بات کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئی کہ صرف ہستی ہی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ خود بھی کسی غلطی پر ہو، لیکن میں سوچتا ہوں کہ اس کے اور بہت سے اعتراضات سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ وہ ایسے زمانہ کے متعلق بیانات ہیں جس کو اس کے کہنے کے مطابق وہ تقریباً بالکل بھول چکا تھا اور جو اسکی ابتدائی زندگی سے لے کر اس کے مکمل جوان ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنے شہر سے جلاوطن ہو کر بوسٹن آیا اور ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں پھر اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگا، اس وقت سے سولہ برس کی عمر تک کی زندگی کے واقعات اور تصوّرات کے متعلق وہ بالکل خالی الذہن معلوم ہوتا تھا۔

"لیکن میں جانتا ہوں کہ اس زمانہ میں میرے احساسات بہت شدید تھے، میں بالکل تنہا اور افسردہ سا رہتا تھا اور میری زندگی ایک مستقل خواب کی سی تھی جو افسانوں، فنِ تعمیر اور مذہب کی کتابوں کے سہارے بسر ہو رہی تھی اس عہد کے غم و الم اور مایوسیاں، جن پر فراموشی نے جو اکثر مہربانی کرتی ہے پردہ ڈال دیا تھا، کچھ بھی ہوں لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اس معاملہ میں عام زندگی قابلِ الزام نہ تھی۔ معمولی فہم کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ہماری زندگی استوار اور خوش گوار بھی ہو سکتی ہے اور بدنما اور غلط بھی۔ سنتیانا چونکہ محدود جذبات کا انسان تھا اور بچپن میں اس کو صدمات پہونچے تھے اس لیے

اس کے تجربہ میں زندگی کے جو حوادث آئے ان پر قیاس کر کے اس نے زندگی کو مردود اور قابلِ نفرت قرار دے دیا۔ میں اس کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر کے اور نصف درجن ملاقاتوں میں تبادلۂ خیال کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس کے افکار و خیالات کا مطالعہ اسی نقطہ سے شروع ہونا چاہیئے۔

معمولی قوت کا انسان جو اس قسم کے محدود جذبات رکھتا ہو اور جس کا بچپن صدمات سے اس قدر مجروح ہو چکا ہو غالباً ایک معذرت خواہانہ اور ندامت کی زندگی بسر کرتا، لیکن سنتیانا مضبوطی اور پامردی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہا اس نے دُنیا کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی انتیس تصانیف کے ذریعہ ایک حد تک اس کو اپنی روحانی ضروریات کے تابع کر لیا۔ میری نظر میں اس کی زندگی اور اس کے فلسفہ کی کہانی بھی ہے۔

سنتیانا کے نظامِ فلسفہ مابعد الطبیعات سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن اگر ناظرین اس کے لیئے مشتاق ہوں تو میں اس کے خاص نکتہ کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ اس نظام کا تقاضا یہ ہے کہ دُنیا سے کنارہ کشی کیئے بغیر اس کے علائق سے نجات حاصل کر لی جائے۔ سب سے پہلے تو حقائقِ اشیا اور ان کی مصنوعی شکل میں جو بیّن فرق ہے اس کو سمجھنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر پھول میں حسن ہوتا ہے اور یہ مرجھا بھی جاتا ہے، پھول باقی رہتا ہے لیکن اس کی خوبصورتی باقی نہیں رہتی، تاہم خوبصورتی کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے، دلائل پیش کیئے جاتے ہیں، اس کے متعلق تحقیق ہوتی ہے اور اس کی کیفیت بھی بیان کی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ تمام شکلیں جو اشیا اختیار کر لیتی ہیں یا ترک کر دیتی ہیں یہاں تک

کہ محض خیالی شکلیں بھی معرض بحث میں آتی ہیں۔ ان اشکال کو سنتیانا نے 'جوہر' کا نام دیا ہے۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اگرچہ وہ موجود نہیں ہیں لیکن ان کی ایک ہستی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ ان کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ اگر آپ اس مقام یا لامقام کو جہاں یہ جوہر وجود رکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو تھوڑا سا فریب دے کر ایک "اقلیم" کہیں تو آپ زندگی بسر کرنے کی اغراض کے لیئے اس اقلیم کو اس دوسری اقلیم سے کہیں بہتر پائیں گے جس میں اصل اشیا بد قسمتی سے وجود رکھتی ہیں۔

اس اقلیم میں زندگی کی تمام شکلیں موجود ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ ان شکلوں پر وقت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے، اگرچہ اس خوبی کا عام طور پر ذکر نہیں کیا جاتا کہ آپ اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ کسی ایک شکل کو دوسری پر ترجیح دیں۔ آپ کسی بھی شکل کو چننے اور انتخاب کرنے کے مختار ہیں مثلاً ایک شکل ہے جس کو لجلجاپن ( Sliminess, ) کہتے ہیں' لیکن اس اقلیم (سنتیانا غیر فانی اقلیم کہنا پسند کرے گا) کے رہنے والوں میں سے کسی کو اس سے کوئی واسطہ رکھنے کے لیئے مجبور نہیں کیا جاتا۔ اس کے برخلاف اگر تم حیات دُنیوی میں بالکل ملوث ہو جاؤ تو ان قابل نفرت جوہروں میں سے کوئی ایک جوہر تمھارے سر منڈھ دیا جائے گا اور تم اس سے بچ نہ سکو گے۔ سب سے زیادہ خرابی کی بات یہ ہے کہ جب تم کسی دوسری طرف متوجہ ہو یا کسی دوسرے اعلیٰ مقصد پر غور کر رہے ہو تو ٹھیک ایسے وقت میں تمھارے سامنے اس مکروہ جوہر کو لایا جائے گا۔ جیسا کہ سنتیانا نے ایک اور موقع پر بیان کیا ہے دُنیوی زندگی

نہ صرف بدنما اور غلط ہے بلکہ یہ رحم سے عاری اور ضرر رساں بھی ہے۔ اِس خیال کی بنیاد پر یا اس انقلاب پذیر دُنیا کے ناہموار طریقوں سے جذباتی طور پر متنفر ہو کر سنتیانا نے اپنے لئے تصوّراتی سازوسامان میں ایک جائے پناہ ڈھونڈھ لی اس کے نظریہ جوہر کا میرے خیال میں یہی خلاصہ ہے۔ یہ اس کی ایک بہت ہی شاندار ایجاد ہے، یہ بغیر کسی راستہ کے راہِ فرار ہے اور زمین سے علیٰحدہ ہوئے بغیر آسمان پر پہونچنا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیئے بہت اہم ہے جو دیانتداری سے یہ انکار نہیں کر سکتے کہ زندگی کی ہفت خوان اس مادی جسم کے ذریعہ ہی طے کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیئے، لیکن ساتھ ہی وہ اس قدر کم ہمت ہیں کہ زندگی کو اصلی رنگ میں قبول کر کے اس سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

سنتیانا کے مذہب اور فلسفہ اور اس کے اس مسلک کی توجیہ کہ رومن کیتھولک مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ اس پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا میرے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے حقیقت سے جذباتی طور پر روگردانی کی تھی۔ اسے اپنے والدین سے کوئی مذہب نہیں ملا تھا۔

وہ لکھتا ہے "میری ماں اپنے باپ کی طرح خدا پر ایمان رکھتی تھی، اس کو خدا کے وجود پر یقین تھا کیونکہ خدا کے بغیر اس عالم کو کون وجود میں لا سکتا تھا؟ لیکن خدا کی ہستی اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ انسان کا خاص طور سے خیال رکھے۔ قربانی۔ دعائیں، گرجے اور بقائے دوام کی کہانیاں یہ سب بدمعاش مذہبی پیشواؤں نے بیوقوفوں پر تسلط جمانے کے لئے گھڑ لی ہیں۔ میرے والد خدا کی ہستی کے قائل نہیں تھے لیکن وہ بھی

پورے وثوق کے ساتھ اسی رائے پر قائم تھے۔ اس لئے اگرچہ میں نے دعائیں اور مذہبی سوال وجواب زبانی رٹ لئے کیونکہ اس زمانہ میں اسپین میں یہ چیزیں ناگزیر تھیں، لیکن میں جانتا تھا کہ میرے والدین مذہب کو انسانی تخیل کا ایک کارنامہ سمجھتے تھے۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور اب بھی ان سے بالکل متفق الرائے ہوں، لیکن ان کے عقائد نے ان کے دماغوں میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ انسانی تخیّل کے پیدا کردہ کام نقصان رساں ہیں۔ میری فطرت نے اس خیال سے بغاوت کی۔ میں بچپن میں بھی اپنے دل میں یہ سوچتا تھا کہ نہیں یہی کام اچھے ہیں اور تمام حقیقی دُنیا بیکار اور قابلِ نفرت ہے"۔

درحقیقت اس کے والدین کے نظریہ میں اس قسم کے معنی پوشیدہ نہیں تھے جو چیز ان کو بُری معلوم ہوتی تھی وہ تخیّل کے وہ کارنامے تھے جو بے گناہ عوام پر ٹھوس صداقت کے نام سے مسلّط کئے جاتے تھے۔ یہ چیزیں سنتیانا کو بھی اکثر بُری معلوم ہوتی تھیں۔ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے "مذہبی انسانوں کو خالص صداقت سمجھ لینا مکروہ ہے" لیکن یہ اس کی پختہ رائے نہیں تھی۔ اس کی پختہ رائے یہ ہے کہ خود سائنس حتیٰ کہ طبیعی سائنس میں بھی ہو بہو یا حرف بحرف صداقت نہیں ہے۔ سائنس مادی اشیاء کے تعلقات کو علامتوں کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے۔ مذہب اسی طریقے سے روحانی تعلقات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ان روایات کو "بظاہر سراسر اور شاعرانہ تصورات" کے ذریعے بیان کرتا ہے، لیکن ان اخلاقی صداقتوں کو روایتی یا عوامی انداز میں بیان کرنے کے لیۓ پھر اور کون سا طریقہ ہے؟ مذاہب انسانی ضمیر کی عظیم الشان دلچسپ کہانیاں ہیں۔

یہ بات کہ سائنس کی علامتیں منضبط اور قابل تصدیق ہیں یا کم سے کم اپنے آپ کو ایسا ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور مذاہب کے دلچسپ قصے اس طرح وضع کیے جاتے ہیں کہ کوئی بھی پادری یا مذہبی پیشوا، خواہ وہ شرارت پسند ہو یا غیر معمولی انصاف پسند، اپنی مرضی کے مطابق انکی تحریف اور تاویل کرسکتا ہے سنتیانا کی نظروں میں قابلِ وقعت نہ تھی۔ وہ ایسا ہی خیال کرسکتا تھا کیونکہ اس کا اصلی مقصد حقیقی دُنیا سے تعلق رکھنے والے اخلاقی روابط کو واضح کرنا تھا، یعنی جس حقیقی دُنیا پر اس کی تمام بُرائیوں کے باوجود ہمیں اپنی بہترین توجہ صرف کرنی چاہیئے، بلکہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ اس حقیقی دُنیا سے نکل کر غیر حقیقی علامات میں زندگی گزاری جائے۔ ان غیر حقیقی علامات کے بودے پن کی عذر خواہی کے طور پر ان کے جو ممکنہ معنی یا بہت سے اُلجھے ہوئے معنی حقیقی دُنیا میں نکالے جاسکتے ہیں پیش کیئے جاتے ہیں، لیکن انھیں ان کے اسی بودے پن کی خاطر پسند کیا جاتا ہے بلکہ ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی اشیا کی طرح "بدنما اور نقصان رساں" نہیں ہیں۔

جب سنتیانا کے حالاتِ زندگی اور اس کے تخیلات پر بیک وقت توجہ کی جائے تو اس سے یہی قدرتی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ دونوں میں سنتیانا ایک ایسا انسان نظر آتا ہے جس میں اکثر انسانوں کا سا پرجوش ذوقِ حیات موجود نہیں ہے۔ جو اصلی اور جسمانی حیات سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے جب میں اس مقالہ کے ابتدائی اجزا ختم کرچکا تو میں نے اُن کو سنتیانا کے

پاس بھیج دیا ان کو بھیجتے وقت میرے دل میں کسی قدر جھجک بھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ اس کے سوانح کو پڑھنے والا کوئی شخص اس کے رومانی تجربات سے وہ نتائج استنباط کرے جو میں نے کئے تھے۔ کمسن لڑکے ایڈورڈ بیلی کے متعلق اس کے خیالات سے جن کو وہ 'ہمدردی' کہا کرتا تھا حالانکہ درحقیقت اس کو عشق کہنا چاہئے تھا میں نے جو نتیجہ نکالا وہ پورے طور پر صاف اور صریح تھا۔ اس کے جواب سے میرے خیالات کی جو میں نے اس موضوع پر ظاہر کئے تھے پوری تصدیق ہو گئی۔

"ڈیر مسٹر اسٹیمین تمہارے مکتوب اور دونوں مضامین کو میں نے دلچسپی سے پڑھا، خاص کر وہ حصہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے میری تحریر کو صحیح طور پر سمجھ لیا ہے لیکن یہ بات ہمیشہ نہیں ہوتی۔ میرے اسکول کے دوست بیلی کا ذکر کرتے ہوئے تم نے پوری ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے جو لفظ "عشق" استعمال کیا ہے اس کی بحث میں فی الحال اس وقت تک کے لئے ملتوی کرنا چاہتا ہوں جب تک کہ میں اپنے نظام فلسفہ کے متعلق تمہارے تاثرات کا مطالعہ نہ کر لوں۔ اس وقت میں تمہارے خیالات پر اصلی تنقید کروں گا۔"

میں نے کچھ اور لکھنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن بدقسمتی سے ستمبر ۱۹۵۲ء سے قبل تک جب کہ سنتیانا کا انتقال ہوا میں کچھ نہ لکھ سکا۔ اس لئے میں یہ نہیں جان سکا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے کہ اس نے لفظ 'عشق' کا استعمال کیوں نہیں کیا اور نہ مجھے اس تبصرہ سے فائدہ حاصل ہوا جو اس نے اپنے نظام فلسفہ پر میری نکتہ چینی کے متعلق کیا ہوگا۔ لیکن اس نے اپنا مراسلہ ختم کرنے سے

پہلے ایک اُچٹتا ہوا سا وار میرے اوپر کیا تھا جو نشانہ سے اس قدر دور تھا کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ مزید تبادلۂ خیال سے کچھ فائدہ ہو سکے گا یا نہیں۔ اس نے لکھا تھا "اہم معاملات پر مجھ سے بحث کرتے ہوئے تم جو اُلجھن محسوس کرتے ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم یہ نہیں سمجھتے کہ میں منکرِ الہام ہوں، غالباً تم یونانی اور رومن قدیم علوم کی طرف توجہ نہیں کرتے جس کی وجہ سے تمھاری نظر صحیح صورت حال پر نہیں پڑتی۔ امریکہ نہ تو قدرتی طور پر نہ معمولی قواعد کے مطابق پروٹسٹنٹ بنا ہے بلکہ یہ مذہب اس پر لادا گیا ہے"۔

اس کے پیش نظر کہ سنتیانا کو قدیم یونانیوں کے ساتھ جو شغف ہے میں ایک زمانہ میں اس سے کس قدر متاثر ہوا تھا اور خود مجھے ان سے جو انتہائی اُلفت تھی اس کا یہ بیان ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ کوئی باپ اپنے لڑکے کو اس کی بات سمجھے بغیر ہدایت کرتا ہو۔ جواب میں میں نے امریکہ یا پروٹسٹنٹ مذہب کی طرف داری میں کچھ نہیں کہا، کیونکہ مجھے نہ پروٹسٹنٹ فرقہ سے کوئی دلچسپی ہے نہ کیتھولک مذہب سے، لیکن اپنی برئیت میں میں نے لکھا "آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں یہ نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک لامذہب انسان ہیں۔ میری ابتدائی زندگی میں آپ کے بے دین ہونے ہی نے میری نظر میں آپ کی وقعت بڑھائی تھی۔ آپ کی تصانیف میں ایک فقرہ یہ ہے "یونانی لوگ اخلاقیات کے متعلق دیانت داری سے غور کرنے کی اہلیت رکھتے تھے"۔ یہ فقرہ چالیس سال سے یا اس کے لگ بھگ مدت سے برابر میرے ذہن میں آتا رہا ہے۔ خود میرا اپنے متعلق یہ خیال ہے کہ میں آپ سے بھی . . . . . . . . . . . . . .

زیادہ بے دین ہوں اور اسی لئے میں آپ کے مذہب کیتھولک سے اتفاق رائے کرنے میں دقّت محسوس کرتا ہوں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ کم از کم پیدائشی اور ابتدائی ماحول میں مَیں خود پروٹسٹینٹ تھا۔ میری لادینیت میں پروٹسٹنٹ مذہب کا رنگ ہے جیسے کہ آپ کی لادینیت میں کیتھولک مذہب کا رنگ نظر آتا ہے۔

سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ دہریہ ہونے پر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں پروٹسٹینٹ نہیں رہا، لیکن سنتیانا کیتھولک عقائد سے روگردانی کرتے ہوئے بھی یہی اصرار کرتا رہا کہ وہ کیتھولک ہے۔ اگرچہ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ مغربی دُنیا میں عیسائی مذہب کی بدولت آفاقی ہمدردی کا ایک بالکل نیا نصب العین عالم وجود میں آگیا ہے تاہم میں گرجاؤں اور گرجا کی عبادتوں کو خواہ وہ کسی فرقہ کی ہوں پسند نہیں کرتا ہوں۔ یورپ کے عظیم الشان کلیساؤں کی شاندار اور بے مثال شان و شوکت کو دیکھ کر اگرچہ میں انسان کے کارناموں کے تصوّر سے مرعوب و مسحور ہوجاتا ہوں لیکن میں اپنے آپ کو وہاں ایک اجنبی محسوس کرتا ہوں میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو باہر سے چل کر اندر داخل ہوتے ہیں، لیکن یونانی عبادت گاہوں میں خاص کر پارتھینان ( Parthenon. ) میں مجھے روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ یونانی لوگ اخلاقیات کے متعلق اس لئے صحیح خیالات رکھتے تھے کہ انھوں نے اخلاق کو دوسرے عالم کے توہمات کے ساتھ مخلوط نہیں کیا تھا۔ ان کے معابد زمین آسمان اور پہاڑوں سے یگانگت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کی فضا اس مضرت رساں آمیزش سے مکدّر نہیں ہوئی تھی۔ ان کا مذہب عبادت گذاری نہیں چاہتا تھا، انکے ہاں تقدس کے مترادف کوئی لفظ ہی نہ تھا۔

اس طرح میں یونانیوں کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز سمجھتا تھا اور میرے ذہن میں اسی قسم کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ جب سنتیانا سے روم میں آخری گفتگو کرنے کے بعد میں نے سسلی میں قدیم یونانی عہد کے آثار کی سیاحت کی، ارکیوس (Syracuse.) عہدِ قدیم کا ایک نہایت شاندار شہر تھا اور یونانیوں کی نظروں میں اس کی وہی منزلت تھی جو ایتھنز (Athens.) کی تھی۔ یہ ایک بلند قطعۂ زمین پر واقع تھا جو سمندر میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے سرے پر عقل کی دیوی "ایتھینا" کا ایک مجسمہ تھا جس کے ہاتھ میں ایک نیزہ سورج کی طرف اُٹھا ہوا نظر آتا تھا، دور دراز ممالک سے سیاح جب لوٹ کر آتے تھے تو اس مجسمہ کے نظارہ سے ان کے دلوں میں اپنے گھر واپس ہونے کی مسرّت کی ایک چمک پیدا ہوتی رہتی۔ اس مجسمہ کے پاس ایک عالی شان ڈورک (Doric.) مندر تھا جس میں اس دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ یہ مندر یونانیوں کے فنِ تعمیر کے خوب صورت ترین شاہکاروں میں سے تھا اور پارتھینان کے بعد شاید یہی سب سے حسین عمارت تھی۔ اسے برباد نہیں کیا گیا تھا لیکن اس پر ایک معمولی ساخت اور بے تکی آرائش کے عیسائی گرجے کا استر کر دیا گیا تھا۔ اس قدیمی مندر کے بلند ستون اب تک پورے طور پر یا نصف شان کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ زمانۂ وسطیٰ کے گرجے کی دیواروں میں آثارِ متحجرہ کی طرح جمے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میری نظر میں یہ ایک بے حرمتی کا کام تھا اور بقول سنتیانا قدیم یونانیوں کے نزدیک "انسانی زندگی کے عملی نصب العین" کے جو چند آثار باقی رہ گئے تھے ان کے اور حسنِ تعمیر کے خلاف ایک جرم تھا۔ میرے نزدیک یہ اقدام ان مذموم اور ناگوار چیزوں کا ایک چونکا دینے والا نمونہ تھا جو خود سنتیانا کی ذات میں مجھے نظر آتی

تھیں۔ یعنی خرد پر مبنی زندگی کی دلیرانہ حمایت اور کیتھولک مذہب کے خارج از عقل عقائد کے ساتھ بے دلی، کم عقلی اور تذبذب پر مبنی عقیدت مندی کے درمیان لاینحل تنازعہ یا فریب آمیز مصالحت کا نمونہ۔ اس کی باوقار عظیم دانش مندی جس کا میری نوجوانی کے زمانہ میں مجھ پر اس قدر شاندار اثر ہوا تھا آخر کار اس اوہام پرستی کی کی زندگی کے پیچیدہ آثار کے ساتھ مخلوط ہو گئی تھی، جن سے یونانیوں نے اپنے دماغوں کو نہایت محیر العقول انداز میں آزاد کرا لیا تھا۔۔۔۔۔

سنتیانا کی موت پر اس کی خود نوشت سوانح عمری کی آخری جلد فوراً شائع کر دی گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس جلد کی اشاعت میں نے اس وجہ سے روک رکھی ہے کہ مجھے لارڈ جان رسل کی ایک نیچے طبقہ کی پرانی داشتہ کی طرف سے ہتک عزت کے دعوے کا اندیشہ ہے۔ اس جلد میں بڑے حیرت انگیز طریقہ پر مجھے ایتھینا کے مندر کے متعلق سنتیانا کے خیالات پڑھنے کا موقع ملا جس کو اس نے بھی سراکیوس جا کر دیکھا تھا۔

اس تبدیلیِ عمارت سے میرے شوقِ تعمیرات کو تحریک ہوئی۔ ایک یونانی مندر کو عیسائی گرجا میں تبدیل کرنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ حلقۂ ستون کے چاروں طرف دیوار کھینچ دو اور ستونوں کے درمیان ہر خالی جگہ کے بالائی حصہ میں ایک کھڑکی کی جگہ چھوڑ دو اور پھر کمرے کے بازوؤں کی دیواروں میں محرابیں لگا دو۔ اس طرح تمہارے گرجا کا اندرونی حصہ تو مندر کے پورے یا پورے سے کچھ ہی چبوترے پر بن جائے گا اب جہاں دیوتا کا مجسمہ نصب تھا وہاں ایک قربان گاہ بنا دو تو اس طرح گرجا مکمل ہو جائے گا، اور اگر تم دور اندیشی سے کام لے کر مندر کے دروازہ

سامنے ایک جنگلہ دار بارہ دری اور قربان گاہ کے عقب میں ایک غلام گردش باقی رکھو گے تو وہ ایک عظیم الشان گرجا بن جائے گا۔

سراکیوس میں میرے تصورات کے مطابق عمارتی نقشہ تیار نہیں کیا گیا تھا لیکن بڑے ستونوں کو اس طرح بلند دیواروں سے نہیں گھیرا گیا تھا کہ وہ بالکل چھپ جاتے اور عمارت کے روکار کا مثلث حصہ نظر آتا رہا اگرچہ وہ کسی قدر چھپ گیا تھا۔ یہ تبدیلی کسی ایک صناع کے ہاتھوں نہیں ہوئی تھی بلکہ بہت سے پادریوں کی کارگزاری کا نتیجہ تھی، لیکن پھر بھی قدیم مندر کی ہیئت اب بھی اتنی باقی رہ گئی ہے کہ اس سے پرستش کے تسلسل نیز شہری سرگرمیوں کے وجود کی جن سے اس عمارت کا تین ہزار سال تک تعلق رہا ہے شہادت ملتی ہے۔

میرے دین دار قارئین میں سے بعض حضرات شاید اس عمارت کے متعلق جو تعمیری اور مذہبی اعتبار سے بے میل عناصر کا ایک بے ڈھنگا مرکب ہے میرے تاثرات پر سنتیانا کے تاثرات کو ترجیح دیں گے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ ایک خوش اعتقاد عیسائی تھا اور عبادت سے اس کی مراد ایک زندہ و توانا خدا سے تقرب حاصل کرنا تھا تب بھی میں یہی سمجھوں گا کہ اس کا ذوق ایسا ہی غیر شائستہ تھا جیسا کہ "بہت سے پادریوں" کا جنھوں نے اپنے تخیل کے ذریعے اس دوغلے عجیب الخلقت کو جنم دیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کا مذہب ایقان سے بے بہرہ تھا اور وہ خود بھی درحقیقت ایک "ملحد" اور "مادہ پرست" تھا اور یونانیوں کے نظریۂ حیات کی منطقیانہ تکمیل کی تصدیق کرتا تھا اس لئے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے دائمی عبادت گذاری پر جو زور دیا ہے اس کا کسی پر کس طرح

ہو سکتا ہے جب اس نے مجھے یہ یاد دلایا تھا کہ وہ دہریہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ عبادت کے قیام و بقا پر زور نہیں دے رہا تھا بلکہ اس کے غیر ضروری ہونے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے اثر آفریں عقائد کی روشنی میں وہ ایک دہریہ تھا حالانکہ میں سنتیانا کی کسی بات کو اثر آفریں کہنے کے لیئے تیار نہیں ہوں۔

اگرچہ میں اس کی تصانیف کے متواتر مطالعہ سے یہ تصدیق کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنتیانا نے اپنی ابتدائی تصانیف میں اپنے اثر آفریں عقائد کا کافی اظہار کیا ہے۔ اور ان سے کام لیا ہے اس کی تصنیف "حیاتِ خرد" (The Life of Reason.) میں جہاں تک مجھے یاد ہے اخلاق کی بنیاد فطری جذبہ پر رکھی گئی تھی۔ یہ خیال امریکی تفکر میں ایک حقیقی انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے. عقل و فہم کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیئے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے جذبات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ڈھنگ سیکھنا بہت ضروری ہے۔ ہم میں سے ہر فرد کے سامنے ایک نصب العین ہے اور ہماری سب سے بڑی مسرت اس کے حصول کی کوشش میں ہونی چاہیئے لیکن نصب العین کی علت اور اس کا تنہا جواز ان غیر عقلی عضوی رجحانات میں پوشیدہ ہوتا ہے جو فطرت نے ہمیں عطا کئے ہیں اس سے ہمارے دماغوں کو جہدِ حیات کے سلسلے میں ایک اہم کام مل جاتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ شریفانہ اعمال کیئے جائیں. لیکن اس کے بعد کی تصنیف "اقالیم وجود" (The Realms of Being.) کی رو سے جس کی بنیاد اصولِ جوہر پر ہے دماغ کو کوئی تدبیری کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ محض مادی

تبدیلی اور ارتقا کے طریقہ عمل سے کھیلا کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ اس سے کنارہ کشی کرنے اور اس کو بھلا دینے میں ہماری مدد کرتا ہے تنقید نگاروں نے اس تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے اور سنتیانا نے اس کا یہ جواب دیا کہ محض مسئلہ کی اہمیت میں کچھ تبدیلی کردی گئی ہے اور ابتدائی تصانیف میں بھی بعد کے نظریات سب موجود ہیں، لیکن جب میں نے اس سے "حیاتِ خرد" کا ذکر کیا تو اس نے فوراً یہ جواب دیا (میں اپنے خیال میں حرف بحرف اس کا بیان دہرا رہا ہوں) "میں اب ان کتابوں کو پسند نہیں کرتا ہوں۔ میری بعد کی تصانیف ان سے بہتر ہیں۔"

اس نے مجھے اپنی غیر مطبوعہ سیاسی کتاب "اقتدارات و اختیارات" (Dominations and Powers.) کا ضخیم مسودہ دکھایا۔ اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے اس بات پر اظہارِ رشک کیا کہ اس نے تمام وقتی پریشانیوں اور اخباری دراندازیوں سے آزاد رہ کر اپنی زندگی بھر کے سیاسی تجربات سے جو نتائج یا حقائق اخذ کئے تھے ان کو کتابی صورت میں قلم بند کر لیا۔ اس نے سر ہلایا اور کہا "اپنی حینِ حیات میں اس کتاب کو مکمل کرنے میں مجھے بہت زیادہ کاوش کرنا پڑے گی"، پھر ہنستے ہوئے کہا "میں کوشش کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔!"

فی الحقیقت یہ بھی ایک کوشش تھی اور میری رائے میں دوسری تصانیف کے مقابلہ میں یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں تھی۔ گو اس کتاب میں عاقلانہ خیالات اور قیاسات پائے جاتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس کا طرز نگارش طوالت پسندانہ بے لطف اور غیر مربوط ہے یہاں تک کہ ابتداءً اس کے متعلق میرا یہ خیال ہوا کہ

اس نے اپنی زندگی میں سیاسیات پر جو یادداشتیں وقتاً فوقتاً لکھ لی تھیں اور جو کثیر تعداد میں جمع ہو گئی تھیں انھیں کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن جب میں نے سنتیانا کے ایک قریبی دوست برنارڈ بیرنسن (Bernard Bereson) سے یہ بات کہی تو اس نے میرے اس خیال کی صلاح کی، اور کہا کہ اس کتاب میں تسلسل اور ترتیب کے فقدان کی وجہ یہ ہے کہ دورانِ تصنیف میں کتاب کے پس منظر میں تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ سنتیانا مسولینی کی حکومت کا مدّاح تھا، چنانچہ اس کتاب کے ابتدائی ڈھانچہ کو اطالوی فاشیت کی پسندیدگی کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا تھا، لیکن کتاب مکمل ہونے سے قبل مسولینی کا دورِ حکومت ختم ہو گیا اور خود مسولینی کی لاش کو میلان کے بازار میں اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد اس کتاب نے ایک طویل اور بے نتیجہ وعظ کی شکل اختیار کر لی میں اس رائے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں سنتیانا نے مسولینی کی حکومت کی بہت تعریف کی تھی لیکن اس کتاب میں مسولینی یا اس کے سیاسی نظریہ فاشزم کا کوئی ذکر نہیں۔ اشتراکیوں کے متعلق اس کتاب میں بہت سی عاقلانہ باتیں لکھی گئی ہیں لیکن ان سے ان کی مذمّت مقصود ہے اور امریکہ کے بارے میں جس کے انہدام کی صدائے بازگشت سنتیانا نے اپنے کانوں سے سُنی اس کی یہ تصنیف حیرت انگیز طریقہ پر بالکل خاموش ہے۔

سنتیانا نے مجھ سے کہا "مسولینی کی حکومت اچھی تھی"، جن خونریز طریقوں سے اس حکومت نے عوام کے ذہنوں اور عوامی تحریکات پر اپنی سفاکی کا اثر قائم کیا تھا ان کا ذکر اس نے رواداری کے انداز میں کیا۔ چند مخالفین کو البتہ ایک

جزیرہ میں محبوس کرنا پڑا۔"

فاشستی ظلم وستم کی اس داستان کو وہ اس جملہ پر ختم کیا کرتا تھا۔

اس کے فلسفۂ سیاسیات کی خامی اس کے فلسفہ مابعدالطبیعات کی کمزوری سے مماثل ہے جس کے لئے اس نے وجود کو "اقالیم" میں تقسیم کرنے کی ترکیب نکالی ہے۔ اس کا تصور یہ ہے کہ معاشرہ میں انسانی زندگی کو مختلف دوائر میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی اقتصادی اور روحانی، اور حکومتی اقتدار کو اقتصادی دائرے میں محدود تصور کیا گیا ہے، لیکن موجودہ معاشرے میں انسان کی ہر اہم سرگرمی کے اقتصادی پہلو اور شرائط ہیں۔ اقتصادی تنظیم انسانی زندگی کے صرف ایک محدود پہلو کی تنظیم کا نام نہیں ہے۔۔۔۔ یہ تو ہماری تمام اغراض کے حصول کے ذرائع پر قابو حاصل کرنے کا نام ہے۔" جیسا کہ فریڈرک ہائیک کا خیال ہے۔ اس حیثیت سے سنتیانا کی خیالی اور مثالی قلمرو نہ صرف دنیا میں ناقابل حصول ہے جیسا کہ افلاطون کی طرح خود اس نے بھی تسلیم کر لیا ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے پُر معنی بھی نہیں ہے۔

میں اس کی (نیز فاشیت کی جانب اس کی رواداری کی) توجیہ مکمل حقیقت سے اس کے انحراف کی بنیاد پر کر سکتا ہوں۔ ایک خون آشام قزاقوں کے گروہ کی حکومت کو محض اس شرط پر برداشت کر لینا کہ وہ روحانیات میں مداخلت نہ کرے ایسے شخص کے لئے تعجب خیز نہیں ہے جو انسانی وجود ہی کو "بے قرینہ" اور "ناکارہ" سمجھتا ہو۔ انسانی ہستی کے متعلق اس کی یہ رائے نہایت صراحت کے ساتھ اس کی کتاب "اقتدارات و اختیارات" میں پائی جاتی ہے۔ اور اس کی کتاب میں نہایت

افسوسناک وضاحت کے ساتھ زخم خوردہ بچے کی زندگی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں ضعیف العمر فلسفی کہتا ہے "انسانی فطرت میں فیاضانہ جذبات تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس طرح نمایاں ہوتے ہیں جیسے کہ کسی آوارہ گرد شریر انسان کی آنکھوں میں کبھی کبھی رحم دلی کے آنسو، ذرا سطح کے نیچے تک پہونچو تو ایک خوفناک گہری اور نہ مٹنے والی خود غرضی کا سراغ ملے گا"۔ اگر بچہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو کہ اس کے والدین اس کے قدرتی دشمن اور بدخواہ ہیں محسوس نہیں کرتا ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کا قلب ابھی اس قابل نہیں ہے کہ کسی اثر کو اپنے میں سموسکے، وہ اس کے فطرتی دشمن ہیں۔ اگر گاہ بگاہ (ماں میں غالباً) اصل ہمدردی کی کوئی کرن پریشان کن محبت اور نصیحت آموز نگرانی کے دائمی بادلوں میں سے چمکنے لگتی ہے تو یہ ایسی حیرت انگیز، ناقابل یقین اور خواب کی طرح غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے طوفان یا سمندر یا جنگلی جانور اس سے عقل وفہم پر مبنی گفتگو کر رہے ہیں اور اس کی باتوں کا جواب دے رہے ہیں"۔

ایک ایسا فلسفی جسے انسانی زندگی اس نفرت انگیز رنگ میں رنگی ہوئی نظر آئے بہت سے موضوعات پر نہایت ہوشمندانہ باتیں کرسکتا ہے (اس صورت میں بھی جب وہ اپنے اس خیال کو بھول جائے کہ زندگی ذاتی خوش ادائی اور فیاضی رکھتی ہے اور گانے بجانے اور ادائے رسوم کی شکل میں اپنی ان صفات کو خراج تحسین ادا کرتی ہے)، لیکن یہ مشکل ہے کہ وہ اخلاقیات یا سیاسیات میں ہماری رہنمائی کرسکے ایسی رہنمائی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بے قرینہ اور ناکارہ چیزوں کو ان چیزوں سے جو ایسی نہیں ہیں ہوش مندانہ طور پر متمیز کرسکے۔

مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ زندگی کی حکمت و دانش کی جستجو کے لئے میں کبھی کسی پیشہ ور فلسفی کے پاس نہیں جاتا، وہ ہستی مطلق کی مجرّد بحث میں اس قدر اُلجھتے ہیں کہ اس کی ٹھوس ذاتی جزئیات کے سمجھنے میں ان سے کوئی امداد نہیں ملتی۔ سنتیانا کو ان بے شمار جزئیات کا خیال کبھی پریشان نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ میں نے دو سال کے عرصہ میں پانچ مرتبہ اس سے ملاقات کی اور ہر مرتبہ ہم دو گھنٹے تک خوش گواری کے ساتھ گفتگو کرتے رہے لیکن اس نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو یا تمھارا یہاں آنا کیسے ہوا یا یہاں سے کہاں جاؤ گے؟ خیر میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ غالباً اس کی تلافی میں نے اس طرح کرلی کہ مجھے اس سے خاص اُنس پیدا ہو گیا جیسا کہ کوئی شخص کسی نوجوان اور سادہ لوح انسان سے انس کرنے لگے جو بہت خوش اطوار اور حیرت انگیز طور پر خوبیوں سے مالا مال ہونے کے باوجود بہت سادہ طبیعت اور قابلِ اعتماد ہو۔ اپنے فلسفے کے متعلق اس کی جو روش تھی اس سے بالخصوص مجھے ایسے بچّہ کی یاد آجاتی تھی جو اینٹوں سے بہت ہی حیرت انگیز قلعہ تیار کرلے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ہر ایک اینٹ کہاں رکھنی چاہیئے۔ اور اگر اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ تمھیں عمارت کے گرد گھما کر یہ بتا دے گا کہ ہر اینٹ کہاں جمائی گئی ہے اور اس کو کیسی خوبصورتی کے ساتھ جمایا گیا ہے۔ ایک بلاک ایسا بھی تھا جس کو شک کہتے ہیں لیکن اس کو بہت ہی ہوشیاری سے مقرّرہ جگہ پر رکھا گیا تھا۔ اس پوری عمارت کی استواری اور مضبوطی پر اس کو اس قدر اعتماد تھا کہ بعض نکتہ چیں اس کے اعتماد کو ناخوش گوار خود رائی پر محمول کرتے ہیں مجھے اس کی یہ عمارت بہت ہی دلفریب معلوم ہوتی تھی۔ جو شخص ایسا شاندار محل

تعمیر کرلے اور اس کو بنا کر کھڑا کردے تو کیا وہ اس عمارت کی عمدگی کے متعلق شک وشبہ سے بالاتر نہ ہوگا!

اس نے فلسفیانہ تصوّرات کی ایک دُنیا تخیّل پسند اور نازک مزاج لوگوں کے لئے تیار کی یعنی ان لوگوں کے لئے جو مادی دُنیا سے بھاگتے ہیں لیکن اس کے اقتدار سے انکار بھی نہیں کرتے۔ اس نے اس کی تعمیر ایسی حسین زبان کے ذریعہ سے کی جس سے بہتر مثال اس قسم کی عمارات کی تاریخ میں نہیں ملتی، اور اس نے یہ کام کامل اعتماد نفس کے ساتھ کیا۔ اس کی کتابوں کی ہر سطر بڑی جسارت لیکن انکسار کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اس میں اپنی ذات سے صداقت برتنے کا ایک ہوشمندانہ لیکن ناقابلِ تسخیر عزم پایا جاتا ہے۔ اس صفت سے اس محدود قابلیت کے انسان کو عظمت کا مرتبہ مل گیا، اور اسی سے اس جادوانی شہر میں اس کا کمرۂ خواب جہاں وہ بڑے اطمینان اور بغیر کسی غلط فہمی کے انحطاط اور موت کے انتظار کا زمانہ گزار رہا تھا لوگوں کے لئے ایک خوشنما زیارت گاہ بن گیا۔ میرے لئے اس سے گفتگو کرنا زیادہ دلچسپ اور جذبات آفریں تھا بہ نسبت اس طویل غیر دلچسپ اور ناقابل یقین دماغی مشق کے جس سے کہ افلاطون کے قول کے مطابق حکیم سقراط زہر کا پیالہ پینے سے قبل اپنے دوستوں کا دِل بہلا رہا تھا۔

# پیبلو کیسلس کا سحر

۱۹۵۲ء میں میں سوئٹزرلینڈ میں رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ (Readers Digest.) کے نامہ نگار کی حیثیت سے گھوم رہا تھا اسی زمانہ میں کوہ ایلپس کے مقام زرماٹ پر ایک موسیقی کے اسکول میں کیسلس (Casals,) درس دیتا تھا یا کم از کم اپنی موجودگی سے اس کی افادیت میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں زرمارٹ پر گیا اور اسی ہوٹل میں قیام کیا جہاں اسکول لگتا تھا اور جہاں اس کا بھی قیام تھا۔ میرے پاس اس کے نام ایک تعارفی خط تھا اس لئے وہ مجھ سے تپاک سے ملا، لیکن جب میں نے وہاں کے خوبصورت مناظر کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ یہاں کی غیر معمولی بلندی سے میرا سر چکراتا ہے۔ اس نے اپنی پیشانی پر اپنا ہاتھ لگایا جس سے مجھے خیال ہوا کہ وہ واقعی بہت سرگرانی محسوس کرتا تھا۔ اس لئے باہمی گفتگو سے اس کو آزردہ خاطر کرنے کے بجائے میں نے اس کی کلاسوں میں موسیقاروں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت حاصل کرلی۔

اگر میں اس سے دس گھنٹے بھی بالمشافہ گفتگو کرتا تو اس کی شخصیت مجھ پر اس طرح آشکارا نہ ہوتی جس طرح اس کے اپنے شاگردوں اور ہم جلیسوں سے اس کی

بات چیت سُن کر ہوئی۔ جن میں بعض مشاہیر بھی تھے اور دور دراز ملکوں سے اس سرچشمۂ کمال سے سیراب ہونے کے لئے آئے تھے جب وہ تعلیم کے دوران میں کسی بات کو سمجھاتا تھا تو ساتھ ساتھ عملی طور پر اس کو اپنے چیلو پر گا کر بھی بتاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ آسمان سے بادلوں کے درمیان ہو کر زمین کی طرف جھکا ہوا کہہ رہا ہے۔ اس کو اسی طریقہ پر کرنا چاہیئے"۔ اور کوئی انسان بجز اس کے کہ وہ غور سے سنتا رہے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔

بعض اوقات وہ یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا "زندگی بسر کرنے کا یہ طریقہ ہے" کیونکہ اس کے الفاظ دانستہ اور بار باران مسائل کو بھی زیر بحث لاتے تھے جن کا تعلق چیلو پر اپنا فن دکھانے سے بہت بعید ہوتا تھا۔ متفقہ طور پر اس کو ہر زمانہ کے چیلو نوازوں میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ فرٹز کریسلر (Fritz Kreisler.) تو اس کی تعریف میں اور بھی آگے بڑھ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عظیم ترین چیلو نواز ہے، لیکن اس کا زیادہ نادر وصف یہ ہے کہ وہ اخلاقی طور پر نیز بحیثیت موسیقار کے ایک ایسے بلند مقام پر فائز ہے جو تمام دُنیا کے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ وہ کیٹلونیا کا باشندہ ہے اور وہاں کے باشندوں کی طرح آزادی کا نہایت دلدادہ ہے۔ جب فرانکو کی افواج نے شمالی اسپین پر حملہ کیا تو کیسلس نے اپنا خوبصورت ساحلی مکان جو بارسلونا کے باہر تھا چھوڑ دیا اور اپنی دَولت کو جو اس کی شہرت کی طرح کثیر تھی ترک کر کے کوہ پرینیز کی شمالی ڈھلوان پر پریڈس (1 Prades) کے قصبہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ وہاں وہ ایک چوکیدار کے مکان کی دوسری منزل کے دو کمروں میں رہنے لگا۔ جہاں سے اناج کا کھلیان صاف نظر آتا تھا۔ اس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک

اسپین آزاد نہیں ہوگا وہ اپنے گھر لوٹ کر نہیں جائے گا۔ یہاں ۱۹۵۰ء میں اسکے مداحوں نے ایک "کیسلس تہوار" ترتیب دیا۔ تمام دُنیا سے موسیقار اور موسیقی کے شائقین اس کا گانا سُننے، اس سے تعلقات قایم کرنے اور دو ہفتے اس کے ساتھ گزارنے کے لئے اس گاؤں میں جمع ہو گئے۔ ان تہواروں نے جو ہر سال ہونے لگے تھے وہی شہرت حاصل کرلی جو بیروت میں ویگنز تہواروں یا ابرام گو میں مصائب مسیح کی تمثیلوں کو حاصل تھی۔ یہ گانے دامنِ کوہ میں ایک پُرانے کلیسا کے کھنڈروں میں ہوا کرتے تھے، اور یہی مناسب تھا کیونکہ کیسلس کے ہر کام میں عبادت کا عنصر موجود ہوتا تھا اگر عبادت سے مراد زندگی کے اعلیٰ طریقوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس تہوار کے دوسرے سال یعنی ۱۹۵۱ء میں بجائے ہوئے نغموں کے ریکارڈ خریدے۔ ان کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک ایسا ریکارڈ ان کو مفت دیا جاتا تھا جس کے ایک طرف تنہا کیسلس کے نغمہ کی آواز تھی اور دوسری طرف اس کے ہاتھ کے نوشتہ اور رسالہ میں نقش کئے ہوئے یہ الفاظ تھے:

"ہر عظیم مہم یا سرگرمی کی اصل یقیناً حسنِ عمل اور تلطف ہے۔"

یہ ایک عجیب بات تھی اور غالباً بالکل بے جوڑ، لیکن اس میں ایک بڑا جادو تھا کیونکہ کیسلس کے تہواروں سے لوٹ کر جب لوگ گھر پہنچتے تو ان میں اس قدر مسرت اور امتنان ہوتا تھا کہ گویا وہ ڈیلفی کی مقدس راہ طے کرکے خود اپالو سے اس پُراسرار پہاڑ کے مندر میں مل کر آئے ہیں۔ لیکن کیسلس اپالو سے کچھ زیادہ مشابہ نہیں ہے، وہ ایک پستہ قد آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ بچّوں کے سے ہیں، بڑے گول چشمے لگاتا ہے اور اس کا سر گنج کی وجہ سے چمکتا تھا پہلی نظر میں تو وہ اپالو کے بجائے کوئی

میوہ فروش معلوم ہوتا ہے لیکن جب میں نے اس کو غور سے دیکھا، نہ صرف دیکھا بلکہ اسکی صحبت سے لطف اندوز ہوا تو مجھے اس کی شکل و شباہت میں بے پناہ قوتِ احساس اور اس کے ساتھ اس کو استعمال کرنے کی طاقت کا امتزاج نظر آنے لگا یعنی اسکے اندار میں بے انتہا قوت اور عزم راسخ موجود تھا۔ یہ چیز اور ساتھ ہی اس کا بیساختہ انکسار اور جو لوگ اسکے ساتھ موسیقی سیکھنے کے لئے جمع ہوتے تھے ان سے فن اور زندگی کے متعلق تبادلۂ خیال کرنے میں اُستادی اور پیشوائیت کے متکبرانہ انداز سے گریز، ان چیزوں کو دیکھ کر میں یہ سمجھ گیا کہ میرے موسیقار دوست کیوں ان تہواروں سے سرور کی حالت میں گھر واپس آیا کرتے تھے۔

اس نے ایک مشہور اطالوی چیلو نواز کے فن پر سخت تنقید کرنے کے بعد اس سے کہا "مجھے معاف کیجئے۔ یہ یاد رکھو کہ میں تم سے عمر میں دوگنا ہوں"۔ اس نوجوان نے جواب دیا "اگر عمر میں آپ مجھ سے آدھے بھی ہوتے تب بھی میں آپ کی تنقید کا بہت ممنون ہوتا"۔ اس کا یہ کہنا مجھے یاد ہے "ترنگی اور من موجی بنو، راگ تمھارے اندر سے اس بے تکلفی کے ساتھ نکلے جیسے کہ تم بات کرتے ہو، لیکن یہ یاد رکھو کہ آزادی کے معنی بے ضابطگی کے نہیں ہیں۔۔۔" ایک لمبے متفکرانہ وقفہ کے بعد اس نے کہا "یہ چیز ہمارے زمانہ میں بہت وسیع دائرہ عمل رکھتی ہے"۔ پھر خاموش ہو گیا۔ پھر کہا: اپنے آپ کو راگ کے حدود میں ہر وقت مقید رکھو یہی چیز تمھیں سیکھنا ہے"۔ اکثر اس کا یہ قول مجھے یاد آجاتا ہے زندگی میں اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنی بشریت سے خائف نہ ہو، اگر کوئی ایسی حسین چیز تمھارے سامنے آئے جس کو دیکھ کر تم خوشی سے چیخنا چاہو تو میں بتاؤں تمھیں کیا کرنا

چاہیئے؟ چیخو!

ایک اخبار نویس کی حیثیت سے تو میرے لئے یہ بات قابل فخر نہیں، لیکن میں نے اسی میں مسرت محسوس کی کہ کیسلس کے متعلق بالکل غیر جذباتی انداز میں یعنی اس سے گفتگو کرکے نہیں بلکہ اس کو دوسروں سے ہم کلام ہوتے ہوئے دیکھ کر میں اس کے متعلق ذاتی تاثرات قائم کروں۔ ان تاثرات سے مالا مال ہو کر میں کوہ ایلپس سے موٹر میں نیچے اترا اور جنوبی فرانس سے گزر کر پریڈیس (Prades) میں اس کا مکان دیکھا اور اس بے سقف گرجے میں بھی گیا جہاں موسیقی کے جشن ہوا کرتے تھے۔ یہاں کا منظر پُر اسرار طریقہ پر حسین تھا، تمام پھول کھل رہے تھے، سورج کے غروب ہوتے ہی چاند بڑی آب و تاب سے نمودار ہوا اور تمام رات ضوفشانی کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ مجھے اس عظیم شخص کی قربت کے احساس سے دلی فرحت ہوئی لیکن ریڈرز ڈائجیسٹ کے لئے مجھے کوئی مواد نہ ملا۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ پریگنان میں کیسلس کے عزیز دوست اور منشی جوسا میریا کاریڈر (Josa Maria Corredor) کا پتہ مجھے کس نے دیا تھا۔ اس نے کیسلس کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس زمانہ میں کاریڈر اس کتاب کے لئے مواد اکٹھا کر رہا تھا اور اس کی تالیف میں منہمک تھا، لیکن جب میں نے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو اس نے اپنا کام چھوڑ دیا اور اس کے پاس جو کچھ بھی تھا اور جتنی بھی مختصر یادداشتیں اور مراسلات اس کی میز میں محفوظ رکھے ہوئے تھے یا جو کچھ اس کے حافظہ میں محفوظ تھا وہ سب اس نے مجھے دے دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا وہ اپنی کتاب نہیں بلکہ میری کتاب لکھ رہا تھا۔ میں اس کتاب میں

کیسلس کا جو ایک قلمی خاکہ پیش کر رہا ہوں اور اس میں جو بھی رنگ بھرے گئے ہیں وہ سب اسی سے مستعار لئے ہیں، اگرچہ میں کیسلس کو اپنا دوست یا رفیق نہیں شمار کر سکتا۔

کیسلس کیٹلونیا کے ایک چھوٹے سے شہر وینڈرول ( Vendrell, ) میں پیدا ہوا تھا جو بارسیلونا سے تیس میل کی دوری پر ہے۔ اس کا باپ قصبہ کے گرجے میں ارگن بجاتا تھا اور پیبلو سرور خوانوں کے ساتھ مل کر گایا کرتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے ہر قسم کے باجے پر گایا کرتا تھا چاہے پیانو ہو، سارنگی ہو۔ جلترنگ ہو یا وائلن، اس کے جسمانی قویٰ ایسے ہی نمایاں تھے جیسی کہ اس کی گانے کی قدرتی قابلیت اس کے قویٰ سے متاثر ہو کر اس کے باپ نے اس کو گاؤں کے نجار کی شاگردی میں بٹھا دیا، لیکن اس کی ماں اگرچہ خود اس میں موسیقی کی کچھ زیادہ سوجھ بوجھ نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا لڑکا غیر معمولی قابلیت کا مالک ہے اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ دنیا کو اس کی قابلیت سے روشناس کرائے گی۔ بڑی مشکل سے پس انداز کی ہوئی کچھ رقم سے کام لے کر اس نے پیبلو کو بارسیلونا بھیجا جہاں وہ میونسپل اسکول میں تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ یہاں اسکی اپنی کوشش یا اس کی ماں کے توسط سے اس کو ایک مشہور کیفے میں رات کے وقت پیانو بجانے کی جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ میں ہوٹل کا مالک اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ ہفتہ میں ایک شب وہ قدیم موسیقی کا مظاہرہ کرے گا، چونکہ وہ ابھی صرف بارہ سال کا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے بہت ہی اچھا ساز بجاتا تھا اس واقعہ سے موسیقی کے حلقوں میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ مقامی طور پر وہ بہت مشہور ہو گیا اور لوگ

اس کو ایلینر (ElNer.) کہا کرتے تھے۔ جب اس نے ایک غیر ملکی ساز چیلو پر نغمہ نوازی شروع کی تو اس کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ اس ساز کو وہ پہلے ہی دن سے اپنا ساز تصور کیا کرتا تھا۔

موسیقی کے علم کی بدولت اور اس کی ماں کی پختہ سیرتی اور ہوش مندی کی بدولت وہ سترہ برس کی عمر میں میڈرڈ پہونچا اور اسپین کی ملکہ بادشاہ میریا کرچینا Maria Cristina.) نے اس کو ساز بجانے کے لئے بلایا، بلکہ اس پر نہ صرف اس کے گانے نے بلکہ ایک ایسی چیز نے جو اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی اور جس کو ملکہ لفظ "نیکی" سے بڑھ کر کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتی تھی جادو کا سا اثر کیا۔ تعلیم جاری رکھنے کے لئے ملکہ نے اس کو ایک وظیفہ دیا اور اس کو شاہی خاندان کے اندر ایک رکن کی حیثیت دے دی جہاں وہ اسپین کے آئندہ حکمران الفانسو سیزدہم (Alfonso XIII.) کا کھیل کا ساتھی ہو گیا۔ کارڈر نے مجھے بتایا کہ اس شاہی سرپرستی کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے کیسلس ہمیشہ بڑے احتیاط سے کہا کرتا تھا کہ یہ چیز بالکل ذاتی معاملہ سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہی سرپرستی نے اس کے جمہوریت پسند اور حریت پرور خیالات کی پرورش میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ اس کی ماں کی بھی یہی کیفیت تھی جس نے دو سال تک اس عیش و آرام اور خصوصی مراعات کی زندگی بسر کرنے کے بعد ایک دن دفعتاً یہ اعلان کر دیا کہ اب تبدیلی کا وقت آگیا ہے!

کیسلس کی ابتدائی زندگی میں موسیقی اور چیلو کے علاوہ اس کی بہادر اور عقلمند ماں اس کے لیے عظیم کشش کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور رہی نسبت سے اس کا مداح تھا۔ اپنے بچوں کو اس نے جو ہدایات کیں وہ ایپکٹیٹس

ر Epictetus. کے درس سے زیادہ ملتی جلتی تھیں اور کسی گرجا کے وعظ سے ایسی ہدایات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کوئی خارجی واقعہ تمہارے مقصد میں تغیر پیدا نہ کرے اور جس سکون واطمینان کے ساتھ تم اس کے لئے کوشش کر رہے ہو اس میں بھی کوئی پراگندگی پیدا نہ کرے۔" یہ ایک ایسا قول تھا جو کیسلس کو عمر بھر یاد رہا۔

اب اس کی ماں کا ارادہ تبدیل ہو گیا اور اس کی یہ خواہش ہوئی کہ دوسرے اولوالعزم موسیقاروں کی طرح پیبلو کو باہر جا کر اپنے فن کی تکمیل کرنا چاہیئے۔ ملکۂ اسپین کے مشیر کاؤنٹ مارفی (CoantMorphy. کا) نے اس کو میڈریڈ کے مشہور محافظ خانہ کے ڈائریکٹر کے نام ایک خط لکھ دیا۔ یہ ادارہ سرود نوازی کی تعلیم کا دنیا میں سب سے بڑا اسکول شمار ہوتا تھا۔ مارفی نے اس سے یہ بھی وعدہ کیا کہ تعلیم کے دوران اس کو دربار سے وظیفہ ملتا رہے گا۔ خط کے ملتے ہی ڈائرکٹر نے پیبلو کیسلس کو مشہور پروفیسر جیکب کی چیلو کلاس میں بھیج دیا۔ پیبلو چپکے سے کلاس میں داخل ہوا اور سب سے آخر کی رو میں بہت انکسار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کی شکل سے کوئی عظمت ظاہر نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ تمام مستند گوئیے اس زمانہ میں لمبے لمبے بال رکھتے تھے جو ان کے کندھوں پر پڑے رہتے تھے لیکن اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ جب پروفیسر جیکب نے اس سے پوچھا کہ تم کون سا نغمہ بجانا چاہتے ہو تو اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ "جو آپ پسند کریں"۔ پروفیسر نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا "اچھا تم عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو!"

پروفیسر نے جب طنز کے طریقہ پر حسب ذیل سوال کیا تو پوری جماعت نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ ایک غیر معروف اور بہت مشکل راگ کا نام لے کر اس نے کہا

مثلاً کیا تم یہ بجا سکتے ہو؟ کیسلس نے جواب دیا "جی ہاں" پھر ایک اور بھی مشکل راگ کا ذکر کر کے پوچھا "تم شاید اس کو بھی بجا سکو گے؟" کیسلس نے پھر جواب میں "ہاں" کہا۔

"اچھا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم راگ چشمہ کی یادگار (Souvenir. de. Spa.) شروع کرو۔ میرے نوجوان دوستو! اب اس نوجوان سے جو ہماری پسند کا ہر ایک گانا گا سکتا ہے۔ تم بہت ہی دل خوش کن گانا سننے کے لئے تیار ہو جاؤ!"

اگرچہ اس کو ایک مانگے ہوئے چیلو پر گانا شروع کرنا پڑا لیکن کیسلس نے اس گمنام اور مشکل راگ کو ایسی صحت اور شوخی کے ساتھ گایا کہ اس جماعت کے تمام لڑکے اور خود استاد مبہوت رہ گئے

عالمِ محویت سے بیدار ہوتے پروفیسر نے اس کو برابر والے کمرہ میں بلایا اور اپنی جماعت میں شریک ہونے کے لئے بہت اصرار کیا اور کہا کہ سال رواں کا جو انعام ہے وہ میں تم کو بغیر مزید امتحان کے دے دوں گا، لیکن کیسلس نے اس طرح کا خیر مقدم پسند نہ کیا۔ یہ اس کے شائستہ کردار کے معیار سے جو سیرت اور تلطف پر مشتمل تھا بالکل گرا ہوا تھا۔ اس نے کہدیا کہ میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا ہوں۔

اس فیصلہ سے پروفیسر جیکب کو عمر بھر افسوس رہا، اور کیسلس اپنے وظیفے سے محروم ہو گیا کیونکہ کاؤنٹ مارفی کو اصرار تھا کہ وہ بروسیلز میں قیام کرے مگر کیسلس نے بوجوہ اس کا مشورہ ماننے سے نہایت اخلاق کے ساتھ انکار کر دیا۔

اس کے بجائے وہ اس کی والدہ اور دو چھوٹے بھائی سب پیرس چلے گئے۔ وہ اس حالت میں پیرس پہونچے کہ ان کے پاس ایک پائی نہ تھی۔ وہاں کی زبان

ناواقف تھے نہ تو وہاں ان کا کوئی دوست تھا اور نہ کسی کے نام تعارفی خطوط لیکر آئے تھے۔ کم ازکم اس کی ماں کی آرزوئے انقلاب پوری ہو گئی تھی۔ شاہی عیش و آرام مفلسی اور تنگ دستی میں تبدیل ہو گیا۔

باپ نے کچھ تھوڑا سا پس انداز کیا ہوا سرمایہ ان کے لیئے بھیج دیا۔ ماں نے کپڑے سینے کا کام شروع کر دیا۔ کیسلس فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس کی ماں نے اپنے بال جو بہت لمبے اور چمکدار تھے ایک مصیبت پر قابو پانے کے لئے چند فرانسیسی سکّوں کے عوض بیچ ڈالے۔ اس نے خود بھی ماریگنی فالیز ( Marigny Follics. ) ایک دوسرے نمبر کے سارنگی نواز کی حیثیت سے ایک معمولی تنخواہ کی ملازمت اختیار کرلی لیکن اس کو اپنے مختصر سے فلیٹ سے جو حوالی شہر میں تھا۔ شہر کے مرکز کو دو مرتبہ آنا جانا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ تو سبق لینے کے لئے اور دوسری مرتبہ پیسہ کمانے کی غرض سے، اور چیلو کو اپنی پیٹھ پر لے جانا پڑتا تھا۔ اپنے ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اکثر کہا کرتا تھا "ہم نے براہ راست تجربے کے ذریعہ یہ سیکھا ہے کہ مصیبت کیا ہوتی ہے؟" لیکن مصیبت کا یہ درس اس کو بہت گراں پڑا۔ اس کو بیماری نے آدبایا اور بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کا خوش گوار خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیونکہ ان کو اپنے وطن بارسیلونا واپس جانا پڑا۔

وہاں پھر یکایک ان کی قسمت پھر گئی۔ اس کا پرانا فنی اُستاد اب ارجنٹائنا جا رہا تھا کیسلس کی عمر اس وقت اٹھارہ برس کی تھی، گرجے کی خدمات اور تعلیم دینے کے فرائض اس کے سپرد ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ملکۂ اسپین بھی اس سے خوش ہو گئی اور اب اسے اسپین کے دارالسلطنت میڈرڈ میں اپنے کمالات ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ اکیس برس کی عمر میں سارے اسپین اور پرتگال میں اس کی دھوم مچ گئی۔ تیئیس سال کی

عصر میں وہ اپنی ماں اور دونوں بھائیوں کے ہمراہ واپس پیرس پہونچا۔ اس نے اب تنا پس انداز کرلیا تھا کہ وہ تینوں اچھی طرح زندگی بسر کرسکتے تھے۔ کاونٹ مارفی نے فرانس کے مشہور نغمہ نواز چارلس لاموروو ( Charles Lamoureux ) کے نام تعارف کا ایک خط دے دیا تھا جو اس وقت موسم سرما کے لئے مجالس موسیقی کا انتظام کررہا تھا۔ جب کیسلس نے اس کے سامنے خط پیش کیا تو اس نے کچھ اظہار ناخفگی کیا کیونکہ کام کے وقت وہ کسی قسم کی دخل اندازی کو پسند نہ کرتا تھا۔ کیسلس نے واپس جانا چاہا لیکن لاموروے ایک دفعہ پہلے ملاقاتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور بڑبڑاتے ہوئے کہا "نہیں۔ تم جاؤ اور کام کرو۔ میں تمھیں پسند کرتا ہوں"۔

کیسلس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے ساز کو سنبھالا۔ اس وقت اس کی اپنی ماں کی نصیحت جو عزم اور سکونِ قلب کے متعلق تھی یاد آگئی۔ پھر اس نے ساز بجانا شروع کیا لیکن ابتدائی چند راگ سنتے ہی استاد اپنی کرسی پر جھومنے لگا۔ اس کو ایک جسمانی عارضہ تھا جس کی وجہ سے اپنی جگہ سے اٹھنے میں اس کو بڑی تکلیف ہوتی تھی لیکن جب کیسلس گانا ختم کرچکا تو وہ عظیم استاد اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اس نے کہا: "تم میری پہلی ہی مجلس میں کام کروگے!"

کیسلس کا لاموروو آرکسٹرا کے ساتھ پہلی مرتبہ پیرس میں نمودار ہونا فرانسیسی دارالسلطنت کی ثقافتی زندگی میں ایک اہم واقعہ تھا لیکن موسیقی کی تاریخ میں اس کو جو امتیاز حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں وائنا علمِ موسیقی کا مرکز تھا اور یہاں پہونچکر جب کیسلس مجمع کے سامنے آیا تو وہ اس قدر سہما ہوا تھا کہ جب اس نے بجانے کا کمانچہ اٹھانا چاہا تو اس کے ہاتھ شل معلوم ہوتے تھے اس کو استعمال کرنے سے پہلے اس نے اس کو کچھ گردش دینے کی

کوشش کی جو کہ بچپن میں ڈھول بجانے کے کھیل میں اس نے سیکھ لی تھی۔ وہ کمانچہ اس کی انگلیوں سے اچٹ کر آرکسٹرا کے بیچ میں آپڑا۔ جب لوگ اس کو اٹھا کر قطار بعد از قطار پہنچا رہے تھے تو اس کو اتنا وقت مل گیا کہ اس کے حافظہ میں پھر اپنی ماں کا قول تازہ ہو گیا "یعنی کسی خارجی واقعہ کو حصولِ مقصد کی راہ میں۔۔۔۔۔"

جب کمانچہ اس کے ہاتھ میں آیا اب اس کا ہاتھ تھما ہوا تھا اور اس نے چیلو کو ایسے کمال سے بجایا کہ کسی دوسرے چیلو نواز نے یا خود اس نے پہلے کبھی نہیں بجایا تھا۔

کیسلس کے انہماک موسیقیت میں ایک بے غرضی کی شان پائی جاتی ہے اور خود نمائی کا ایسا فقدان ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ وہ ذاتی شہرت حاصل کرنے کے بجائے آرکسٹرا کی کامیابی کا زیادہ خواہش مند تھا بحیثیت ایک منتظم کے اس کو موسیقی کی مشق کرانے میں جتنا لطف آتا تھا آخری مکمل کھیل میں نہیں آتا تھا۔ اس کو سرود نوازی سے بہت محبت ہے اور وہ لوگوں کو یہ فن سکھانا بہت پسند کرتا ہے۔ بچپن میں بھی جب بچے مل کر گایا کرتے تھے تو وہ بچوں کو تنبیہ کرنے سے باز نہیں رہتا تھا کہ ان کو اپنی آواز کا کس طرح استعمال کرنا چاہیئے، اور جب وہ بحیثیت ایک چیلو نواز کے عالمگیر شہرت کی منزلیں طے کر رہا تھا تو اپنی آمدنی سے اس نے چھ لاکھ ڈالر ایک عوامی آرکسٹرا قائم کرنے اور لوگوں کو تربیت دینے پر صرف کیے۔ یہ دنیا میں اپنی قسم کا پہلا آرکسٹرا تھا جو بارسیلونا میں قائم کیا گیا۔

موسیقی کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اس نے ایک ورکرس کنسرٹ

سوسائٹی قایم کی جس کی فیس ایک ڈالر سالانہ تھی۔ اس سوسائٹی کے ارکان کو وہ رعایتی قیمت پر گانے سُنایا کرتا تھا کیسلس کو دیہاتی لوگوں سے جو محبت تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ ان میں اور اپنے بیچ میں شہرت اور دولت کی کوئی دیوار کھڑی نہ کرے بلکہ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے وہ ہر سال اپنے پُرانے دوستوں نجار، لوہار اور جفت فروش سے تجدید ملاقات کرنے کے لئے دو یا تین مرتبہ وینڈرل ضرور جاتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اس کو اس بات سے بہت خوشی ہوتی تھی کہ مقامی گویوں کو جمع کرکے ان سے تعلقات پیدا کرے اور شاہراہ عام پر ایک مجلس نغمہ وسرود منعقد کریں۔

ایک مرتبہ سان فرانسسکو میں ایک مجلس نغمہ وسرود کے بعد وہ ایک پہاڑی پر چڑھ رہا تھا تو ایک لڑھکتے ہوئے پتھر سے کود کر اس نے مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اس حادثہ میں اس کے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی زخمی ہوگئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہوسکے گی۔ اس کے ساتھیوں کو بڑا تعجب ہوا جب اس حادثہ کے بعد اس نے یہ الفاظ کہے "خدا کا شکر ہے اب مجھے کبھی چیلو بجانا نہیں پڑے گا!" اس جملے سے اس کا یہ مطلب تھا کہ "اب میں اپنی تمام زندگی بہترین موسیقی پر صرف کرسکونگا" اس کی نظر میں بہترین موسیقی ایک قسم کی معاشرتی کامیابی ہے۔ یہ ایک نہایت تہذیب یافتہ اور باہمی خیرسگالی اور تکمیل مقصد کے رشتے میں منظم لوگوں کی مجلسِ سرود ہے۔ آخری حد تک دیانت داری، ایک دوسرا نصب العین تھا جو وہ جماعتِ سازندگان کے روبرو پیش کیا کرتا تھا اور وہ اس کو معاشرتی اطوار اور موسیقی دونوں میں کارفرما دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے فن کار اس کی ایسی ہی عزت کیا کرتے تھے جتنی کہ گرجا جانیوالے کسی ہردلعزیز پادری کی عزت کرتے ہیں۔ کئی سال گزرے جب وہ عہدِ جوانی میں

تمام رکھ رہا تھا۔ بارسیلونا میں لوگوں نے اس کے متعلق کہا وہ کیفے کو کمرۂ نغمہ و سرود میں بدل دیتا ہے اور کمرۂ سرود کو مندر میں تبدیل کر دیتا ہے۔"

آج کل تمام کیٹیلونیا کے باشندے اور کم و بیش تمام حریت پسند باشندگان اسپین بھی کیسلس کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ڈکٹیٹر کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی اُمید کی ایک نشانی بن گیا ہے۔ اس کی زندگی میں یورپ کی جمہوریت کو جو پے در پے صدمات پہونچے ہیں ان میں اس نے ہمیشہ خطرات کا خیال کئے بغیر نہایت پامردی سے انفرادی حقوق اور آزادی کے علم برداروں کا ساتھ دیا ہے۔ انقلاب سے قبل کے روس میں اس کی ہردلعزیزی اور ہنرمندی کی بدولت آمدنی بہت زیادہ تھی لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب اکتوبر کے بعد جب بالشویکوں نے "چیکا" (Cheka) قایم کر لیا اور مخالفین کو قتل کرنا شروع کر دیا تو اس نے اس ملک کا دورہ کرنے سے قطعی انکار کر دیا وہ کہتا ہے: میرا ایک ہی ہتھیار چیلو ہے۔ یہ کوئی خطرناک ہتھیار تو نہیں ہے لیکن جیسا کچھ بھی ہے یہ ہمیشہ آزادی کی خاطر لڑتا ہے۔"

جب ہٹلر نے جرمنی میں اقتدار حاصل کر لیا اور یہودیوں اور مزدوروں کی یونین کو ستانا شروع کیا تو اس نے جرمنی کا بھی اسی طرح بائیکاٹ کر دیا۔ جب مسولینی نے ہٹلر کی یہود کُش پالیسی شروع کی تو اس نے اٹلی سے بھی اسی طرز پر احتجاج کیا۔ جب فرانکو نے اسپین میں قوت حاصل کر لی تو کیسلس نے ظلم کے خلاف احتجاج کا وہی طریقہ جو اپنی نوعیت میں بین الاقوامی ہو گیا تھا استعمال کیا۔

پریڈس میں بحالتِ جلاوطنی اس کا طریقۂ زندگی ایک عالمگیر شہرت رکھنے والے موسیقار سے زیادہ راہب کا سا ہو گیا تھا۔ گاؤں کا ہر ایک شخص بلا تکلف

اس کے پاس مشورہ یا امداد یا خاندان میں بچہ پیدا ہونے یا بچہ نے اسکول میں جو امتیاز حاصل کیا ہے اس کی خبر سنانے کے لئے آتا تھا۔ جس طرح بدھ کے پاس لوگ آتے تھے اسی طرح دور دور سے کسان اس سے گفتگو کی سعادت حاصل کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے اور پھولوں کے گلدستے ساتھ لاتے تھے۔ جو کوئی بھی آتا کیسلس ہنستے ہوئے اس کا خیر مقدم کرتا تھا اور یہ الفاظ کہتا تھا "مہربانی کرکے بیٹھ جائیے!" اس معاملہ میں کسی نظریہ جمہوریت کا دخل نہ تھا۔ کیسلس عام لوگوں سے محبت کرتا ہے اور وہ اس کو خوش کرتے ہیں۔ اس کی شہرت دنیا کے ہر حصہ میں پہونچ چکی تھی تو ایک روز سہ پہر کے وقت قیام پیرس کے زمانہ میں ایک دوست جو اس کا ہم جماعت بھی تھا۔ اس کے پاس آیا اور کئی گھنٹے تک گفتگو کرتا رہا، لیکن پانچ بجے کے وقت اس کا ایک شاگرد جو برابر کے کمرہ میں اپنے فن کی مشق کر رہا تھا اس کے پاس آیا، اور بہت دیر ہونے کی شکایت کرنے لگا، آٹھ بجے آپ کو ایک مجلس سرود میں شریک ہونا ہے اور ابھی آپ نے قیلولہ بھی نہیں کیا ہے۔ ملاقاتی نے بہت زیادہ معذرت کی "آپ کو مجلسِ سرود میں شریک ہونا ہے اور میں تمام وقت آپ سے صرف اپنے اور اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق گفتگو کرتا رہا ہوں گا۔ کیسلس خاموشی سے اس کے ساتھ دروازہ تک آیا اور اطمینان سے اس کو خیرباد کہتے ہوئے کہا "آپ نے میرے ساتھ بڑی مہربانی کی ہے، آپ کے آنے سے پہلے میں آج شام کے پروگرام کے متعلق کسی قدر پریشان اور خوف زدہ سا تھا لیکن اب یہ معلوم کرکے کہ آپ اور آپ کے خاندان کے لوگ بخیر و عافیت ہیں میں بہت مطمئن ہوں۔"

اپنے بے شمار ملاقاتیوں کے ساتھ وقت صرف کرنے کے باوجود کیسلس اپنے ہاتھ سے تمام خطوط کے جوابات لکھنے کا وقت نکال لیتا ہے، صرف جواب ہی نہیں بلکہ پُرانے اخبارات کے کاغذوں سے اس نے جو فائل بنا رکھے ہیں ان کو ان میں رکھ دیتا ہے۔ کارینڈر نے مجھے بتایا کہ پریڈس کے ایک تہوار کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے چھ سو خطوط کے جوابات لکھے، علاوہ ازیں اس کو جو خط ملتا تھا وہ محفوظ کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ملاقاتی دفعتاً آ کر کہتا تھا "میرے والد نے آپ کو دو برس پہلے ایک خط لکھا تھا" کیسلس فوراً اپنی کرسی سے اُٹھتا، اپنی فائلوں کے پاس جاتا اور تھوڑی سی دیر میں وہی خط ہاتھ میں لے کر فوراً واپس آجاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہسپانیہ کے پناہ گزینوں کی امداد کرنا اس نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنا لیا تھا۔ وہ ان کو دوستانہ مشورہ بھی دیتا تھا اور مالی امداد بھی، اس محبت آمیز تلطف کی کوئی حد بھی تو ہوتی ہے، لیکن ان سطور کے لکھتے وقت تک کیسلس اس عالمِ جدید میں زندہ ہے۔ ابتدائی عہد کے ایک عیسائی کی طرح اپنی زندگی کو پڑوسی کی محبت کے لئے وقف کر کے زندگی بسر کر رہا ہے۔ حالانکہ دُنیا میں معاشرتی میل جول کے طریقوں میں بہت اضافہ و سرعت پیدا ہو گئی ہے۔

اس بیان کو متوازن بنانے کے لئے یہ کہنا ضروری ہے جو مجھے نرومانٹ میں ایک ہوشیار شاگرد سے معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ وہ حاجت مند کو فیاضی کے ساتھ بخشش کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن وہ آسانی سے دھوکے میں آنے والا نہیں ہے۔ وہ آسانی سے نشانہ بننے والا نہیں ہے۔ نیک خیالی

کے جذبہ میں اس نے آنکھیں نہیں بند کرلی ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایک نامعلوم طریقہ سے سمجھ جاتا ہے کہ اس کے کمرے میں ملاقاتیوں کا جو اجتماع ہے ان میں ہر شخص کا کیا مقصد اور نیت ہے۔ اس کے شاگرد نے کہا "کوئی شخص اس کو بے وقوف نہیں بناتا ہے۔" وہ بہت تھوڑے دوستوں کو اپنے دل کے بھید سے واقف ہونے کا موقع دیتا ہے اور انہی کو وہ 'نیک' کہتا ہے۔ نیکی کا مفہوم اس کے نزدیک تشدّد، ظلم اور ہر قسم کی آمریت کے خلاف جدوجہد ہے، لیکن اس میں ذاتی تنظیم بھی شامل ہے۔ تمام باشندگان کیٹلونیا اور بہت سے گویوں کی طرح کیسلس بھی بھڑکنے والے جذبات سے لبریز ہے لیکن وہ بھڑکتا نہیں ہے۔ وہ کبھی ایک حسین محبوب کی طرح کام نہیں کرتا، اس کا طرزِ عمل ایک یونانی فلسفی کے مانند ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے ساز کے تاروں پر کمانچہ نہیں رکھتا، البتہ اس شغل کے وقت اس کے دبے ہوئے جذبات کو شدّت کے ساتھ اُبھرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی بے تکلف اور بیساختہ حرکتیں نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کسی مافوق الفطرت قوّت کے قبضہ میں آگیا ہے، لیکن اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے زندگی بھر اپنی ذات کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھا ہے۔ ہر ایک راگ جس کو وہ بجاتا ہے پہلے اس کے ہر ایک سُر پر بہت غور کرلیتا ہے۔ اس نے چیلو کے لیے باش سوٹ ( Bach Suite ) کا بارہ برس تک بغور مطالعہ کیا، جب جا کر مجمع کے سامنے اس کے بجانے کی ہمّت کی۔ اس سے پہلے کسی سرودنواز نے اس راگ سے کام نہیں لیا تھا، اس کا مطالعہ اب بھی جاری ہے۔ نامور موسیقاروں کی مجلس میں وہ اپنے آپ کو ایک طالب علم تصوّر کرتا ہے۔ جب وہ کوئی نیا طرز شروع

کرتا تھا تو بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کر دیتا تھا کہ پچاس برس کی مشق کے بعد اب مجھے ایک نیا طریقہ معلوم ہوا ہے۔ جب ایک طالبہ نے اس سے کہا کہ ایک راگ جس کو میں عرصہ سے بجا رہی تھی اور جس کو میں خوب سمجھتی بھی تھی اب میری یاد سے محو ہو گیا ہے تو کیسلس نے جواب دیا "بہت اچھا ہوا! ہر راگ جب اس کو شروع کرو تو نیا معلوم ہونا چاہیئے۔"

کیسلس جس بلند اور مستقل طریقہ پر اپنی صلاحیتوں سے کام لیتا تھا یہ تو اپنی جگہ پر حیرت انگیز ہے لیکن اتنی زیادہ عمر ہونے پر بھی اس میں ان صلاحیتوں کا برقرار رہنا اور بھی زیادہ تعجب خیز ہے ۱۹۵۲ء میں جب میں اس سے ملا تو اس کی عمر کافی ہو چکی تھی، جب وہ اٹھتا یا بیٹھتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی ستتر سال کی عمر اب اس پر ایک بوجھ کی طرح شاق گذر رہی ہے، لیکن جب اپنے ہاتھوں میں چیلو سنبھال لیتا تھا تو یہ بوجھ حیرت انگیز طریقہ پر دور ہوتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے انحطاط پذیر جسم میں کوئی ایک شے اب بھی توانا اور پورے طور پر مسلّط محسوس ہوتی تھی۔ "یہ تو پہلے سے بھی زیادہ بہتر بجا رہا ہے!" یہ ایک مشہور اور حیرت انگیز موسیقار کا جملہ تھا جو اس جشن میں کیسلس کو سننے کے لئے نہیں بلکہ اپنے خیال میں اس کے احترام میں اضافہ کرنے کی غرض سے شریک ہوا تھا۔

دُنیائے موسیقی کا ہر ایک فرد اس زمانہ میں اس خیال سے متفق تھا، لیکن دوسرے ملکوں کے لوگ اس کی حقیقی قدر و قیمت نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اگر کوئی جسمانی ورزشوں کا ماہر ستّر برس کی عمر میں میدان میں کود کر چار ہاتھیوں کی پیٹھ پر دوہری قلابازی کھا جائے تو یہ خبر دنیا بھر میں پھیل جائے گی، لیکن جسم اور اعصاب کا ربط

اور ان پر قابو رکھنا یعنی جسمانی لچک اور طاقت کسی شخص میں اتنی قابل تعریف نہیں ہوگی جتنی کہ کیسلس میں اس عمر میں تھی۔

میری داستان یہاں ختم ہوتی ہے۔ ہر شخص کی طرح مجھے بھی معلوم ہے کہ ۱۹۵۶ء میں کیسلس پورٹو ریکو ( Puerto Rico ) چلا گیا اور وہاں اس نے ایک خوبصورت جوان لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کے ساتھ جشنِ موسیقی بھی وہاں منتقل ہوگیا اور اس جنوبی جزیرہ کی معتدل آب وہوا میں یہ جشن تین مرتبہ منعقد ہوچکا ہے، لیکن اس سال اس کے قدردانوں نے جشن کے بعد اس کو پریڈس واپس آنے اور اپنے پرانے ماحول میں پھر مجتمع ہونے کے لئے آمادہ کرلیا۔ اس کے بعد اکیاسی برس کی طویل عمر اور اس مقام کی بلندی کے باوجود کیسلس نے وہاں ایک جشن میں شرکت کی اور اپنے نوجوان ساتھیوں اور شاگردوں کو حسب معمول یہ تلقین کرتا رہا کہ اچھی طرح سرود نوازی کرنے اور بہتر زندگی بسر کرنے کا کیا راز ہے۔

# ٹراٹسکی کے ساتھ دوستی کی مشکلات

اگرچہ ٹراٹسکی کی آنکھیں زردی مائل نیلگوں تھیں لیکن اخباری نمائندے ہمیشہ ان کو سیاہ ظاہر کیا کرتے تھے۔ فرینک ہیرس ہی نہیں جس کو اس بات کا ملکہ تھا کہ در اصل واقع نہ ہونے والے امور کو بھی اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا تھا بلکہ جان ریڈ بھی اس غلطی کا شکار ہو گیا حالانکہ اس کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی ۱۹۱۸ء میں ریڈ نے انقلاب زدہ پیٹروگراڈ سے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح لکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ منحنی سا ہے، قد اوسط درجہ کا ہے، ہر وقت حرکت کرتا معلوم ہوتا ہے۔ چوڑی پیشانی کے اوپر گھونگر والے اُلجھے ہوئے سیاہ بال نظر آتے ہیں، موٹے آئینوں کے چشمے میں سے اس کی آنکھیں کالی اور خوفناک معلوم ہوتی ہیں اور اس کا چہرہ مستقلاً تمسخر آمیز نظر آتا ہے۔ ...." ٹراٹسکی نے خود کہا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ بھید معلوم ہوتا ہے میرے متعلق ہر بیان میں میری سیاہ آنکھوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے حالانکہ قدرت نے جو آنکھیں مجھے عنایت کی ہیں وہ نیلے رنگ کی ہیں۔"

میں خود اس بات کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ ۱۹۳۲ء میں پرنکیپو Prinkipo

میں کوئی بھی چیز ٹراٹسکی کی زردی مائل نیلی آنکھوں سے زیادہ تاریک اور پرہیبت معلوم نہ ہوتی تھی۔ پرسکون ہونے کی حالت میں اس کا چہرہ فرشتے کا سا معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ مضحکہ خیز بن سکتا تھا اور وہ اپنے طنز آمیز منطقی دلائل کی ایک ہی ضرب سے اپنے سحر بیان مدِ مقابل کے تار و پود بکھیر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جادو سے کام لیتا ہے۔ اس کے لہراتے ہوئے سیاہ بال اور چھوٹی سی نوک دار ڈاڑھی اس سحر آفرینی میں اضافہ کرتے تھے، لیکن یہ کوئی جسمانی کرتب نہیں تھا بلکہ ایک دماغی خصوصیت اور معاشرتی انداز فکر کا نتیجہ تھا۔

میں نے روس میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک ایک سال اور نو مہینے کے قیام میں ٹراٹسکی سے اچھی خاصی دوستی پیدا کر لی تھی۔ کیونکہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا تھا کہ میرے سامنے اپنی سوانح حیات بیان کرے اور مجھے اس سلسلے میں ایک کتاب ترتیب دینے کا موقع دے۔ یہ کتاب تکمیل تک تو نہ پہونچ سکی لیکن میں نے اس کا آدھا حصہ "لیون ٹراٹسکی" نوجوانی کی تصویر" کے نام سے شائع کر دیا۔ نو سال کے بعد ایلینا اور میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے ساتھ جبکہ اس کا محافظ دستہ اور اس کے معتمدین اس کے ساتھ پرنکپو کے جزیرہ میں جو بحیرۂ مارمورا میں ہے بارہ دن گزارے۔ اسٹالن نے اس کو روس سے جلا وطن کر دیا تھا اور اس نے یہاں پناہ لی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے اسی مقام پر بخوبی آشنا ہوئے۔ میری طرف سے تو یہ کوئی خوش گوار عمل نہیں تھا یا یوں کہیئے کہ جب تک تعلق سطحی قسم کا رہا خوش گوار رہا لیکن جیسے جیسے ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے ناخوش گواری بڑھتی گئی اور آخر میں شدید ہو گئی۔ میرے لیئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ اگرچہ میں نے ٹراٹسکی اور اسٹالن

کے باہمی تنازعہ میں ٹراٹسکی کا ساتھ دیا تھا اور میرا خیال ہے کہ کوئی سمجھدار انقلابی اس کے خلاف راستہ نہیں اختیار کر سکتا تھا لیکن ذاتی طور پر مجھے ٹراٹسکی سے کوئی انس پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ایک ہیرو کی طرح اس کی پرستش کی اور اب بھی کرتا ہوں بالخصوص جب سے کہ میں نے اس کتاب کو پڑھا جس میں اسحاق ڈائشر (Jsaac : Deutscher.) نے اس کے انقلابی کارناموں کا زوردار الفاظ میں ذکر کیا ہے لیکن ماسکو کے زمانہ قیام میں جب کہ میں اس کے عہدِ شباب کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا میں نے اپنے اندر اس سے محبت کا کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا۔ جب ہم دفترِ جنگ میں باہم ایک گھنٹہ گفتگو کرنے کے بعد واپس آیا کرتے تھے تو میں الینا سے یہی ذکر کیا کرتا تھا، لیکن میں اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکا۔ وہ خود ستائی یا خود بینی کا مجرم نہیں تھا۔ اکثر وہ اپنے دوستوں کی صفات اور ان کی سرگزشت حیات کو غور و تعمق کے ساتھ بیان کرنے کے لئے اپنے خاص موضوع سے دور چلا جاتا تھا لیکن میں نے کبھی اس کو اپنا دوست نہیں سمجھا، اس کے بچپن اور عہدِ جوانی کے متعلق ہم سے اس کی بہت بے تکلفانہ اور مخلصانہ بات چیت ہوتی تھی لیکن ہم میں کبھی قربت پیدا نہیں ہوئی، اس لئے ۱۹۳۲ء میں جب اس نے مجھے ایک تاکیدی دعوت نامہ بھیجا جس میں اس نے مجھے چند ہفتے پرنکیپو میں گذارنے کے لئے بلایا تھا اور یہ یقین دلایا تھا کہ ہم مل کر کام کریں گے اور مچھلی کا شکار بھی کھیلیں گے تو میرے دل میں کوئی پرمسرت شوق پیدا نہ ہوا، تاہم میں نے کچھ پس و پیش کے بعد اس کو قبول کر لیا۔

اگرچہ یہ واقعہ پچیس سال پہلے کا ہے لیکن میرے تاثرات اس سے متعلق

ابھی تک بالکل تازہ ہیں کیونکہ میں نے ان کو لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ میں نے انکو دو مختلف اوقات میں لکھا تھا، ایک تو ہمارے پہونچنے کے تین دن بعد شام کے وقت اور دوسرے موقع پر صبح کے وقت جب ہم ان سے رخصت ہو کر بیت المقدس جانے کے لئے گاڑی پر سوار ہوئے تھے۔ میں بعینہ انہی الفاظ میں ان تاثرات کو پیش کرتا ہوں جو میں نے ۱۹۳۲ء میں لکھے تھے۔

۱۔ تین دن بعد، جن عظیم الشان شخصیتوں سے میری واقفیت ہوئی ان میں ٹراٹسکی سب سے زیادہ منکسر مزاج اور خود فراموش نظر آتا ہے، وہ کبھی تعلی نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات یا اپنی کارگزاریوں پر کبھی گفتگو نہیں کرتا۔ وہ کبھی گفتگو پر چھا جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ہر واقعہ پر پوری توجہ کے ساتھ غور کرتا ہے۔ آج کل تمام دُنیا میں اس پر غلط فہمی اور گالی گلوچ کی جو بوچھار ہو رہی ہے اور جو مخصوص حیثیت اس کو حاصل ہے اس کے باوجود اس کے کسی ایک لفظ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں محو ہے بلکہ معمولی انسانی زود رنجی جس کی توقع ہو سکتی ہے اس کا بھی کبھی اس نے اظہار نہیں کیا جب ہم کتاب کی تالیف میں مشغول ہوتے ہیں اس وقت اگر میں اس کی کوئی تعریف کروں تو وہ ایک معمولی سا جملہ یوں کہہ دیتا ہے "مجھے خوشی ہوئی ہے" اور پھر فوراً دوسرا موضوع شروع کر دیتا ہے۔ مجھے اس کے ساتھی لوناکارسکی (Lunacharshy.) کی رائے سے اب پورا اتفاق ہے اگرچہ جب میں یہاں آیا تو مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا کہ "اس شخص میں غرور کا ذرہ برابر شائبہ نہیں ہے"۔

دیگر عظیم شخصیتوں کی طرح جن سے میں مل چکا ہوں وہ بھی کچھ تنومند نہیں معلوم ہوتا ہے۔ دماغی عظمت رکھنے والے انسانوں میں جسمانی نزاکت ضرور پائی جاتی ہے بالخصوص جب ہم گرما گرم منطقی بحث کیا کرتے تھے تو وہ جوش میں بھر جاتا اور اتنا غصہ کرتا تھا کہ اس کا سانس پھول جاتا تھا۔ اکثر مجھے وہ ہی کمزور معلوم ہوا۔ جو کشمکش اسے درپیش تھی اس سے مقابلہ کرنے کے لئے وہ بہت کمزور معلوم ہوتا تھا۔ جب میں اس کے فلسفے پر نکتہ چینی کرتا تھا تو وہ نہ تو ہنس سکتا تھا نہ اس کے متعلق کوئی تجسس کرتا تھا (جیسا کہ میں سمجھتا ہوں لینن کرتا) کیونکہ اس معاملہ میں اس کی بنیاد محفوظ نہیں تھی۔ مجھے وہ ایک ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو علمیت اور فہم کے پہاڑ کے بوجھ کی وجہ سے جس کو وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے اپنا توازن کھو چکا ہو۔ وہ کس وجہ سے بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے؟ کیا خود اعتمادی کی کمی ہے؟ کیا یہ یہودی نسل ہونے کی بنا پر احساس کمتری کی وجہ سے ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی کھیل کود میں مشغول نہیں ہوا، کبھی لہو و لعب میں نہیں پڑا۔ کبھی اپنی روح کے تقاضوں کو نہیں پہچانا یا یہ کبھی نہیں سمجھا کہ سورج کی روشنی ہر حالت میں اچھی ہے۔ جب میں نے کہا کہ جال سے شکار کرنا ایک دلچسپ مشغلہ تو ضرور ہے لیکن یہ کوئی تفریح نہیں ہے، تو اس نے جواب دیا "یہ دلچسپ بھی ہے اور ایک شغل بھی، دو خوبیاں جمع ہو گئیں ہیں اور کیا چاہتے ہو؟" میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس کیفیت مزاج کے ساتھ مچھلی کے شکار کو جانا چاہتا ہے، اس کے جذبات گہرے' اس کی رفتار تیز، اور تنظیم اور کامیابی کے لیئے تدبیر اسی طرح مکمل جس طرح کہ وہ سفید افواج کو شکست دینے کے لئے کار زار گیا تھا۔

وہ ہر چیز کے متعلق جس پر اسے اعتقاد تھا ضرورت سے زیادہ یقین رکھتا تھا۔ میرے خیال میں لینن نے جب اپنی وصیت میں اپنی جماعت کو ٹراٹسکی کی حد سے زیادہ خود اعتمادی سے خبردار رہنے کے لئے کہا تو اس کا منشا یہی تھا، لیکن سیاسی لیڈر کی حیثیت سے اس کی اس سے بھی زیادہ کمزوری یہ تھی کہ جب اس کے پختہ یقین کو ٹھوکر لگتی تھی تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ شکوک کی کس طرح قیاس آرائی کی جائے۔ ہم دونوں کا کم از کم باہم مشورہ کرنا ممکن نہ تھا۔

اس کی فراخ دلی اور بغض و عناد سے پاک ہونا اس کی حیرت انگیز صفات ہیں۔ اپنے دشمنوں کی جب وہ کوئی لفظی تصویر کھینچتا ہے تو اس میں اس کی مذکورہ عظمت مجھے نظر آتی ہے نیز بعض معمولی باتوں میں بھی یہ چیز ظاہر ہوتی ہے۔ گزشتہ روز فلسفہ پر بحث کے دوران میں ہم میں کافی کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ٹراٹسکی کانپنے لگا اور اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ اس کی بیوی بہت پریشان ہوئی اور جب ہم چائے کی میز سے اٹھ کر اسی طرح جھگڑتے ہوئے مطالعہ کے کمرے میں پہونچے تو وہ ہمارے پیچھے پیچھے اندر آئی اور بت کی طرح خاموش اور ساکت میرے پاس کچھ بلندی پر کھڑی ہوگئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے اس لئے اس کی ایک گرما گرم تقریر سننے کے بعد اس نے اس سے کہا "اچھا اس موضوع کو چھوڑیئے اور کتاب کا کام شروع کیجیے"۔

"جیسے تمھاری مرضی!" یہ کہہ کر اس نے یکلخت جنبش کی اور مسودہ نکال لیا میں نے ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور وہ حسب معمول روسی زبان کے متن پر آنکھیں جمائے رہا۔ میں نے تین جملے بھی نہیں پڑھے تھے کہ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ

ہو گیا کہ اس نے مسودہ کو پھینک دیا اور جس طرح ایک بچہ کسی نئے کھیل کی تجویز کرتا ہے مجھ سے کہا "مجھے ایک خیال آیا ہے۔ تم اور میں مل کر امریکہ کی خانہ جنگی کے متعلق ایک ڈرامہ لکھیں۔ تمھاری کیا رائے ہے!" میں اپنا دم سنبھالتے ہوئے بولا "خوب!"

"ہم میں سے ایک میں جو خامی رہے گی اس کو دوسرا پورا کر دے گا۔ تمھیں قدرت کی جانب سے انشاپردازی کا عطیہ ملا ہے جو مجھ میں نہیں ہے اور میں تم کو یہ بتا سکتا ہوں کہ درحقیقت خانہ جنگی کیا ہوتی ہے!"

اس شخص میں ایک فن کار کی سی طفلانہ دلفریبی موجود ہے۔ میرا یہ احساس کہ اس میں کمزوری ہے اور وہ اپنا بوجھ اٹھانے کی کافی طاقت نہیں رکھتا شاید اس واقعہ کی بنا پر پیدا ہوا ہے کہ ایک عملی انسان کی حیثیت سے اس کی سیرت کی تشکیل اکتسابی نظم وضبط کا نتیجہ ہے نہ کہ اس کی فطری اہلیت کا، اپنی فطری اہلیت کے زیر اثر اسے جیسا کچھ بننا چاہیئے تھا اس نے اپنے آپ کو اس سے کچھ زیادہ بنا لیا ہے یا کم از کم اس سے مختلف بنا لیا ہے، مجھے اس کا پورا علم نہیں ہے لیکن میں اپنے ان دو بلکہ تین تاثرات کو یہاں درج کرتا ہوں۔ پہلا تاثر یہ ہے کہ اس میں انانیت قطعی نہیں ہے، دوسرا یہ ہے کہ اس میں فطری فراخ دلی موجود ہے اور تیسرا یہ ہے کہ اس میں ایسے شخص کی کمزوری کی طرح کی کوئی چیز نظر آتی ہے جو اپنی ہی عظیم طاقت کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔

دس دن کے بعد،

یہ اچھا ہوا کہ میں نے یہ تینوں تاثرات فی الفور قلم بند کر لئے اس لئے کہ اب ٹراٹسکی کے مکان میں بارہ دن قیام کرنے کے بعد میرے خیالات میں اس حد تک تبدیلی

واقع ہوگئی ہے کہ ان کے تاثرات کا تحریر کرنا میرے لئے دُشوار ہوجاتا۔ میرے خیالات، میرے مفادات یہاں تک کہ میری انفرادی ہستی سے اس نے اس قدر اغماض برتا کہ میرے جذبات مجروح ہوگئے۔ ہمارے دماغوں اور احساسات میں کوئی اتصال نہ ہو سکا اس نے کبھی مجھ سے کوئی بات دریافت نہیں کی۔ میرے تمام سوالات کا جواب وہ اس طرح دیتا تھا جیسے کوئی کتاب جواب دیتی ہو یعنی نہ تو ان جوابات پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا اور نہ اس کا امکان تھا کہ ہم دونوں کے روابط میں کوئی اضافہ ہوتا۔ میں نے اس کی پالیسی پر چبھتی ہوئی تنقید کرتے ہوئے اس کو یہ بتایا کہ اس نے ان نتائج پر غور نہیں کیا ہے جو اقوام کے مسئلہ کو عالمی سطح پر لے جانے میں مترتب ہوں گے۔ اور یہ کہ اسٹالن کو اس بات کا موقع نہیں دینا چاہیئے تھا کہ وہ ایک ملک کی اشتراکیت کو ایک مسئلہ بنائے، اس طرح میں نے اسے ایک منفی دعوے کی حمایت کی طرف لانے کی کوشش کی لیکن ان اعتراضات کو اس نے ایک تحکمانہ تیزی کے ساتھ مسترد کردیا۔ میں اس کی نظروں میں ایک نو آموز کی حیثیت رکھتا تھا جس کو ان حقائق کی جو اس کے دماغ میں محفوظ تھے تعلیم دی جانے کی ضرورت تھی۔

ٹراٹسکی کی خود بینی کے متعلق جو ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے مجھے اب بھی لونا کارسکی سے اتفاق ہے۔ اس کی کمزوری اس سے بھی زیادہ پراسرار اور تباہ کن ہے وہ فطرتاً ایسے عالم میں رہ رہا ہے جس میں عوام یا طبقات کو چھوڑ کر کسی فرد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

عہدِ شباب میں وہ اپنے رفقا سے دماغی صلاحیت، خطابت اور اہلیت کار میں بدرجہا بڑھا ہوا تھا، اس لئے دوسروں سے کوئی بات دریافت کرنے کی

اس کو عادت ہی نہیں پڑی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو سمجھایا کرتا تھا۔ اس کا علم بمنزلہ صحیح علم کے تھا اور اس کے خیالات صحیح سمجھے جاتے تھے۔ اس میں کوئی لاف زنی یا تعلی نہیں، اور نہ اُس میں خود بینی یا اپنی ذات سے حسن ظن ہے۔ ٹراٹسکی خیالات اور عالمی معاملات میں منہمک رہتا ہے۔ لیکن یہ خیالات اس کے ذاتی خیالات ہیں اور دُنیا کے متعلق اس کے تصوّرات محض اس کے تصوّرات ہیں۔ اس لئے جو لوگ ستائش اور خوشامد نہیں کر سکتے وہ کمتری کا احساس لے کر اس کے پاس سے رخصت ہو جاتے ہیں، یا تو ایسا ہوتا ہے یا وہ میری طرح ناراض ہو کر چلے جاتے ہیں۔

جو لوگ خود پسند یا خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ عقل و فراست سے عاری ہوتے ہیں۔ ٹراٹسکی بہت اونچے پایہ کا خود دار لائے انسان ہے لیکن ساتھ ہی اس کی آرا عقل و ہوش مندی پر مبنی ہوتی ہیں۔ مراقی لوگ عموماً ضعیف اور بار آور کام کرنے کی اہلیت سے معرا ہوتے ہیں، لیکن ٹراٹسکی میں شباب کی ترو تازگی اور شگفتگی ہے اور بار آور کام کر سکتا تھا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا گھمنڈ، خود پسندی اور فریب خوردگی سے کس طرح مختلف ہے۔ یہ کوئی شعوری احساس نہیں ہے بلکہ ایک غیر شعوری مفروضہ ہے کہ وہ صاحبِ علم ہے اور دوسرے لوگوں کو ان کی استعداد کا جائزہ لے کر علم بہم پہونچاتا ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ فرضی دعویٰ اس نے بچپن میں اپنی ہی طبیعت سے قائم کر لیا تھا۔ میرا گمان ہے کہ شکست خوردگی کی حالت میں اس کی کمزوری، قوتِ فیصلہ کی کمی اور نکتہ رسی کے فقدان کی اصل وجہ یہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جدلیاتی ارتقا

کے تصوّر کی حمایت میں اس نے جن ناقص فرسودہ فقروں سے کام لیتا تھا۔ جب ان کی میں نے بڑی آسانی سے تردید کر دی تو وہ غصہ سے پاگل ہو گیا۔ یہ اس کو خیال ہی نہیں ہوا کہ وہ میرے خیالات کو سمجھے یا برابری کی سطح پر مجھ سے تبادلۂ خیال کرے وہ تو بالکل کھو ہی گیا۔ اسی طرح پارٹی کے بحران کے دوران میں جب اس پر بہت سے اتہامات لگائے گئے تو وہ کھو گیا تھا۔

اسٹالن نے جب سے اس کے خلاف کارروائی شروع کی تھی تو اس کی طرف سے اپنی مدافعت کے لئے کوئی ایسا اقدام نہیں ہوا جو سیاسی تدبر کے اعتبار سے احمقانہ غلطی نہ سمجھا جائے۔ زندگی میں اہم فیصلے کرنے کا جو فرض انسان پر عائد ہوتا ہے اس سے ٹراٹسکی کو بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ اس نے مجھے ایک مرتبہ بتایا کہ ابتدائے عہدِ شباب میں اس پر ایک ایسا دور گزرا جب کہ اس کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ کسی دماغی عارضہ میں مبتلا ہے کیونکہ وہ کسی معاملہ میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن سُرخ افواج کے کمانڈر کی حیثیت سے اس کو خود تعجب ہوا کہ وہ کس طرح پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ ان جرنیلوں اور کرنیلوں کے نام احکام صادر کرتا تھا جن کی ساری عمر حربی فنون کے سیکھنے میں صرف ہوئی تھی۔

اپنے کم مرتبت باپ کی ضد کے خلاف بغاوت کرنے سے ٹراٹسکی میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا جس سے ہوشیار رہنے کی لینن نے اسے تنبیہ کی تھی۔ جب اس کے اعتمادِ نفس کی عمارت متزلزل ہونے لگی تو اس وقت اس کو باپ جیسی حاکم شخصیت کی ضرورت تھی جس کی رائے کا

اس کے دل میں احترام ہو۔ اس کمی کو لینن نے پورا کیا۔ اگر آپ ٹراٹسکی کی "تاریخ انقلاب روس" کو غور سے پڑھیں جس طرح میں نے بحیثیت مترجم کے پڑھا ہے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اگرچہ وہ بعض دیگر لوگوں کو ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہے لیکن اس نے لینن اور اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے بالشویک کی اپچ یا رائے کی کوئی اہمیت تسلیم نہیں کی (مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انقلاب اکتوبر کے متعلق یہ بات صحیح ہے تاہم اگر سعی و محنت سے تحقیق کی جائے تو اس میں مستثنیات مل سکیں گے)

ٹراٹسکی نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس کی جو تجویز میرے تعاون سے ایک ڈرامہ تیار کرنے کی تھی وہ روپیہ کمانے کی غرض سے سوچی گئی تھی۔ یہاں اور برلن میں اس نے جو عملہ مقرر کیا تھا اس کو قائم رکھنے کے لئے بقول اس کی بیوی کے اس کو ایک ہزار ڈالر ماہانہ خرچ کرنا پڑتے تھے۔ اس کے سکریٹری کا یہ خیال تھا کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ خرچ ہوتا تھا۔

یہاں پرنکیپو میں اس کے سکریٹری اور مختصر نویسوں کے علاوہ تین مزدوروں کا ایک محافظ دستہ ہے جن میں سے ایک ہر وقت دروازہ پر چوکیدار کے فرائض انجام دیتا ہے، ایک سکریٹری برلن میں رہتا ہے جس کے ذریعہ سے وہاں کی لائبریری سے کتابیں اس کے پاس آجاتی ہیں اور پھر وقت پر واپس پہونچا دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ایک بیمار لڑکی مع اپنے بچہ کے پراگ میں رہتی ہے۔ ان کی بھی کفالت اس کو کرنی پڑتی ہے۔ اس کی بود و باش عیش و عشرت کے طریقہ پر نہیں ہے۔ اس کے مکان میں فرنیچر بھی نہیں ہے۔ یہ مکان ایک فوجی بیرک کی شکل کا ہے۔ اس کی خوراک بہت ہی سادہ ہوتی ہے۔ جب وہ ایک

چھوٹی سی پرولتاری جماعت کا سربراہ ہوا ہے وہ ایک وزیر جنگ کی سی عادات اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کے سکریٹری جان فرینکل نے جو چیکوسلاویہ کا باشندہ ہے اپنی تشویش کا جو مایوسی کی حد تک پہونچ چکی تھی رازدارانہ طور پر میرے سامنے اظہار کیا کہ ٹراٹسکی اب تک رسد رسانی کے افسر کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا اور اپنی نئی پارٹی اور خود اپنی جاں بازانہ مساعی کے لئے سرمایہ کا انتظام کرنے کی طرف قطعی متوجہ نہ تھا۔ ٹراٹسکی کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی، اس لئے کہ اس نے ہمیشہ حتیٰ کہ عسرت کے زمانہ میں بھی کبھی اپنی آمدنی کے مطابق اپنے اخراجات رکھنے کی فکر نہ کی۔ اگر اس کی جیب میں تھوڑی سی بھی ریزگاری ہوتی تو وہ بھی سڑک پر معمولی چہل قدمی کے دوران میں صرف ہو جاتی تھی لیکن موجودہ حالت میں عادت بڑی مصیبت کا باعث ہے کیونکہ اس کی وجہ سے وہ بعض مشتبہ اشخاص کی دیانت داری کا جو اس کے چوتھے انٹرنیشنل کے روبہ زوال خزانہ سے سب سے زیادہ ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے غلط اندازہ لگاتا تھا۔ درحقیقت کسی ایک انقلابی اصول پرست شخص کے لئے روپیہ ایک بہت ہی حقیر چیز ہے۔ لینن کے قول کے مطابق سونے کا استعمال بھی ہو سکتا ہے کہ اشتراکی سوسائٹی کے پیشاب خانوں کے تعمیر پر صرف کیا جائے، لیکن جب ہم انقلاب کے راستے پر گامزن ہوں تو اس پر کچھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ٹراٹسکی کے مکان میں زندگی کی آسائشوں اور جمالیاتی اسباب کا نہ ہونا اور زندگی کے فن کی شعوری ترقی کے لئے ذرا سی بھی کوشش کے آثار کا غائب ہونا میری نظر میں بہت ہی نفرت انگیز بات تھی۔ اس عریاں بیرک میں اگر کسی مرد یا عورت

کو رکھنے پر مجبور کر دیا جاتا تو جمالیاتی اعتبار سے یہ اس کے لئے تقریباً موت کا پیغام ہوتا جب کہ ہر اس بیرک کو چند ڈالر خرچ کرنے سے ایک دل کش مکان میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس مکان کی دو منزلوں کے درمیان میں ایک وسیع ہال ہے جسے صحیح معنوں میں ہال نہیں کہہ سکتے۔ وہ بیس فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا ایک کمرہ ہے جن میں دو بڑے بڑے دوہرے دروازے ہیں جو برآمدے میں کھلتے ہیں۔ اس برآمدے سے نہایت گہرا نیلا سمندر سامنے دیکھنے سے نظر آتا ہے اور نیچے کی طرف دیکھنے سے یہ چمکدار سرخ چٹانوں والا جزیرہ نظر آتا ہے جو اس طرح سمندر کی طرف جھکا ہوا ہے جیسے کہ زمانۂ قبل تاریخ کا کوئی جانور پانی پی رہا ہو۔ ان بڑے کمروں اور برآمدوں میں کوئی اور فرنیچر ہونا تو درکنار ایک کرسی بھی موجود نہیں ہے وہ محض کمروں میں آنے جانے کے راستہ کا کام دیتے ہیں اور دونوں طرف کے کمروں میں جانے کے دروازے بند رہتے ہیں۔ ان کمروں میں سے ہر ایک میں ایک دفتری میز یا بستر یا دونوں چیزیں کسی نے ڈال رکھی ہیں اور ان کے ساتھ ایک ایک کرسی بھی ہے۔ ان میں سے ایک کمرہ جو زینہ کے نیچے ہے بہت چھوٹا اور مربع ہے۔ اس کی دیواریں سفید ہیں اور اس میں میز اور کرسیوں کے سوا مشکل سے کسی اور چیز کے لئے جگہ ہے۔ یہ کھانے کا کمرہ ہے۔ اس مکان کے گرد جو باغ ہے وہ گھاس سے بھرا ہوا ہے اور اب یہ گھاس بھی بیج میں تبدیل ہو رہا ہے۔

نیٹیلا آئی وے ناوُنا (Natalia Ivanovna) کا کہنا ہے کہ یہ حالت روپیہ بچانے کی غرض سے ہوئی ہے، لیکن میرا کہنا ہے کہ یہ جمالیات کی طرف سے قطعی غفلت کا نتیجہ ہے۔ ٹراٹسکی نے اپنی تصنیفات میں تو فن کا بہت

کچھ ذکر کیا ہے اور اپنے متعلق بھی یہ دعوے کرتا ہے کہ میرا ذوقِ فن بہت پختہ ہے لیکن اس کو فن سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ اس باغ سے۔ میں ایک روز استنبول کے آثارِ قدیمہ کے عجائب خانہ سے سیڈن (sidon) کے بادشاہ ٹوبیوٹ (Tobuit) کے ایک بہت نادر و خوبصورت حجری تابوت کی تصویر گھر لایا۔ میں نے ٹراٹسکی سے کہا کہ کیا آپ سنگ تراشی کا ایک نہایت خوبصورت نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں؟ اس نے جلدی سے ان کو ہاتھ میں لیا اور فی الفور ویسی ہی بیتابی کے ساتھ واپس کرتے ہوئے کہا "یہ تم کو کہاں سے مل گئے"؟

میں نے جواب دیا "یہ سیڈون کے کھنڈروں کو کھود کر نکالے گئے ہیں"۔

اس نے پوچھا ان کو کس نے کھود کر نکالا، شلیمن (Schliemann) نے"؟

میں نے کہا "نہیں۔۔۔" لیکن اس عرصہ میں وہ دروازہ سے نکل کر کھانے کے لئے جا چکا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس واقعہ کا اس پر صرف اتنا اثر ہوا کہ اس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر شلیمن سے اپنی واقفیت کا اظہار کرنا چاہا۔ مجسّمہ سے اس کو بالکل دلچسپی نہ تھی۔

اگرچہ اس کی تصانیف سے یہ پتہ نہیں چلتا لیکن عملی زندگی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کو لطف اندوزی اور قدردانی کی دولت بالکل نہیں ملی تھی۔ میرے خیال میں ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے اس کی ناکامی کی وجہ یہی ہے کہ اس نے کسی شخص کی قدر نہیں کی۔ اپنا ایک خاص گروہ بنانے سے وہ ایسا ہی قاصر تھا جیسے کہ ایک مرغی گھر بنانے کی اہلیت سے۔ اگرچہ اس کا اخلاق دل فریب تھا اور وہ خوش وضعی کے تمام ضوابط کی پوری پابندی کرتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات

وہ دوسروں کو آسائش مہیا کرنے پر خاص توجہ دیتا تھا لیکن اس کی معاشرتی اہلیت اور دوستی کا ملکہ تقریباً اسی سطح پر ہے جس پر کہ ایک کھلیان کے پرندکا ہوتا ہے اسکے معتقدین جو در اصل اس کے غیر معمولی دماغ کے مداح ہیں جس میں میرے نزدیک اس زمانہ کی بہترین سیاسی فراست موجود ہے اس کی زیارت کو آتے ہیں لیکن جب واپس ہوتے ہیں تو ان کے قلوب گرم جوشی اور روشنی سے لبریز ہونے کے بجائے افسردہ و ملول ہوتے ہیں۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جن میں ذاتی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ موجود ہوتی ہے۔ اس لئے اصل معنوں میں وہ صاحبِ اثر نہیں ہے۔ وہ مضبوط ارادے والے لوگوں پر قابو نہیں پا سکتا البتہ کمزور انسانوں کو اپنے زیر اثر کر لیتا ہے۔

ٹراٹسکی خوش مزاج ہے اور اس کو اس پر ناز بھی ہے، لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کی خوش طبعی بالکل تمسخر اور چھیڑ چھاڑ پر مشتمل ہے۔ وہ دوسروں کی نمایاں خصوصیات، ان کی قومیت، پیشہ اور دیگر حالات اور رجحانات کا ہمیشہ مذاق اُڑاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نیک طینتی سے ہنستے ہوئے اور دلفریب طریقہ پر کیا جاتا تھا لیکن اس میں نہ تو خود اپنی ذات پر کوئی پھبتی ہوتی تھی اور نہ عام انسانوں کی مضحکہ انگیز بدحالی کا کسی خوش آیند انداز میں اعتراف ہوتا تھا اور جب کوئی دوسرا شخص اس تمسخر میں شریک ہو کر خود اس پر بھی پھبتیاں کسنے لگتا تو وہ خود ہنستا نہیں تھا اور اگر ہنستا بھی تھا تو اس کی ہنسی اس قدر خوش گوار اور مخلصانہ نہیں ہوتی تھی جیسی کہ اس وقت جب وہ دوسروں کا مذاق اُڑاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹراٹسکی کے زندہ دلانہ تمسخر پر اتنی سخت نکتہ چینی کرنا کینہ پن

اور ذلّت کی حد تک پہونچتا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر آپ خود اس کی چھیڑ چھاڑ کو بطیب خاطر قبول کرنے کو تیار رہوں اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی دیتے رہیں تو وہ بہت مسرت بخش ہو سکتا تھا لیکن چونکہ میں نے فن تبسم اور خود ٹراٹسکی کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے اس لئے میں اس پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا، میرے نزدیک یہ ایک سطحی وصف ہے لہذا میرے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔

اب رہی اس کی درشت مزاجی اور اس کی مستقل خصوصیت ایجاز کلام جس کی بنا پر لونا کارسکی نے اس کو "پریشان کن" کہا ہے اس معاملہ میں میں تنقید سے خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ باتیں دراصل اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ٹراٹسکی میں دوسروں کی خودداری کو ملحوظ رکھنے کا مادہ جبلی طور پر نہیں ہے اور ایسے شخص میں جو اپنی خودداری کے مطالعہ میں بہت ہی حساس واقع ہوا ہو یہ چیز بہت ہی افسوسناک ہے، لیکن جہاں دوسروں کا خیال نہ کرنے سے خود اس کے مفاد کو نقصان پہونچتا ہو وہاں بھی وہ دوسروں کے ذاتی مفاد کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس معاملہ میں صاف گوئی سے کام نہیں لیتا اور اپنے دوستوں کو بھی مغالطہ میں رکھتا ہے، چونکہ ٹراٹسکی کی یہ کمزوری کہ وہ اپنے دوستوں کو بددل کر دیتا ہے تاریخی حیثیت کی حامل ہے اس لئے مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک واقعہ کے چند معمولی جزیات جن کی کسی اور لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن جن کی وجہ سے مجھے اس سے جدائی اختیار کرنی پڑی یہاں بیان کر دوں۔

جب ٹراٹسکی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آیا تو میں کچھ عرصہ کیلئے اس کے ایک غیر سرکاری ادبی گماشتے کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ آخر میں مجھے رائلٹی کی رقم میں سے اُجرت ملتی تھی۔ میں یہ دعوے تو نہیں کرتا کہ میں نے غیر معمولی حد تک اس کے ساتھ فیاضی برتی، لیکن جب وہ جلاوطن کی حیثیت سے پہلی مرتبہ امریکہ آیا تو میں نے اس کا بہت سا کام بلامعاوضہ کیا۔ ۱۹۳۱ء کے آخر میں اس نے ایک مضمون میرے پاس بھیجا کہ میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے فروخت کردوں اور اس نے اسکی آمدنی کا بیس فی صد مجھے حق خدمت کے طور پر دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس مضمون کا معاوضہ دو سو ڈالر تک ملنے کی اُمید ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ کر دیا اور جارج بائی کے پاس لے کر گیا جو ایک ہردلعزیز ادبی ایجنٹ تھا۔ اس نے یہ مضمون پندرہ سو ڈالر کے عوض لبرٹی میگزین کو دے دیا، اس رقم میں سے دس فی صدی تو جارج نے لیا اور دس فی صد میں نے ترجمہ کا معاوضہ لے لیا۔ یہ معاملہ کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوا اور جارج نے جو فیاض منش تھا یہ طے کیا کہ آئندہ وہ خود تو مضمون کی فروخت کی اُجرت پانچ فی صد لے گا اور مجھے ترجمہ کرنے کا معاوضہ پندرہ فی صد دے گا۔ اس باہمی معاہدہ کی اطلاع ٹراٹسکی کو بھی کر دی گئی ہم نے اس کے دو یا تین اور مضامین اسی طرح فروخت کئے اور وہ بہت خوش تھا۔

یہ معاملہ بخیر و خوبی چلتا رہا یہاں تک کہ ایک روز اسٹالن کے متعلق اس نے ایک مضمون بھیجا۔ میں اس وقت ایک تقریر کرنے کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا اور اس لئے ترجمہ کرنے میں چند ہفتوں کی تاخیر ہو گئی۔ اسی دوران میں اس کی کتاب کے

ناشرین نے ٹراٹسکی کو اخباری نمائندوں سے ملاقات کرنے کے لئے اس قدر تنگ کیا کہ اس نے ان سے ملاقات کی اور اس مضمون کا لب لباب ان کو بتا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مضمون کی قیمت گر گئی۔ پھر بھی جارج نے نیویارک ٹائمز کے منتظمین کو مجبور کر کے اس مضمون کے سو ڈالر وصول کر لیئے اور اس کی خوب اشاعت بھی کرا دی جس کی خواہش ٹراٹسکی کو روپیہ سے بھی زیادہ تھی۔

تاخیر، کم اُجرت اور خود اس کی زبردست غلطی جو اس نے اخباری نمائندوں سے ملاقات کر کے اپنے مضمون کے مفہوم کو ظاہر کرنے میں کی تھی ان سب چیزوں نے مل کر ٹراٹسکی کو ضرورت سے زیادہ مشتعل کر دیا۔ اس نے مجھے نظر انداز کر کے جارج بائی سے براہ راست معاملہ طے کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس سے یہ طے کر لیا کہ وہ کوئی مترجم بھی تلاش کرے۔ میں جس دن پرنکیپو آیا تو جارج کا ایک طویل مراسلہ ٹراٹسکی کی میز پر پڑا ہوا میری نظر سے گزرا۔ اس سے مجھے اس کا کچھ شبہ تو ہو گیا تھا لیکن میں نے اس بارہ میں اس سے کچھ کہا نہیں۔ دوسرے دن صبح جب میں نے اس خط کو میز پر تلاش کیا تو وہ وہاں سے غائب تھا۔ چونکہ جارج بائی کے متعلق جو کچھ بھی اس کے علم میں تھا وہ میرے ہی توسط سے پہونچا تھا اور اس کو جارج سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لئے اس خط کی بابت میرا اشتیاق زیادہ ہو گیا اور بداخلاقی کا خطرہ مول لیکر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس کو مجبور کروں وہ اس معاملہ کو صاف صاف بتا دے اس نیت سے میں نے بظاہر بے تعلقانہ طور پر اس مراسلہ کے متعلق ٹراٹسکی سے سوال کیا۔ اس نے بڑے تذبذب سے جواب دیا "بے شک جب تم نے مجھ سے یہ کہہ دیا کہ تم فلسطین جا رہے ہو اور وہاں سے واپس آنے کے قبل مجھ سے نہیں مل سکو گے

تو میں نے یہ سوچا کہ ایجنٹ سے براہ راست رابطہ کیوں نہ پیدا کر لیا جائے "
میں نے جواب دیا "یہ تو آپ نے ٹھیک کیا کہ جارج بائی سے آپ نے براہ راست معاملہ طے کر لیا اگر آپ کی یہی خواہش ہے لیکن براہ کرم یہ یاد رکھیئے کہ میرا اس سے ایک معاہدہ ہے کہ وہ اپنی کمیشن میں سے مجھے پانچ فی صد رقم دے گا اب اگر آپ اس معاہدہ کا ذکر کیئے بغیر اس سے معاملہ طے کر لیتے ہیں تو میری آمدنی کا ایک حصہ مارا جائے گا"

اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جس کے یہ معنی ہوئے کہ نہ تو اس نے دوستی کا لحاظ کیا اور نہ اس نے میری بلا معاوضہ خدمات کی کچھ قدر کی۔ وہ اسٹالن والے مضمون کی وجہ سے ناراض تھا۔ میں بھی اس وقت اس بات سے بہت خوش تھا کہ آئندہ ہر ہفتہ ایک ضرورت سے زیادہ طویل مضمون کے ترجمے کی زحمت سے بچ جایا کروں گا، لیکن میں نے اس کو یہ بتایا کہ جارج بائی کے پاس روسی زبان سے ترجمہ کرنے والا کوئی شخص نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اس نے تیزی سے صرف اتنا کہا "نہیں یہ بالکل ناممکن ہے اس حالت میں کہ کوئی یورپ میں گشت کر رہا ہو۔ اسٹالن والے مضمون کا جو حشر ہوا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بات ناممکن ہے۔ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ کسی ذمہ دار ایجنٹ سے براہِ راست معاملہ طے کروں۔"

جس سخت اور خشمگین لہجہ میں اس نے مجھ سے یہ بات کہی اس سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جس وقت اسٹالن کے متعلق مضمون میرے پاس پہونچا تھا اگر میں مکان پر ہوتا اور اس کا ترجمہ کر کے فوراً ہی بڑی قیمت پر، فرض کیجئے لبرٹی کو،

فروخت کر دیتا تو جب ٹراٹسکی نے اس مضمون کا خلاصہ پریس کے نمائندوں کو بتایا
اس وقت یہ چھپ چکا ہوتا اس کے نتیجہ میں ادارتی دفتروں میں بحران پیدا ہو جاتا
اور آئندہ کے لئے ٹراٹسکی کے مضامین کی اشاعت سے بالکل انکار کر دیا جاتا میں نے
اس معاملہ کو ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے پھر تیزی سے دخل اندازی کر کے
مجھے روک دیا "نہیں اس قسم کی تاخیریں نہیں برداشت کی جاسکتیں۔ یہ قطعی ناممکن ہے
کہ مترجم تو ایک مقام پر ہو اور مضمون کی فروخت کرنے والا دوسرے مقام پر"۔

غرض یہ کہ مجھے علیحدہ کر دیا گیا اور چونکہ مجھے اس سے دلی طور پر مسرت
ہوئی تھی، اس لیے میں خاموش ہو گیا اور ہم نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

ہم دونوں لسانیات کے بڑے شائق تھے، اور کام کے درمیان میرے
لئے ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ وہ مجھے اپنی ناگوار انگریزی میں امریکی اور برطانوی
اخبارات کے نامہ نگاروں کے سوالوں کے جوابات لکھوا دیا کرتا تھا جن کو میں گھر
لے جاتا اور ان کی اصلاح کر کے اور اپنی مشین پر ٹائپ کر کے دوسرے دن اس کو
دے دیا کرتا تھا۔ اسی روز سہ پہر کو اس نے اوہیو (Ohio) کی ایک خاتون کا ایک
خط نکالا جس میں اس نے اپنے رشتہ داروں کے متعلق جو روس میں مقیم تھے کوئی جاہلانہ
سوال کیا تھا، اور مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس عورت کو جانتے ہو۔ میرے انکاری جواب
پر اس نے کہا میرے خیال میں اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، میں نے بھی
اس سے اتفاق کیا اور اس نے چٹھی کو مسل ڈالا یا عنقریب تھا کہ میں اس کو مسل کر
ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں لیکن اس نے مجھے ایک ایسی چیخ مار کر روکا کہ گویا
میرا پاؤں کسی بچے کے منہ پر جا پڑا ہو" کیا اپنے مراسلات کے ساتھ تم اسی قسم کا برتاؤ

کرتے ہو؟ تم کس قسم کے آدمی ہو؟ اس چٹھی کو قائل کیا جانا چاہیئے!"

میں نے خط کی سلوٹیں دور کیں اور اپنی غلطی پر ہنستا رہا اور یہ کہکر اس کو خط واپس کر دیا کہ جب چٹھی کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی میرے خیال میں وہ اتنی اہم نہیں تھی کہ اس کو قائل کیا جائے۔

کچھ عرصہ تک اسی موضوع پر آپس میں خوش گوار چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی اور ہم بالکل مخلصانہ طور پر اس موضوع پر مذاقیہ گفتگو کرتے رہے۔

دوسرے دن ٹراٹسکی کے دوسرے ملازمین کی طرح میں بھی اس کی مالی مشکلات کے پیش نظر پریشان ہوتا رہا (کم از کم اس لحاظ سے وہ کارل مارکس کا سچا پیرو تھا) یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر اس کے مضامین جارج بائی کے پاس بھیجے گئے اور اگر اس نے کسی ایسے شخص سے ترجمہ کرائے کہ جس کا لب و لہجہ روسی ہوا تو امریکن پریس سے اس کی پندرہ سو روپیہ ماہانہ آمدنی کا جو آخری ذریعہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی جاتا رہیگا چنانچہ میں نے ہمت کر کے پھر وہی سوال اٹھایا جس پر اس کو اتنا غصہ آیا تھا (یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ٹراٹسکی ایک عظیم المرتبت شخصیت کا مالک تھا اور اسٹالن جیسے بیدرد منتقم کے ہاتھوں اس کو اس قدر تکلیف دہ تجربات ہوئے تھے کہ کوئی شخص اب اس سے بغض یا کینہ نہ رکھ سکتا تھا۔)

میں نے کہا "اس معاملہ میں آپ کو روکنا میرے لئے پریشان کن ہے کیونکہ خود میرا مالی مفاد اس سے وابستہ معلوم ہوتا ہے، لیکن پھر بھی میں آپ کو متنبہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اگر آپ مترجم کو تلاش کرنے کا معاملہ کسی تجارتی ایجنٹ پر چھوڑ دیں گے۔ تو ایک ہی مہینہ میں وہ سب وقار، جو آپ نے امریکن پریس میں بحیثیت

ایک انشا پرداز کے حاصل کیا ہے ضائع ہو جائے گا۔ بلاشبہ آپ کے وہ بیانات جو روز مرّہ کے سوالات کے جواب میں دیئے گئے ہوں گے شائع ہو جائیں گے کیونکہ آپ یون ٹراٹسکی ہیں، لیکن یہ چیز امریکی جرائد میں اچھے معاوضہ پر مضمون دینے سے مختلف ہے۔"

میں کم از کم یہ تشریح پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے درمیان ہی میں بے صبری سے چلا کر کہا "نہیں ہرگز نہیں۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے مضامین ایسے شخص کے پاس بھیجوں جو اپنی خط و کتابت کو اُٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے!"

اس نے میری اس حرکت کی نقل کی جو میں نے ایک دن پہلے (اس کے ایک خط کے سلسلہ میں) اختیار کیا تھا، لیکن اس مرتبہ اس نقل میں خوش مزاجی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک اس بات پر ناراض تھا کہ اسے اسٹالن والے مضمون کی قیمت کم وصول ہوئی تھی۔ اس پر میرے دل میں جو غصہ پیدا ہوا اس کی صحیح طور پر وجہ سمجھنے کیلئے آپ کو یہ یاد رکھنا ہوگا جیسا کہ مجھے اُس وقت یاد تھا کہ میں نے اس کے مالی مفاد کے تحفظ کیلئے دو سال تک تندہی سے محنت و مشقت کی تھی اور امریکی پریس سے جو کچھ اسے حاصل ہو رہا تھا اس کے حاصل کرنے کا طریقہ میں نے ہی اسے بتایا تھا۔ اگر وہ لیون ٹراٹسکی کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو میں اپنے اس غصہ کا اظہار نہایت سخت الفاظ میں کرتا اور چلا جاتا۔ ایسا کرنے کے بجائے میں خاموش بیٹھ گیا یہاں تک کہ میرے دل میں ایک چمکدار خیال آیا۔ زندگی بھر میں صحیح بات ذہن میں آنے کے جن چند مواقع پر میں فخر کر سکتا ہوں ان میں سے ایک موقع یہ تھا۔ میں نے کہا

"لیف ڈیویڈوچ۔ میں اس کا جواب آپ کو لینن کے الفاظ ہی میں دے سکتا ہوں۔" اور میں نے صحیح روسی زبان میں لینن کی مشہور وصیت کے یہ الفاظ پیش کیے: "کامریڈ ٹراٹسکی کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ معاملات کے انتظامی پہلو سے نمٹنے میں صحیح راہ سے بھٹک کر بہت دور چلا جاتا ہے۔" اس پر ٹراٹسکی ڈھیلا پڑ گیا اور اپنی کرسی پر تکیہ لگا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ خوش مزاجی کے ساتھ پورے طور پر ہنس رہا تھا گویا وہ یہ کہہ رہا تھا "بہت تیز ہو تم"۔

ایک لمحہ کے بعد وہ پھر سیدھا ہو بیٹھا اور گفتگو شروع کی۔ اب اس نے اس بات پر زور دیا کہ میں نے دوسرے مضامین مثلاً ہٹلر کے متعلق ایک مضمون پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔ یہ وہ مضمون تھا جسے زیادہ معاوضہ دینے والے رسائل نے لینے سے انکار کر دیا تھا اور آخر کار جارج نے اسے 'فورم' کے پاس تین سو ڈالر میں فروخت کر دیا تھا۔ اب اس کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ کوئی مورد الزام ہو سکتا تھا۔

اس مقام پر میں مایوس ہو گیا۔ ایک مرتبہ اور زیادہ زور کے ساتھ میں نے اپنی اس تنبیہ کو دہرایا کہ اگر ایک مضمون بھی برے ترجمہ سے کسی اخبار میں نمایاں طور پر شائع ہو گیا تو اس کے نفع بخش مواقع برباد ہو جائیں گے میں نے یہ بھی کہا کہ جب میں کسی جگہ اطمینان سے کام شروع کروں گا تو میں آپ کو اس کی اطلاع دے دوں گا خواہ آپ اپنے مضامین مجھے بھیجیں یا نہ بھیجیں یہ آپ کی مرضی ہے۔ وہ مضمون مجھے بھیجے گا یا نہیں اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ بات کہ وہ میرے مفادات کو سامنے رکھ کر یا ان خطرات کے پیش نظر

جو میں نے اس کاروبار میں جائزہ طور پر پڑ کر اٹھائے تھے کوئی کام کرے گا میرے نزدیک ناممکن تھا۔

"مایوس ہو گیا" کے الفاظ سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے ٹراٹسکی سے دوستانہ گفتگو کرنے کی کوشش ترک کر دی۔ اس سے قبل میں نے نظری مسائل پر ایسی گفتگو ترک کر دی تھی اور اب عملی امور سے متعلق بھی ایسا ہی کیا۔ میں وہاں سے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے جس قدر جلد ممکن ہوا چلا آیا اور عذر یہ پیش کیا کہ مجھے ایسے وقت پر یورپ واپس پہونچنے کی ضرورت تھی کہ میں اس کی تاریخ کی دوسری جلد کے پروف صحیح کر سکوں۔ آخر وقت تک ٹراٹسکی اس بات پر زور دیتا رہا کہ ہم کم از کم چند مہینے اور ٹھہریں تاکہ وہ اور میں مل کر کام بھی کریں اور مچھلی کا شکار بھی کھیلیں۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا وہ ہمارے باہمی تعلقات کی سرد مہری اور بے ثمری کو نہایت آسانی سے فراموش کر چکا تھا۔

بالشویک انقلاب کی کامیابی نیز اس کی ناکامی کی داستان ٹراٹسکی کی سیرت کے ساتھ اتنے پیچیدہ طور پر وابستہ ہے کہ مورخین اس میں برابر دلچسپی لیتے رہیں گے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس یادداشت کے ذریعہ جو اس سے ملاقات کے فوراً بعد لکھی گئی ہے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

پرنکیپو سے جب میں گھر جا رہا تھا تو میں پیرس میں ٹراٹسکی کے ایک سب سے بڑے مداح اور گہرے دوست سے ملا (میرے نزدیک وہ کرنسکی کے بعد سب سے گہرا تھا) اور ہم نے ٹراٹسکی کی سیرت کے دقیق تضادات پر گفتگو کی۔ جب میں نے بڑے پس و پیش اور جستجو کے ساتھ یہ کہنے کی کوشش کی کہ اس میں موجود

افراد کے لئے ہمدردانہ جذبات کی کمی معلوم ہوتی ہے تو اس کے دوست نے مختصراً یہ کہا۔ "یہ بالکل صحیح ہے، اس میں ہمدردی کا مادہ نہیں ہے، یہ چیز اس کے قریب بھی نہیں گئی"۔

میرے تاثرات کی ان شدید الفاظ میں حیرت انگیز تصدیق ہو جانے کے باوجود مجھے یہ احساس ہے کہ میں نے اپنی یادداشت میں سے کوئی ایسی چیز حذف کر دی ہے جسے اس میں شامل ہونا چاہیئے تھا اور وہ میرا یہ اعتراف ہے کہ میں ایک دوسرے شخص کے مفادات بلکہ اس کے نہایت اہم جذبات کا پورا لحاظ کرنے سے قاصر رہا تھا۔ اس جلاوطن شخص پر جس کا ہم خیال یہاں کوئی نہ تھا اس کے اس مذہبی عقیدہ کے خلاف جس کی رہنمائی میں اس نے زندگی میں کامیابی حاصل کی تھی اور بعد ازاں موجودہ اندوہناک انجام کو پہونچا تھا بے شمار تازہ بہ تازہ دلائل کی بوچھار کرنا میرے لیئے کسی طرح ہوشمندی اور تدبر کی بات نہ تھی۔ اس وجہ سے وہ ضرور مجھ سے ناراض ہوا ہوگا۔ اس کے بعض افعال کا جنھیں میں نے زیادہ معمولی اسباب اور اس کی شہرت کی عام خصوصیات پر محمول کیا غالباً اصل سبب میرا ہی قصور تھا۔ ہماری بعد کی خط و کتابت میں مجھے ایک خط ملا ہے جس میں اس امر کا تذکرہ کرنے کی اس نے خاص طور پر زحمت کی ہے کہ اس نے ایک خاص مسودہ جارج بائی کو براہ راست صرف اس بنیاد پر بھیجا تھا کہ اسے میرے گھر پر نہ ہونے کی اطلاع دی گئی تھی، گویا اس طرح اس نے ایک ایسے زخم کو جس کا نام نہیں لیا

گیا تھا مندمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ٹراٹسکی دوسروں کے مفادات کا لحاظ تو رکھنا چاہتا تھا لیکن سوائے چھوٹے معاملات کے اور اپنی بیوی کے معاملہ کے جس کا حد درجہ پاس و لحاظ کرنا اس کی فطرت کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا اسے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کام کیسے کرنا چاہیئے۔ اس میں باہمی تعاون کے وصف کی کمی تھی۔ بعض اوقات وہ دوسرے اشخاص کے جذبات کے بھاؤ کو گہرے طور پر سمجھ سکتا تھا اور ان پر بحث و تمحیص کر سکتا تھا لیکن وہ ان کے ساتھ ایک پرجوش عام دھارے میں بہہ نہیں سکتا تھا۔

# سگمنڈ فرائڈ سے اختلاف

میں ۱۹۲۵ء کے قریب یورپ میں سکونت پذیر تھا اور میں نے لندن میں ایک کتاب فلسفۂ مارکس پر شائع کی تھی جس میں ایک باب کا عنوان "مارکس اور فرائڈ" تھا۔ مجھے اس بات پر بڑی خوشی ہوئی کہ فرائڈ نے اس کے متعلق مجھے ایک خط لکھا جس میں اس نے بڑی فیاض دلی سے اس کتاب کو بہت اہم اور اسکی تعریف کرتے ہوئے اس کو غالباً صحیح بھی قرار دیا اس کے ساتھ ہی اپنی فیاض دلی کا ضرورت سے زیادہ اظہار نہ کرنے کی نیت سے یہ جملہ بھی بڑھا دیا۔ "مجھے تمھاری سابقہ تصانیف کے مقابلہ میں اس کتاب کے مطالعہ سے زیادہ لطف حاصل ہوا۔" جواباً اظہار شکر گزاری کے سلسلہ میں میں نے اس کو لکھا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر میں اپنی اس کتاب کے امریکن ایڈیشن کے اشتہار میں آپ کے اس خط کا ذکر کر دوں تو آپ اس کی پروا نہ کریں گے"۔ اس نے اس کا بہت سخت اور طنز آمیز جواب دیا جو یہ ہے: "اگر تم میرے خط میں لکھی ہوئی کسی بات کو منظر عام پر نہ لاؤ تو میں تمھارا ممنون ہوں گا۔ اب تک میں امریکن طرزِ زندگی سے اپنے آپ کو مانوس کرنے میں ناکام رہا ہوں۔"

میں نے جواب دیا کہ آپ کے خیالات کو عوام میں تشہیر نہیں کیا گیا ہے بلکہ میں نے تو ایسا کرنے کی اجازت چاہی تھی، میرا خیال ہے میں نے بہت ہی نرم طریقہ سے یہ بھی لکھا تھا کہ امریکن طریقۂ زندگی میں ان دونوں باتوں کے درمیان کے فرق کو سمجھ لینے میں کوئی دقّت نہیں ہوگی، لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنے خط میں یہ بات شامل کرنا چاہی تھی لیکن کی نہیں کیونکہ اس وقت میرے دماغ میں غصّہ سے زیادہ رنج و تکلیف کا احساس تھا۔ فرائڈ بہت سی باتوں میں میرا معلم ہی نہیں تھا بلکہ کم از کم نیا بتاً میرا ایسا بزرگ تھا جس کے سامنے میں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا تھا۔ اس کے بہت سے امریکی حواریوں نے میری پریشانی کے زمانہ میں تحلیل نفسی کر کے مجھے مفید مشورے دیئے تھے۔ میرا یہ موقف نہیں تھا کہ دیانت دارانہ خودداری کے تقاضہ کی حد سے باہر نکل کر میں اس پر جوابی حملہ کروں۔ اس عظیم المرتبت انسان کو دیکھنے کی جو آرزو میرے دل میں عرصہ سے پرورش پا رہی تھی اس واقعہ سے وہ اور زیادہ تیز ہو گئی۔ فرائڈ کے ایک امریکن شاگرد ڈاکٹر اسمتھ ایلی جیلف ( Dr, Smith Ely Jelliffe. ) کی معیت میں میں نے فرائڈ کی کل تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ۱۹۱۵ء میں میں نے اس کے نظریات اور طریقہ ہائے علاج کی مقبول عام تفسیر ایوری باڈیز میگزین" ( Everybody's Magazine. ) کے ایک شمارہ میں شائع کرائی تھی، اس لئے میں بجا طور پر اس کی توجہ خاص کی توقع کر سکتا تھا چونکہ ۱۹۲۶ء میں وہ ویانا میں موجود تھا اس لئے میں نے ایک تحریر وہاں

بھیج کر اس سے ملاقات کی خواہش کی۔

"برگاسی ۱۹" ایک وسیع مکان تھا جس میں کتب و تصاویر بھری ہوئی تھیں۔ اس کی پوری درمیانی منزل کا فرش ایسے نرم و بیز قالینوں سے آراستہ تھا کہ اس میں پاؤں اس طرح گھس جاتے تھے جس طرح اونٹ کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے ہیں۔ میں اس چیز سے متعجب نہیں ہوا کہ اگر ایک طرف ریمبرانٹ کی کتاب "علم تشریح الاعضا" (Anatomy Lesson.) جس کے بغیر کسی ڈاکٹر کا شفاخانہ ممیز نہیں ہوسکتا لٹکی ہوئی ہے تو اس کے ساتھ ہی ڈراؤنے خواب (The Nightmare.) کی تصویر لگی ہوئی ہے جس میں ایک دہشت ناک عفریت کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی اور وہ ایک خوابیدہ عورت کے برہنہ سینہ پر سوار تھا۔ ابتدا میں فرائڈ نے علم تشریح الاعضاء پر خاص توجہ کی تھی اور ریمبرانٹ کی تصویر میں جو ماہر سائنس ہونے کے شدید تجسس کی جھلک دکھائی گئی تھی وہ اس میں پائی جاتی تھی۔ لیکن میری نظر میں اس میں عہد وسطے کی توہم پرستی کا بھی ایک خفیف سا عکس پایا جاتا تھا۔ وہ "لاشعور" کے متعلق گفتگو کرنے کو ترجیح دیتا تھا یعنی وہ قوتِ احساس کے فقدان کا قائل تھا اور اس فقدان کو اس نے ایسا سازشی بھوت بنا دیا تھا کہ جس کے لئے علم تشریح الاعضا میں یقیناً کوئی جگہ نہیں۔ فرائڈ کا یہ انکشاف کہ قوتِ متخیلہ سے وجدانی تحریکات کو بالکل محو کر دیا جائے تو بھی بیداری اور عالمِ خواب میں وجدانی تحریکات ہمارے اعمال اور جسمانی حالات پر پورا

تسلط رکھ سکتی ہیں سائنس کی تاریخ میں یقیناً ایک عظیم واقعہ ہے، لیکن اس نظریہ کے گرد اس نے خالص ادبی دیومالا کا عجیب گورکھ دھندا بنا دیا ہے! دماغی معالجہ ہمیشہ سحر یا طلسم سے رشتہ جوڑ لیا کرتا تھا اور آئندہ بھی یہ عمل جاری رہے گا۔

میں اسی دُھن میں وہاں بیٹھا ہوا اپنے شوقِ ملاقات کو تیز کرتا رہا، یہاں تک کہ دروازہ کھلا اور فرائڈ اندر داخل ہوا۔

میں نے اس کے قد و قامت کے متعلق جو تصوّر قایم کیا تھا اس سے وہ کسی قدر پستہ قد تھا، اس کے اعضا بھی کمزور تھے اور ان پر نسائیت غالب تھی۔ میں نے اس سے قبل بھی ان تمام بڑی شخصیتوں کی جن سے میری ملاقات ہوئی ہے نسائیت پر اظہار تعجب کیا ہے۔ فطانت ایک عصبی مظہر ہے۔ اور بجز اس تباہ کن فطانت کے جو آمرانہ حکومتوں میں بروئے کار آئی ہے اس میں ایک خاص نزاکت کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ میری ملاقات جب فرائڈ سے ہوئی تو اس سے قبل ایک عمل جراحی سے اسکی ناک کچھ پھیل گئی تھی اور ایک جانب کسی قدر جُھک گئی تھی جس کی وجہ سے شکل و شباہت میں قدرے تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ جب وہ تلطف آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بار بار اپنے سر کو پیچھے کی طرف لے جاتا تھا تو وہ مجھے بہت ہی انوکھا اور بارُشتیا سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھی کسی قدر باریک تھی جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ شرارت کرنے کی غرض سے وہ عمداً آدھی بات کہتا ہے اور آدھی روک لیتا ہے۔

مصافحہ کرتے ہوئے اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا: "آپ کی کیا غرض ہے؟"

میں نے جواب دیا "میری کوئی غرض نہیں ہے، میں تو صرف آپ سے ملاقات کے لئے آیا ہوں۔"

"میں نے تمہاری کتاب کو جو سراہا ہے اس کو تم شہرت دینا چاہتے ہو، لیکن میں کیوں تمہاری اعانت کروں، کیا تم خود اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے؟"

میں نے کہا "میں کوشش کر رہا ہوں لیکن اس وقت میں اس سلسلے میں آپ کے پاس نہیں آیا ہوں، تاہم میں یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ جب میں نے آپ کے اور مارکس کے متعلق صحیح باتیں لکھی ہیں تو آپ اسکی اشاعت سے مجھے کیوں روکتے ہیں؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور اس وجہ سے سلسلۂ گفتگو بند ہو گیا۔ لیکن اس کو اس کا کوئی تکلیف دہ احساس نہیں ہوا۔ مجھے یہ خاموشی شاق گزر رہی تھی، گویا یہ ایک قسم کا ہتھیار تھا جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اور میں نے یہ کہہ کر اس کو اور بھی خطرناک کر دیا۔

ایک سلسلہ کے متعلق آپ سے استفسار کرنے کی خواہش عرصہ سے میرے دل میں ہے، آپ "لاشعور" کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیوں کرتے ہیں کہ گویا یہ ایک شے ہے، جب ہم عالم غفلت میں ہوتے ہیں تو صرف ہمارا دماغ اور جسم ہی ایک شے ہوتا ہے، کیا

یہ معاملہ زیادہ واضح نہ ہو جائے گا اگر بجائے "اسم" کے اسم صفت کا استعمال کریں یعنی بجائے "لاشعور" کہنے کے "دماغ کی "لاشعوری کیفیت" کہیں؛

اس نے ذرا ترش روئی سے جواب دیا "شاید تم نے ہماری کتابیں نہیں پڑھی ہیں"۔ "لاشعور" کوئی شے نہیں ہے بلکہ ایک تصور ہے" یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جو طبی تعلیم کے لئے ناگزیر ہے"۔

میں نے کہا: اس حالت میں یہ تصور خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ عوام تو اس کو لازمی طور پر ایک شے ہی سمجھتے ہیں"۔

"تو ان کو اپنے خیال کی اصلاح کرنی چاہیئے!" یہ گفتگو کچھ خوشگوار انداز میں نہیں ہوئی اور میں نے مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہنا چاہا۔ کیا آپ کو کامل یقین ہے کہ آپ روح کو دوبارہ زندہ نہیں کر رہے ہیں؟۔

اس نے جواب دیا "نہیں، روح کا کوئی وجود نہیں ہے، صرف ایک تصور ہے جو ان لوگوں کے لئے جو عملی کاموں میں مصروف ہیں ناگزیر معلوم ہوتا ہے"۔ اس نے مزید کہا "تم شاید نظریہ کردار کے ماننے والے ہو۔ تمھارے جان' بی، واٹسن کے قول، کے مطابق تو شعور کا بھی کوئی وجود نہیں ہے' لیکن یہ قطعی حماقت اور بے معنی چیز ہے۔ شعور بدیہی طور پر ہر جگہ موجود ہے بجز امریکہ کے"۔

امریکہ پر طعن کر کے وہ اس قدر محظوظ ہوا کہ اسے ہنسی آ گئی اور اس میں خوش طبعی پیدا ہو گئی۔ اس نے مجھے بزرگانہ انداز میں روحانیت اور مادیت کے باہمی رشتہ پر درس دینا شروع کر دیا۔ وہ بڑی تیزی

سے گفتگو کرتا رہا، اور مجھے چونکہ دوسروں کی باتیں سننے کا سلیقہ ہے۔ اس لیئے ہم جلد ہی آپس میں اچھے دوست ہو گئے۔

اس نے کہا "نفسیاتی اور شعوری مسائل کو مخلوط مت کرو، میرے پرانے اُستاد نفسیات تھیوڈور لپس ( Theodore Lipps. ) جو یہیں ویانا میں ہیں ہمیشہ اس کے خلاف ہمیں ہدایت کرتے تھے۔ نفسیاتی وجود یا ہستی کے لئے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ باشعور بھی ہو"

میرا جواب قدرتی طور پر یہ تھا "پھر تو لاشعور صرف ایک تصور ہی نہیں ہوا بلکہ یہ ایک شے، ایک وجود ہو گیا جیسا کہ میرا خیال تھا" لیکن یہ جواب میں نے اس وقت نہیں دیا تھا بلکہ گھر واپس پہنچنے پر جب میں اس گفتگو کو اپنی کتاب یاد داشت میں لکھنے بیٹھا تب اس جواب کو بھی لکھ لیا میں اس دوران میں احساس کمتری میں ایسا گرفتار تھا کہ اتنے بڑے انسان کو میں ایسا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اور یہ مناسب ہی ہوا کیونکہ اس کے بیان میں جو تضاد تھا وہ اپنی جگہ پر بہت واضح اور نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ اس سے وہ بیک وقت ماہر علم طبیعات اور ماہر علم ارواح خبیثہ نظر آتا ہے۔ فرائڈ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے انکشافات علم النفس کی ترقی میں ممد ہوں، لیکن وہ علم النفس ہی کی ایک شاخ بن گئے یعنی اس کے ارشادات میں بھی پاپائے روم کے احکامات کی طرح منزہ من الخطا ہونے کی صفت ماننا پڑی۔

لیکن اب وہ اس حد تک خوش مزاجی پر اُتر آیا تھا کہ اس کے منہ

سے امریکہ کے متعلق بھی ایک کلمۂ خیر نکل گیا۔ اس نے کہا کہ امریکہ نے جان ڈیوی (John Dewey : ) جیسا انسان پیدا کیا ہے۔ اس نے مزید کہا: دُنیا کے ان چند لوگوں میں جن کا میں بڑا احترام کرتا ہوں ایک جان ڈیوی بھی ہیں۔ میں نے کہا کہ کولمبیا میں میں نے ڈیوی سے پڑھا بھی ہے اور اس کی نگرانی میں پڑھایا بھی ہے، اور میں بھی اس کو بہت اونچا انسان سمجھتا ہوں اگرچہ اس جنگِ عظیم نے ہم میں مفارقت پیدا کر دی ہے۔ "امریکہ میں تو یہ لڑائی ایک منقسم کرنے والا پہاڑ ثابت ہوئی ہے۔" اس گفتگو سے وہ محظوظ ہوا اور اس نے اس کے بعد بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ دراصل اس کا یہ خاص انداز تھا کہ گفتگو کا سلسلہ منقطع نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے اس انداز نے مجھے افلاطون کی کتاب "سقراط"، کی یاد دلا دی۔

مثال کے طور پر میں نے یہ کہا تھا کہ جنگ نے امریکہ کو دو حصوں میں منقسم کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ انتہا پسند، اعتدال پسند طبقہ سے بالکل جدا ہو گئے تھے۔ لیکن یورپ میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ یورپ میں ہر شخص کو اس میں حصّہ لینا پڑا خواہ وہ اسے پسند کرتا تھا یا نہ کرتا تھا۔ اس نے پر شرارت تبدیلیِ آواز کے ساتھ کہا "سرکاری طور پر" یہ کہہ کر وہ گرم جوشی سے بولا "آپ لوگوں کو جنگ میں شریک ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا، اگر تمام گزشتہ صدیوں کا نہیں تو کم از کم اس صدی کا بدترین احمق آپ کا وڈرو ولسن تھا۔"

اس نے میرے جواب کا انتظار کیا جو جواب اتفاقاً میرے گلے میں

اٹک کر رہ گیا۔" اور مجھے یقین ہے کہ وہ غالباً چوٹی کے جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک تھا۔ اگرچہ اسے اس کا احساس نہیں تھا۔"

میں نے کہا کہ ولسن کا اسلوب انشاپردازی خود فریبی کا ایک آلہ تھا اس بات سے وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تم نے "داستانِ اسلوب" ( The Story of Style. ) پڑھی ہے۔ اس کتاب میں ولسن کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ ان الفاظ کی مخصوص نوعیت کے مطالعہ کی اساس پر کیا گیا ہے جو اس کی تقاریر میں بعض دوسرے الفاظ کے مقابلہ میں زیادہ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ میں نے اقرار کیا کہ میں نے اسے پڑھا ہے اور ہم دونوں نے اس کتاب کے مصنف ولیم بیارڈ ہیل ( William Bayard Hale. ) کی ذہانت کی خوب تعریف کی۔ میں نے اثنائے گفتگو میں جو ایک لفظ منقسم کرنے والا پہاڑ استعمال کیا تھا اس سے اب ہم دور جا چکے تھے، لیکن فرائڈ نے پھر اسی پر میری توجہ منعطف کرائی اس نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ منقسم کرنے والے پہاڑ کے معاملہ میں کچھ مزید تبادلۂ خیال کرو۔"

میں نے کہا "اچھا ڈوی کی مثال لے لیجئے۔ وہ جنگ کا حامی ہو گیا اور جرمنی کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے غور و فکر کا رُخ ہی بدل گیا ہے۔ ہمارے ملک کے بہت سے ذہنی رہنما جنھوں نے جنگ کی حمایت کی گویا غور و فکر کرنے کی زحمت اُٹھانا ہی نہیں چاہتے تھے۔"

فرائڈ نے دریافت کیا "ایسا کیوں ہوا؟"

میں نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ لوگ سوچنا کیوں ترک کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ جس راستہ پر جانا چاہتے ہیں ان کا تفکر اس طرف ان کی رہنمائی نہیں کرتا۔"

اس جملہ نے پھر اس کو محظوظ کیا اور اسکی تمام خوش اخلاقی پھر عود کر آئی، ساتھ ہی اس کے گوشہائے چشم کے گرد جو خفیف سے حلقے تھے وہ بھی اُبھر گئے۔ آخر میں اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف کیا اور ایک بچے کی طرح خوب ہنسا۔ بعض اوقات ایک کھیلتے ہوئے بچہ کو دیکھ کر ایک عجیب پستہ قد بوڑھے انسان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، فرائڈ کا انداز بھی کچھ اسی عجیب چھوٹے ضعیف آدمی کے سے تھے۔ وہ اس اثنا میں پورے وقت اپنے سر اور ہاتھ کو جنبش دیتا رہا۔ اس کی نظر چھت کی طرف اُٹھی ہوتی اور آنکھیں بند ہوتی تھیں، کبھی کبھی تمسخر انگیز طور پر ہونٹ لٹکا لیتا اور مُنہ بناتا تھا، لیکن اس دوران میں میرا یہ احساس باقی رہا کہ اس خوش طبعی کے پس پردہ ضد اور وارفتگی کی ایک جھلک موجود تھی، لیکن اس میں جو عظیم کشش تھی مجھے اس کا احساس بھی ہوتا رہا۔ میں نے روسی بالشویکوں کی مدد کی تھی اس کے بارے میں وہ کچھ واقفیت حاصل کرنے کا بہت خواہش مند تھا۔ اس نے کہا "تم آزادی کے دلدادہ ہو لیکن وہاں تو تم کو ہر چیز اس کے خلاف ملے گی۔" میں نے بڑی چرب زبانی سے اس کی توجیہ پیش کی۔ میں نے اس کو بتایا کہ طبقاتی آمریت تو ایک عارضی چیز ہے

اور یہ حقیقی اور عالمگیر آزادی تک پہونچنے کا ایک راستہ ہے۔

اس پر اس سے ایک ایسے شخص کی سی حرکات سرزد ہوئیں جو مکڑی کے جالوں سے لڑرہا ہو یا آسٹریلیائی انداز میں رینگ رہا ہو۔ "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" اس نے کہا "جو لوگ کبھی مانۂ مستقبل میں آزادی بخشنے کا وعدہ کرتے ہیں وہ انہی لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں آسمانی بہشت میں ہمارے لئے آزادی تیار ہے۔ میں تو یہاں اس دنیا میں رہ رہا ہوں اور اسی عالم آب و گل سے مجھے دلچسپی ہے۔"

میں نے اس کو بتایا کہ میں لینن کی جس بات کو پسند کرتا ہوں وہ یہی ہے کہ وہ اس مادی دنیا کو ٹھیک ویسا ہی سمجھتا ہے جیسی کہ وہ درحقیقت ہے اور ساتھ ہی اس کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔

میں نے کہا کہ "بالشویکوں کے سامنے ایک نظریہ ہے اور وہ اس کو تجربہ میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" یہ چیز اس کی فلسفیانہ طبیعت کے مناسب تھی اور اسی لئے اب وہ متانت اور ملائمت کے ساتھ گفتگو کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے کہا "یہ ایک بہت ہی عجیب تجربہ ہے، فی الحقیقت یہ میدان میرے لئے ایک نہ جانے ہوئے ملک کی طرح ہے۔ مجھے اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔"

میں نے سوال کیا "سیاسی اعتبار سے آپ کیا ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "سیاسی اعتبار سے میں قطعی کچھ نہیں ہوں۔" وہ اب اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے گوشۂ چشم سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر پوچھا: "تم اپنے امریکہ

واپس جاکر کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے پوچھا "آپ امریکہ سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

اس نے کہا "امریکہ سے نفرت؟ میں نفرت نہیں کرتا مجھے اس پر افسوس ہوتا ہے!" اس نے پھر اپنا سر پیچھے کو جھکایا اور خوش دلی سے ہنس کر کہا: "مجھے اس کا افسوس ہے کہ کولمبس نے اس ملک کا سُراغ کیوں لگایا!"

میں بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔ بلکہ میں نے اس کوشش دی کیونکہ میں اپنے قومی نقائص کے بیان پر چراغ پا نہیں ہوتا ہوں۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا کہ "امریکہ کارکنان قضا وقدر کا ایک غلط تجربہ ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قدرت نے ہی ایسا کیا ہوگا۔ کم از کم میں تو اس غلط تجربہ کی ذمہ داری لینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا۔"

اس پر اور قہقہہ لگا۔ پھر میں نے پوچھا "یہ غلط کس طرح ہے؟"

اس کا نزاکت پسندانہ انداز، اس کی ریاکاری، قوم میں آزادی کا فقدان! امریکہ میں فکری آزادی کا بھی نام تک نہیں ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

جواب میں میں نے بتایا کہ نوجوانوں میں ایک تازہ اور پرجوش جذبہ کارفرما ہے۔

"زیادہ تر یہودیوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں نے جواب دیا "یہودی لوگ نزاکت پسندی اور ریاکاری

سے مبرّا نہیں ہیں۔" اب اس نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ گھر واپس پہونچکر تمھارا شغل کیا رہے گا؟ کیا کوئی متعین منصوبہ پیش نظر ہے۔؟"

"بجز لکھنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں ہے۔"

"میں بتاتا ہوں کہ تمھیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم واپس وطن پہونچو اور امریکہ کے متعلق ایک کتاب لکھو اس کتاب کا نام "اسقاط" (Missgeburt) رکھو۔ انگریزی میں اس کے لئے کیا لفظ ہے؟"

اُسقاط؟

"نہیں، یہ لفظ موزوں نہیں ہے۔"

"عفریت۔"

ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم یہ لکھو کہ امریکہ کس قدر انسانیت سوز اعمال کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر کہا۔ اصل لفظ اس کے لئے "ناکامی" ہے۔ "امریکی تمدن کی ناکامی" (The Miscarriage of American Civilization.) اس کتاب کا نام ہونا چاہیئے۔ تمام اندوہناک المیہ کے اسباب دریافت کرکے صحیح واقعات کا اظہار کرو۔"

اب وہ اُٹھنے لگا۔

"یہ کتاب تم کو زندہ جاوید بنا دے گی۔ اس کے بعد تم امریکہ میں تو نہیں رہ سکوگے۔ لیکن تم کسی دوسرے مقام پر جاکر آرام سے زندگی بسر کرسکوگے۔" میں بھی اب کھڑا ہو چکا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ میری طرف

بڑھایا۔ اب میں تمہاری یہ دوسری کتاب لازمی طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یاد رکھے تم میرے پاس بھیج دینا۔ اس کو پڑھتے وقت میں آج کی گفتگو کی دلچسپ یاد کو نہیں بھولوں گا۔"

کیسا پُر لطف رخصتانہ تھا۔ بظاہر یہ بہت شائستہ اور دلکش تھا۔ میں جب زینہ سے اُترنے لگا تو میری کتاب کے متعلق جو شفقت آمیز خط اس نے تحریر کیا تھا مجھے اس کا خیال آیا۔ اس نے لکھا تھا "فی الحقیقت اہم اور غالباً صحیح بھی..... میں نے تمہاری سابقہ تصنیفات سے کہیں زیادہ اس سے لطف حاصل کیا!"

میں سوچنے لگا کیا یوروپین معاشرت کے یہی انداز ہیں۔ کیا فرائڈ خود کسی قدر مغرور اور مراقی ہوتے ہوئے دوسری قوموں کی کمزوریوں کی اتنی جستجو کرتا ہے؟ لاشعور سے متعلق اس کے مبہم انکشافات میں سے بعض کے خلاف جو بہت زیادہ افسانوی نوعیت کے ہیں۔ ہماری طرف سے جو کسی قدر سخت قسم کا اظہار تشکک ہوا ہے۔ کیا یہ سخت نفرت اسی کا نتیجہ ہے۔ اس کے ایک امریکن دوست اور مترجم ڈاکٹر اے۔ اے برل (Dr. A. A. Brill) نے مجھے بتایا کہ اس کے یہ خیالات اس زمانہ سے شروع ہوئے جب وہ ۱۹۰۹ء میں امریکہ آیا اور یہاں کے سائنسدان طبقہ نے اس کی کچھ معقول پذیرائی نہ کی۔ فرائڈ کے ایک عقیدت مند شاگرد کا اس کے لئے بیساختہ اور پرسکون طرز پر ایسے الفاظ کہدینا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی تھی کیونکر خودشناسی کا یہ ہیرو تو دنیا میں پیدا ہی

اس لیئے ہوا تھا کہ بنی نوع انسان کو اس قسم کے بیجا جذبات سے نجات دلائے۔

۱۹۱۴ء میں فرائڈ کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے کے نتیجہ میں اس کے ساتھ جو ایک طرفہ موانست شروع ہو گئی تھی اور جو ہمیشہ قایم رہی ویانا میں اس سے ملاقات اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ جب اس ملاقات کا حال پہلی مرتبہ اخبارات میں شائع ہوا تو اس کی بہن انا برنیز (Anne Barnayas) نے مجھے ایک مراسلہ میں مہذبانہ انداز میں تحریر کیا کہ اگرچہ میں نے اس کے بھائی سے ملاقات کی ہے لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ میں نے اس کو نہیں سمجھا۔ اس کے بخلاف دو ممتاز ماہرین تحلیل نفسی نے مجھے اس بات پر مبارکباد دی کہ میں نے جو تاثرات مختصر سی ملاقات میں قایم کیئے وہ بالکل صحیح تھے۔ ان میں سے ایک تو ہمارے ممدوح کا بہت ہی قریبی رفیق تھا۔ اس موازنہ سے میرے دل میں بہت شوق پیدا ہوا اور جب فرائڈ کے ایک دوسرے قریبی رفیق ڈاکٹر ارنسٹ جونز نے فرائیڈ کی زندگی کے حالات شائع کرنے شروع کیئے تو میں نے فرائڈ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ میں خاص طور پر یہ چاہتا تھا کہ تصوّر لاشعور کے متعلق ہم نے جو سلسلۂ بحث شروع کیا تھا وہ جاری رہے۔

جہاں تک فرائڈ کی دلکشی اور شدید ضد اور مراق کا تعلق ہے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر جونز نے پورے طور پر میرے احساسات کی تائید کی فرائڈ کا اقبالی بیان جو ڈاکٹر جونز نے اپنی کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ ۸ پر

درج کیا ہے وہ ہر صاحبِ ضمیر کو معقولیت سے بعید معلوم ہوتا تھا۔ میری جذباتی زندگی کے لئے ایک دلی دوست اور قابلِ نفرت دشمن دونوں ناگزیر ہیں۔ میں نے ہمیشہ نئے دوست و دشمن پیدا کئے اور اکثر وہ دونوں ایک ہی فرد ہوتے ہیں۔" امریکہ کے خلاف اس کے دل میں جو جذبہ تھا اس سے زیادہ قریبی تعلقات قایم ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس انداز سے جو پہلی گفتگو میں میں نے کیا تھا بہت زیادہ گہرا اور تلخ تھا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک" بقول ڈاکٹر جونز" یا کم از کم اس وقت تک جب کہ مرض نے جگہ بدل لی اور وہ ورم و درد قولنج تسلیم کر لیا گیا وہ اپنے امعائی عوارض کو "میری امریکن سوءِ ہضمی" کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔

اس کے بھتیجے ایڈورڈ برنیز نے جو اس کی بیوی کا بھتیجہ بھی تھا اس امریکن دشمنی کی ایک ایسی وجہ میرے سامنے بیان کی جو ڈاکٹر برل کی توجیہ سے مختلف ہے۔ اس نے کہا کہ ولیم جیمز (William James.) نے کلارک یونیورسٹی میں ۱۹۰۹ میں فرائڈ کے لیکچروں میں شرکت کی تھی۔ وہ فرائڈ کی شخصیت اور اس کے خیالات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ایڈیرون ڈیکس (Adirondacks.) میں اپنی موسمِ گرما کی اقامت گاہ پر اس کو مدعو کیا۔ ممتاز مہمان کی تواضع کی خاطر وہ سب لوگ جنگل کو گئے اور وہاں کھلی جگہ پر آگ جلا کر گائے کے گوشت کے چاپ یا کباب تیار کئے۔ برنیز کا قول ہے کہ فرائڈ کی شکایت سوءِ ہضمی اور امریکن دشمنی کی ابتدا یہی کھانا تھا۔ فرائڈ نے اظہارِ ناراضگی کے طور پر کہا تھا "یہاں اب بھی وحشی رہتے ہیں۔ یہ جنگلوں میں گرم

پتھروں پر کھانا تیار کرتے ہیں!"

تصور "لاشعور" کے متعلق فرائڈ کی ابہام گوئی جو میرے خیال میں اس کی طبیعت کے سائنسی تقاضوں اور اساطیری رجحانات کے تضاد کی صاف طور پر نشان دہی کرتی ہے اس وقت میری سمجھ میں اچھی طرح آ گئی جب میں اس سے زیادہ روشناس ہو گیا۔ ڈاکٹر خود بھی میری طرح دوسرے لوگوں کی تنقید سے بہت پریشان ہوا اور اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ فرائڈ کے نقاد اگر لاشعور کے مبحث پر اس کی تمام تصانیف کا مطالعہ کریں تو ان کے اعتراضات کی خود بخود تردید ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے فرائڈ کی تصنیف مجموعہ مضامین (C Collected Papers S) کو خریدا اور اس میں لاشعور اور متعلقہ مباحث پر اس کی تمام دلچسپ تحریرات کو پڑھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس نے اپنے لاشعور پر لکھے ہوئے خاص مضمون میں ایک منفی تصور سے ایک وجود پذیر شے کی جانب اسی قسم کی خارج از فہم جست لگائی تھی جیسی ہماری گفتگو میں لگائی گئی تھی۔ اس مجموعۂ مضامین کے مطالعہ سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ فرائڈ اس بات پر تو زور دیتا ہے کہ ایک ذہنی عنصر گو شعور سے ناپید ہو لیکن نفسیاتی وحدت کی حیثیت سے اس کی ہستی قائم رہتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اسے اس وقت کی کیفیت کا ذرا سا بھی علم نہیں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "ذہن میں موجود اور شعور میں مخفی ہونے کے وقت اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے اس کا قیاس کرنے کے لیئے ہمارے پاس کوئی وسائل نہیں ہیں،" یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے بین مفروضہ سے کہ عنصر جسمانی رجحان کی حیثیت سے ایک ہی قسم

کے نفسیاتی مظہر کو دوبارہ ظہور میں لانے کی غرض سے وجود پذیر رہتا ہے انکار کردینے سے بحیثیت سائنس داں کے اس کو کیا فائدہ ہوا۔ فرائڈ نے خود بھی یہ سوال کیا ہے اور اس کا جواب اس نے یہ دیا ہے کہ اس مفروضہ سے علم النفس کو اپنے بہت ہی معمولی واقعات مثلاً حافظہ وغیرہ کی توجیہ اپنے ہی وسائل سے پیش کرنے کا جو حق حاصل ہے وہ چھن جاتا ہے۔ لیکن پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ علم النفس اور علم افعال دماغ کے مابین ایک حدِ فاصل کھڑی کر دینے سے بحیثیت ایک ماہر سائنس کے اس نے کیا حاصل کیا؟ علم النفس یا کسی اور شعبہ سائنس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے حقائق کی توجیہ اسی کے وسائل سے پیش کی جائے بلکہ اس کے لئے وہ ذرائع تلاش کئے جائیں جن سے ان کی بہترین توجیہ ہو سکے فرائیڈ کا یہ اصرار کہ نفسیاتی اور مادی کائنات میں ایک قسم کی جبریہ قوّت کارفرما ہے (نفسیاتی کائنات سے اس کا مطلب وہ کائنات ہی ہو سکتا ہے جو مادہ سے بالکل آزاد ہو) اس غرض سے ہے کہ غیر تربیت یافتہ دماغ اپنے کو سائنسی تصور کرنے لگیں، لیکن فی الحقیقت یہ خیال حیاتیاتی نفسیات کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رُکاوٹ ہے۔

ان مضامین کے مطالعہ سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ یہ فرائڈ کی سائنسی ذہانت کا نہیں بلکہ اس کی فنکاری (ارواح خبیثہ سے متعلق شاعری) کا تقاضا تھا کہ اس نے ایک عالم اسفل کو ایسی نقاب پوش خبیث روحوں سے آباد کرنے پر اصرار کیا ہے جو لامکانی تاریکی میں اِدھر اُدھر گھومتی ہیں اور ہمارے خیالات اور جسموں کے افعال پر تسلط رکھتی ہیں مثلاً فرد کی جبلی حرکات ادی

انا، انائے اعلیٰ، جذبۂ احتساب، جذبۂ خودکشی، خصی ہونے جذبہ، لڑکے اور لڑکی کا ماں باپ کی جانب جنسی رجحان رکھنے کا جذبہ وغیرہ وغیرہ

ہمارے پاس اس کے متعلق قیاس آرائی کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، کہ اس مخلوق کی ماہیت کیا ہے لیکن ان میں خیالات اور ارادے موجود ہیں اور بعض اوقات وہ بالکل غولِ بیابانی یا ارواح خبیثہ کی طرح عمل کرتے ہیں۔ ایک ایسے علاقہ میں جس کا نہ تو اس زمین پر کہیں وجود ہے اور نہ ہوسکنے کا امکان ہے کیونکہ اس کا نام ہی (لاشعوری ذہنی عمل) لفظی تضاد کو ظاہر کرتا ہے یہ مخلوق جدال کرتی ہے، دھوکا دیتی ہے، تسلط جماتی ہے، چاپلوسی کرتی ہے اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہے۔ دماغ کا عمل شعوری ہوسکتا ہے اور زیادہ تر ہوتا بھی ہے لیکن ذہنی کی موجودگی کے ساتھ "لاشعوری" میں اگر الفاظ حقیقی معنی رکھتے ہیں تو لفظی تضاد موجود ہے۔

اگرچہ اس مضمون میں جو فرائڈ نے اپنے خاص شاگردوں کے لئے لکھا اس نے بیان کیا ہے کہ وہ یہ نہیں قیاس کرسکتا کہ لاشعور میں نفسیاتی اجزا کس شکل میں اپنا وجود قایم کر لیتے ہیں، لیکن اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ فرائڈ کے معتقدین جب لاشعور کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے تصور میں ایک باشعور ذہن ہوتا ہے جو اس جانے پہچانے ہوئے ذہن کے نیچے یا اس کے عقب میں یا اسی کے قریب ہی کہیں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ لاشعور میں وجود رکھنے والے ایک حسرتناک تصور کو فرائڈ نے خود "ایک ایسے آسیب سے تشبیہ

دی ہے جو روز روشن میں ظاہر نہ ہونے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ روشنی میں اس کا خاتمہ ہو جائے گا"۔ ایک جبلی خواہش کے وجود کو جو بغیر جسم اور بغیر جگہ کے کسی ایسی چیز کے اندر شور مچاتی گھوم رہی ہے جس کی تعریف محض ایک منفی صفت سے کی گئی ہے ایک حقیقی شے تسلیم کرانا اس طرح کے الفاظ استعمال کیئے بغیر مشکل ہے۔ بلاشبہ ان وسواسی تصورات کے ذریعہ بعض باتیں انجام پا سکتی ہیں۔ اگر انھیں محض گفتگو کے آسان طریقوں کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں تحلیل نفسی پر جو مضمون فرائڈ نے لکھا ہے اس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فرائڈ ان تصوّرات کو اس حیثیت سے تسلیم کرنے سے کتنا بُعد رکھتا تھا۔ اس میں اس نے یہ لکھا ہے کہ "زمانہ مستقبل میں تحلیل نفسی کو اغلباً بمقابلہ ایک طریقۂ علاج ہونے کے لاشعور کی سائنس ہونے کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دی جائے گی"۔ میرا خیال ہے کہ مستقبل کے لوگ تو اس تصوّر کے بالکل خلاف راستہ اختیار کریں گے۔ اگر اس وقت ایسا نہیں کیا جا رہا ہے۔ علم النفس کی ترقی میں فرائڈ نے جو عظیم الشان حصّہ لیا ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہے لیکن اگر ہم ڈاکٹر جونز کے عقیدت مندانہ بیان کے مطابق فرائڈ کو سائنس کا حقیقی ماہر" سمجھ لیں تو یہ ہماری بڑی غلطی ہو گی۔ سائنس درحقیقت کوئی فوق العادت کوشش نہیں ہے۔ یہ تو محض کسی مسئلہ کے متعلق دماغ کی ہنرمندانہ پیہم اور مناسب کارکردگی اور انسانی معلومات کے ذخائر کے مناسب استعمال کا نام ہے، لیکن ایک ماہر سائنس میں تین خوبیاں لازمی طور پر ہونی چاہئیں فیصلہ نہ کرسکنے سے متعلق

تربیت، زیر نظر مسئلہ سے متعلق ہر علم پر پوری دسترس اور نتائج کی تصدیق کے لئے پائدار جذبہ۔ فرائڈ میں ان صفات میں سے ایک بھی صفت نہیں تھی وہ ایک تربیت یافتہ ورزشی کھلاڑی کی سی پھرتی سے نتیجہ پر پہونچنے کے لئے جست لگاتا تھا۔ ڈاکٹر جونز کے الفاظ میں وہ اپنے وقت کے علم النفس سے بالکل ناواقف تھا اور جو تھوڑا بہت علم اس کو تھا وہ اِدھر اُدھر سے سُن سُنا کر حاصل کر لیا تھا۔ مثال کے طور پر اس کو یہ بھی تمیز نہیں تھی کہ تصوّر (Idea..) اور ادراک (Perception.) میں کیا فرق ہے۔ تجرباتی اقدام سے اس کو طبعاً نفرت تھی اور تحقیق و تصدیق سے بھی اس کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اپنی بصیرت اور وجدان کے عملی نتائج اور لاشعوریت کے اصول کو کسی دوسرے شخص سے تصدیق کرانے کا خیال اس کے حد درجہ جذباتی اور ایجاد پسند دماغ سے بالکل مستبعد تھا۔ دوسرے لوگوں کے انکشافات کو وہ کس نظر سے دیکھتا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی منظور نظر سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ بھی اس کی طرح اپنے بھائی سے نفرت کا اظہار کرے۔ اس نے یہاں تک دھمکی دی کہ اگر یہ خوش آیند ہم آہنگی نہ پیدا نہ کی گئی تو وہ شادی کے قول و اقرار سے منحرف ہو جائے گا۔

میں اس کو نیوٹن، ڈارون یا اور کسی عظیم ماہرِ سائنس سے مشابہ نہیں سمجھتا وہ پیراسیلس (Paracelsus. P) سے ضرور مشابہت رکھتا ہے جس نے سائنس کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا لیکن وہ فطری طور پر ساحرانہ خیالات و اسباب کا دلدادہ تھا۔ پیراسیلس کے مقابلہ میں بلاشبہ فرائڈ

کی خدمات سائنس کی ترقی کے میدان میں بے انتہا زیادہ ہیں لیکن اس کی سائنسی تخلیقات میں بھی جلسازی کی آمیزش ہے۔ سنہ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک جب وہ دماغی تشریح کے سلسلہ میں کام کر رہا تھا تو فرائڈ کے دل میں یہ خیال قایم ہو گیا کہ کوکین جس کی دریافت اسی زمانہ میں ہوئی تھی کوئی جادو کا مادہ ہے۔ (یہ فقرہ ڈاکٹر جونز کا ہے) جس سے نہ صرف تمام امراض کا جن میں افیون خوری کی عادت بھی شامل ہے علاج ہو جاتا ہے بلکہ خراب اثرات پیدا کئے بغیر اور اس کے استعمال کی عادت ڈالے بغیر تندرست آدمی کی اعصابی اور عضلاتی صلابت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ "تجربتاً" (یہ لفظ بھی ڈاکٹر جونز کا ہے) اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ اس نے خود اس کا تجربہ کیا تھا۔ اس جوہر کا شیدائی ہو کر اور اس بات کا یقین رکھتے ہوئے کہ اس سے وہ تمام دُنیا میں مشہور ہو جائے گا اور اس کی مالی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی اس کو دفعۃً یہ خیال پیدا ہوا کہ ان اندرونی کرامات کے علاوہ شاید کوکین آنکھوں کی تکالیف میں بطور ایک مخدر دوا کے بھی کار آمد ثابت ہو۔ اس نے یہ بات اپنے ایک ساتھی سے کہی لیکن چونکہ وہ خود اس کی اندرونی معجز نمائی کے تجربات میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس لئے اس نے اس معمولی سے تجربے میں کوئی زحمت نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا رفیق اس تجربہ کی تکمیل کر کے عالمگیر شہرت کا مالک ہو گیا اور خود فرائڈ اس حیرت انگیز دوا کے حیات بخش خواص کی تحقیق میں پھنسا رہا اور اسی اثنا میں اس نے ایک مریض کو اس کی ضرورت سے زیادہ خوراک دے کر ہلاک کر دیا اور اس طرح اپنی شہرت کو بھی برباد کر لیا۔

ڈاکٹر جونز نے فرائڈ کی ارتقائی منازل کی جو سرگزشت قلم بند کی ہے اس سے بہ تکرار یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا میلان معقول مصروفیات کی تحقیقات کرنے کے بجائے پراسرار ہستیوں پر اعتقاد رکھنے کی طرف زیادہ تھا۔ اپنی "عظیم الشان دریافتوں" کے دس سالہ دور میں فرائڈ کا شغف برلن کے ایک عطائی فلسفی کی تحسین و آفرین میں جنون کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ وہ شخص پورا نقال تھا، عددیات کا قائل تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے حیات انسانی کے تمام مسائل کا حل اعداد ۲۸ اور ۲۳ کے باہمی تناسب سے معلوم کر لیا ہے اور یہ تناسب اس نے عورتوں کی موقت جنسی زندگی کا مطالعہ کر کے مختلف طریقوں سے معلوم کیا ہے۔ اس ڈاکٹر فلیس Dr. Eliess. کا دعویٰ تھا کہ ان اعداد کے ہیر پھیر سے وہ ہر چیز یہاں تک کہ نظام شمسی اور بین السیارا خلاؤں کی اندرونی کیفیات کی بھی تشریح کر سکتا تھا۔ فرائڈ نے انتیس سال کی عمر سے پچاس سال تک اس شخص کے پُرازخرافات مقالات کو تسلیم کیا اور ان پر اعتقاد رکھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ یہ تمہارے بہت خوبصورت اور محقق حیاتیاتی انکشافات ہیں اور فلیس کو وہ حیاتیات کا کیپلر (Keppler.) کہا کرتا تھا۔

ڈاکٹر جونز صاف کہتا ہے کہ ان عظیم دریافتوں کے دور میں فرائڈ کی حالت اعصابی و نفسیاتی مریض کی سی تھی۔ (اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ ہم میں سے اکثر میں اس کی رمق پائی جاتی ہے) لیکن جونز نے اس حقیقت کو بیان نہیں کیا کہ فرائڈ کا اعصابی مرض اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ وہ نمائشی طور پر شاندار اور غیر مستند پراسرار اعتقادات

کو تسلیم کرنے کا پرجوش میلان رکھنے لگا تھا۔

ڈاکٹر جونز نے یوسف برائر .Joseph Breuer کے متعلق جس نے ابتدائی ہسٹریا پر غور و فکر" پر فرائڈ کے ساتھ مل کر کام کیا تھا حقارت آمیز خیالات کا اظہار اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ اس کام کے بعد بہت جلد فرائڈ کے گروہ سے علیحدہ ہو گیا۔ مجھے اس امر کا علم نہیں کہ آیا برائر نے کبھی فرائڈ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا یا نہیں، لیکن برائر کے متعلق فرائڈ نے جو کچھ کہا وہ اس قول سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے۔ "وہ ایک حقیقت کے لئے ہمیشہ تین مفروضات کا علم رکھتا ہے اور کوئی کلیہ قائم کرنے کو ایک متکبرانہ اقدام سمجھتا ہے"۔

خاص "ایک حقیقت" جس پر فرائڈ کو اس وقت جبکہ برائر نے علیحدگی اختیار کی مستحکم یقین تھا یہ تھی کہ ہسٹریا کی جملہ صورتوں کا سبب ایک ہی ہوتا ہے اور وہ کسی بالغ کا کسی معصوم بچے کو جنسی میلان کے تحت ورغلانا ہے۔ فرائڈ نے اس صریحاً ناقابل یقین تعمیم کی بنیاد پر خود اپنے والد کو بھی مجرم ٹھہرایا۔ اس عقیدہ پر چار سال سے زیادہ عرصہ تک جمے رہنے کے بعد اس کے متعلق اسے کچھ شبہات کا احساس ہونا شروع ہوا تھا، لیکن ایک "تجرباتی" شہادت نے اسے پھر اس عقیدہ پر مستحکم کر دیا۔ اس کے متعلق میں ڈاکٹر جونز کی کتاب کا ایک جملہ نقل کرتا ہوں۔

"جب آخر کار اس نے اپنی امریکن بھتیجی ہیلا (Hella) کے بارے میں ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر میں یہ بات شامل کرنی پڑتی تھی کہ

اسے اپنی سب سے بڑی لڑکی کی جانب جنسی میلان تھا تو اس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اسے اپنے نظریہ کی صحت کے متعلق براہ راست ذاتی شہادت مل گئی ہے۔"

اگر "سائنس" اسی چیز کا نام ہے تو پھر ہم صحیح عقل سلیم کو کہاں تلاش کریں!

ایک دوسرا کلیہ جس پر وہ ایک واحد تجربہ کی بنیاد پر چھلانگ لگا کر پہونچا یہ تھا کہ وہ ہسٹریا کی بیماریوں کے اصل سبب کے بارے میں قطعی غلطی پر رہا تھا۔ وہ بچپن میں جنسی میلان کے تحت ہونے والے حملوں سے پیدا نہیں ہوتی ہیں یہ حملے تو مریض محض اپنے تصوّر میں محسوس کرتا ہے اصلی اور ہمہ گیر سبب تو بچہ کا اپنے والدین کی جانب جنسی میلان رکھنے کا جذبہ ہے۔ اس سلسلہ میں "تجرباتی" شہادت خود فرائڈ کی اپنی تحلیل نفسی میں ایک بات تھی۔ اس کے متعلق پھر ڈاکٹر جونز کا قول نقل کرتا ہوں:۔

اس نے خود اپنے اندر اپنی ماں کے لئے جذبہ محبت اور اپنے باپ کے خلاف جذبۂ رشک محسوس کیا تھا، اسے یقین ہو گیا کہ یہ عام انسانی خصلت تھی اور یہ کہ اس سے ہمیں والدین کی طرف جنسی میلان کی روایتی کارفرمائی کے زبردست اثر کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اب اس کا دماغ پوری رفتار سے کام کر رہا تھا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے وجدانی ادراکات بھی تیز تھے۔

بے شک ہم یہ کہہ سکتے ہیں اور بعض لفظوں کے نیچے میں نے خط کھینچے ہیں کیونکہ میرے خیال میں یہ بہتر ہو گا کہ ہم یہ بات یاد رکھیں کہ اوڈیپس

(جنسی میلان بجانب والدین) کی ہمہ گیری کے متعلق (جو اس کے نہایت ہی مستحکم اور پسندیدہ وہموں میں سے ایک ہے) فرائڈ کے ابتدائے تعقین کی بنیاد کس حد تک تجرباتی ہے اپنی تصنیف "ٹوٹم اینڈ ٹیبو" (Totem and Taboo.) میں اس نے لکھا ہے "اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مذہب، اخلاقیات، معاشرہ اور فن کی ابتدائی صورتیں سب اوڈیپس کمپلیکس، (جنسی میلان بجانب والدین) میں جنم لیتی ہیں" اس طرح وہ تقریباً ہر انسانی شے کو اس کلیہ کے اندر سمو دیتا ہے اور یہ وہ کلیہ ہے جس پر جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اسے بالکل ناگہانی طور پر یقین آگیا تھا۔

اس امر کی ایک اور مثال کہ فرائڈ کس آسانی سے نتائج پر جست لگا کر پہنچا تھا۔ ڈاکٹر جونز کے ان الفاظ میں ملتی ہے۔

ایک دن ایک مریضہ نے یکایک اس کی گردن میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ یہ ایک غیر متوقع عجیب واقعہ تھا۔ خوش قسمتی سے ایک ملازم کے اس وقت آجانے سے صورت حال زیادہ خراب نہ ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد سے اس کی سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ مخصوص رشتہ جو علاج کے معاملہ میں اتنا کارآمد تھا (یعنی حاضرات (Transference.)) جذبۂ عشق پر مبنی تھا۔

جب فرائڈ نے پہلی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ جنسی صدمات تمام اعصابی امراض کی جڑ ہیں تو عام طور پر لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی اپنی جنسی ساخت ضرور مخصوص قسم کی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ نتیجہ صحیح تھا۔ اس کی خصوصیت زناکاری اور عیاشانہ زندگی کی سمت میں نہ تھی۔ اس کے برعکس فرائڈ جنسی تعلقات

میں ضرورت سے زیادہ محتاط اور زہد پسند تھا۔ وہ سختی سے ایک بیوی رکھنے کے اصول کا پیرو تھا، وہ فطری طور پر پر از شہرت نہ تھا اور عام گفتگو اور عمل میں اتنا محتاط اور پاکیزگی پسند تھا کہ اگر وہ عام کلب میں جاتا تو وہاں کے لئے غیر موزوں ثابت ہوتا۔ مختصر یہ ہے کہ وہ اسی قسم کا آدمی تھا جسے ایک لڑکی یکایک اُٹھ کر اور اس کی گردن میں باہیں ڈال کر اتنا متاثر کر سکتی تھی کہ وہ علاج کا ایک جدید نظریہ قایم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ میرا قیاس ہے کہ یہی تاثر تھا یعنی ایک پیدائشی زہد پسند شخص کا اس امر پر استعجاب کہ اس دُنیا میں کتنا آزادانہ اور خام قسم کا جنسی میلان موجود ہے جس نے فرائڈ کو کمسن لڑکوں کی جنسی ترغیب کے بارے میں اس انتہائی اور ناقابل یقین "ایک حقیقت" کا اعلان کرنے پر آمادہ کیا جس کے باعث اس پر بے حد ملامت کی بوچھار ہوئی اور اسے تکلیف پہونچی۔

جب اسے ایک سادہ لیکن خاص اہمیت کی حامل کسی حقیقت کا علم ہوتا تو وہ یہ محسوس کرتا اور جانتا تھا (بعینہٖ) کہ یہ کسی عام اور ہمہ گیر اصول کی ایک مثال ہے اور اس سے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کا خیال کرنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔۔۔۔ یہی طریقہ ہے جس پر ایک غیر معمولی ذہانت رکھنے والے شخص کا دماغ عمل کرتا ہے۔"

مذکورہ بالا الفاظ اس کے ایک عقیدت مند شاگرد کے اور ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں وہ ایک غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے، لیکن کس فن میں اسے غیر معمولی مہارت حاصل ہے؟ اس کی مہارت سائنسی تحقیقات سے

متعلق ہرگز نہیں ہے اور نہ علمِ ادب سے علاقہ رکھتی ہے حالانکہ فرائیڈ ایک خداداد قابلیت رکھنے والا انشا پرداز ہے۔ فرائڈ نے خود ایک ایسے لمحہ میں کہ جب اس پر انکسار کا غلبہ تھا اپنی غیر معمولی ذہانت کے لئے ایک نام تجویز کیا تھا۔ اگر ڈاکٹر جونز اسے قبول کر لیتا تو فرائڈ کی جو تعریف اس نے کی ہے اس میں موجودہ صورت سے زیادہ فہم و فراست کا عنصر ہوتا۔

اس نے کہا تھا:

"میں دراصل سائنس کا آدمی نہیں ہوں، نہ مجھے مشاہدے میں مہارت ہے نہ تجربہ کرنے میں اور نہ میں کوئی مفکّر ہوں۔ میں فطرتاً سوائے ایک "جانباز مہم جو" کے کچھ نہیں ہوں اور اس قسم کے انسان میں جس قسم کا شوقِ تجسّس، دلیری اور محکم گیری ہوتی ہے وہ مجھ میں ہے۔"

وہ درحقیقت ایک مہم جو تھا نہ کہ ایک ماہرِ سائنس جس نے لاشعور کے اس تاریک ترین افریقہ کا کھوج لگایا (یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یہ تاریک براعظم فرائڈ نے ایجاد کیا ہے۔ اس تصوّر سے اسے اور تمام جرمن عقلاء کو ایڈوارڈ فان ہاف مین ( Edward Von Hoffman. ) کی مابعد الطبیعیات سے متعلق تحریروں کے ذریعہ واقفیت ہو چکی تھی۔ اس کی قابلِ قدر کتاب فلسفۂ لاشعور مطبوعہ ۱۸۵۹ء فرائڈ کی زندگی میں گیارہ مرتبہ طباعت ہوئی تھی۔ فان ہاف مین نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس ملک کا کھوج اس نے لگایا ہے بلکہ اس کا یہ کہنا تھا کہ عقلی استدلال کے ذریعہ اسے ان چیزوں کا علم ہوا تھا جو وہاں پائی جا سکتی تھیں۔ یعنی قوتِ ارادی اور عقل بحالت مجادلہ) وہ

ایک مہم جوتھا اور شاعر. سائنسی سمجھ بوجھ کی ترقی کے لئے ان غیر متشکل خبیث روحوں کو جن سے فرائڈ نے مذکورہ ناقابل تصوّر ملک کو آباد کیا ہے جھاڑ پھونک کے ذریعہ ختم کرنا مجھے اتنا ہی ضروری معلوم ہوتا ہے جتنا کہ اس قلمی امداد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرنا جس کے ذریعہ فرائڈ نے سائنس میں ایک جدید باب کا اضافہ کیا ہے، لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ اس قریبی واقفیت کے بارے میں جو مجھے فرائڈ کے متعلق حاصل ہوئی ہے یہ تصوّر نہ کیا جائے کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں فرائڈ کی اس قلمی امداد کی عظمت کا احساس کم ہو گیا ہے. علم النفس کو محرک اور قوی بنانے میں یعنی اس میں ہیجان اور رد عمل، تعلق اور بے تعلقی کے بے جان تصورات کے بجائے آرزو اور فطری اُمنگ کے عناصر شامل کرنے میں فرائڈ کا بہت بڑا حصّہ ہے، اور اس کے اس انکشاف سے کہ اگر ان اُمنگوں کی تکمیل نہ کی جائے گی اور انھیں اتنا دبایا جائے گا کہ ان کا احساس ہی نہ رہے تو وہ ہسٹریا کے امراض، خوابوں اور عصابی امراض کی علامتوں وغیرہ کی شکل میں نمودار ہوں گی ہمارے نوع انسانی کے مطالعہ کی نوعیت ہی بدل گئی ہے. اس نے علم کی تاریخ میں جو ایک عظیم مقام پیدا کیا ہے وہ بالکل محفوظ ہے۔ اس امر کا دعویٰ کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس نے ایک نئی دُنیا اور ہستی کے ایک نئے سلسلے کا سُراغ لگایا۔ جو نہ نفس ہے نہ وہ

# ۲۔ برٹرانڈرسل

آج کل کے اونچے لوگوں میں برٹرانڈ رسل ہی وہ مصنف ہے جس کی کتابیں سب سے زیادہ دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں اس کا علم بھی ان سب میں اعلیٰ ہے جب لینن کا انتقال ہوا تو اس کے معتقد شاگردوں نے اس کے دماغ کا خوردبین سے معائنہ کرایا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آیا اس کا دماغ کسی پراسرار طریقہ پر عام دماغوں سے مختلف ہے۔ میرے خیال میں برٹرانڈ رسل کا دماغ معائنہ کرانے کے زیادہ قابل ہے کیونکہ وہ ایک ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی استعجاب انگیزی زیادہ متنوع ہے۔ جارج سنتیانا نے اپنی . . . . . . سرگزشت زندگی کی آخری جلد میں 'برٹی'، ( Bertie.. ) کو ایسا صاحبِ کمال بتایا ہے جس کا جواب اس کی نظر سے کبھی نہیں گزرا۔ وہ لکھتا ہے۔

"وہ علوئے نسب، فطانت، فضیلتِ علمی، ناقابل شکست جوشش، سرگرمیٔ عمل اور نمایاں فہم و فراست، مکمل دیانت داری اور ہمت کا مالک تھا۔ اس کے اندر انصاف پسندی کا جذبہ اتنا ہی تیز تھا جتنا کہ خوش مذاقی کا احساس۔ اسے ریاضی، طبیعی علوم اور تاریخ میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ دنیا کی

اہم زبانوں میں وہ کافی مہارت رکھتا تھا اور دُنیائے سیاست اور ادب میں واقع ہونے والی ہر چیز سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔"

بلاشبہ یہ تعریف بہت بلند اور وقیع ہے لیکن سنتیانا نے یہ بھی لکھا ہو کہ رسل کی ذہنی عظمت خود بخود کسی وجہ سے زائل ہو گئی تھی۔ مجھ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے زیادہ سختی سے کہا "اس کی فطانت کے ساتھ کچھ حماقت کی بھی آمیزش ہے۔"

جب میں نے رسل کی حالیہ تصنیف "یاد سے لکھی ہوئی توضیحات اور دیگر مضامین" (Portraits from Memory, and other Essays.) پر مورس ہنڈس کا تبصرہ پڑھا تو سنتیانا کا یہ قول مجھے پھر یاد آگیا۔ ہنڈس نے اس کتاب کی بے حد تعریف کی ہے جیسا کہ ہر اچھے تنقید نگار کو کرنا چاہیئے تھا لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے جس دیوی کی رسل پرستش کرتا ہے وہ شگفتہ مزاجی ہے اور یہ دیوی بعض اوقات اس سے احمقانہ حرکات سرزد کراتی اور احمقانہ باتیں کہلواتی ہے ......" میں احمقانہ یا بے وقوفانہ کے بجائے غیر ذمہ دارانہ یا غیر سنجیدہ کہوں گا، لیکن میں برٹرانڈ رسل کے بارے میں یہ دُورُخی رائے ایک عرصہ سے رکھتا ہوں :۔

اُس کی اعلیٰ دماغی قابلیت کے لئے بے حد تحسین کا جذبہ اور اس کی سیرت کی اس خصوصیت کے بارے میں ایک قسم کی پریشان کن کیفیت، وہ ایک مضحکہ خیز شکل کا انسان ہے، کسی نوک دار چونچ والی چڑیا یا چڑیا کی شکل کے پرنالے کی مانند اور بعض اوقات مجھے یہ خیال آتا ہے کہ

ابتدائی عمر میں اس پر اس چیز کا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ لوگوں کو یہ دیکھ کر ضرور تعجب ہوتا ہوگا کہ موجودہ نسل کا بہترین دماغ ایسے عجیب ظرف میں رکھا گیا ہے، تاہم وہ ناخوش گوار طور پر ایسا ہے۔ خوش گواری کا یہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس کی آنکھوں میں کسی اعلیٰ خیال سے پیدا شدہ دلچسپی کی چمک دیکھتے ہیں۔

بتیس سال کا عرصہ گزرا (۲۱ نومبر ۱۹۲۷ء کو) جب اس نے اور میں نے کوپر یونین (Cooper Union.) کے ایک بڑے مجمع کو اس بحث کے ذریعے جو اس کی کتاب "شاہراہِ آزادی" پر ہوئی محظوظ کیا۔ گھر واپس آ کر میں نے اس مضمون کا عنوان "دو برٹ انڈ رسل" تجویز کر لیا۔ میں اس وقت رسل کی بعض فلسفیانہ تحریریں پڑھ چکا تھا۔ خصوصاً یہ کتاب "ہمارا خارجی دنیا کا علم، فلسفہ میں سائنٹیفک طریقہ کے استعمال کے لئے ایک حلقۂ عمل کی حیثیت سے" (Our Knowledge of External World as a Field for Scientific Method in Philosophy)

یہ عنوان تقریباً اتنا ہی طویل ہے جتنی کہ کتاب ہے اور میرے نزدیک منطقی انداز میں ترتیب نہیں دیا گیا ہے۔ اسے اس طرح ہونا چاہیئے تھا "خارجی دنیا کے متعلق ہمارے علم کا مسئلہ وغیرہ......" لیکن خود کتاب مختصر ہے اور اس درجہ منطقی ہے کہ اس کی مثال فلسفہ کی کتابوں میں بشمول ان کے جو بڑی شہرت حاصل کر چکی ہیں شاذونادر ہی ملے گی۔ فلسفہ کی تمام کتابیں دو یا تین مستثنیات کو چھوڑ کر اس مقصد کے لئے وقف نظر آتی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے کسی ایسے

خیال کو صحیح ثابت کیا جائے یا اسے کائنات سے متعلق ایک تصور میں ڈھالا جائے جس سے فلسفی کی جذباتی ضروریات کی تسکین ہوتی ہے فلسفہ کے چہار سالہ نصاب سے فارغ ہونے کے بعد کم از کم میری یہ مستحکم رائے تھی۔ چند متشکک فلسفیوں (جیسے ہیوم، مانٹین، سیکسٹن، امپیریکس، پروٹیگورس) کے ساتھ ہمنوائی کے احساس کو میں بہت پسند کرنے لگا تھا۔ یہ ایسے لوگ تھے جنھوں نے بغیر کسی غرض کے کائنات میں انسانی دماغ کی کیفیت کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکتا تھا معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میرا یقین تھا اور اب بھی ہے کہ برٹرانڈ رسل ایسی ہی معتدل مزاج اور بلند مرتبہ ہستیوں میں سے ایک ہے اور یہ کہ فلسفہ کی ایک دانشمندانہ تاریخ میں اس کا مرتبہ محفوظ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے کوپر یونین کے مذکورہ جلسہ میں شرکت کی تو میں اس تصور سے کہ مجھے اتنے عظیم دماغ کے ساتھ مقابلہ کرنے کا اعزاز بخشا گیا ہے کسی قدر مرعوب تھا۔

رسل نے جس کتاب کو شائع کیا تھا اس کا عنوان تھا "آزادی کی طرف مجوزہ شاہراہیں"، اور میری افتتاحی تقریر جسے حسب معمول میں نے لکھ لیا تھا لیکن حافظہ سے ادا کیا تھا اسی کتاب پر ایک ایسی مفکرانہ تنقید پر مشتمل تھی جیسی میں اپنی بہترین استعداد کے مطابق کر سکتا تھا۔ بلاشبہ حاضرین میں سے ان اشخاص کے لئے جو عوامی انقلاب کو پسند کرتے تھے یہ تنقید ضرور فیصلہ کن معلوم ہوئی ہوگی۔ میں نے بہتر اجتماعی تنظیم کے تمام عظیم حامیوں پر ایک نظر ڈالی تھی اور یہ بتایا تھا کہ ان میں سے افلاطون سے لے کر رسل تک کسی نے بھی شاہراہِ آزادی کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائی۔ انھوں نے

ہمیں صرف یہ بتایا کہ جب ہم ایک آزاد معاشرہ حاصل کرلیں تو وہ کیسا ہونا چاہئیے میں نے پرزور انداز میں کہا کہ کارل مارکس نے یہ نہیں سوچا کہ جب ہم اسے حاصل کرلیں تو اسے کیسے ہونا چاہئیے (اور اس وقت مجھ میں اتنی خامی تھی کہ میں اس بات کو بہت دانشمندانہ تصور کرتا تھا) بلکہ اس نے اپنی پوری توجہ شاہراہ کے معلوم کرنے پر مرتکز کردی، یعنی مزدوروں کی جدوجہد کے ذریعے سیاسی اقتدار حاصل کرنے پر۔

رسل نے جواب دیا جیسا کہ اب دُنیا کو یہ سب بیان بہت زیادہ شستہ معلوم ہوتا ہے لیکن قابل یقین نہیں ہے اور یہ کہ انسانی تاریخ کو ایک ایسا عمل سمجھنا جیسا کہ ایک تجربہ گاہ میں کیا جاتا ہے ہمارے لئے ناممکن ہے (کم از کم اس مفہوم کے الفاظ کہے) اور اس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ مارکس کی انقلابی تبدیلی کی پیشین گوئی، کو جس کی تکمیل کا میں اب تک انتظار کررہا تھا کتنے سال گزر چکے ہیں، اور اس نے ان اشخاص کی بے وقوفی کا ذکر کیا جو آئندہ تاریخی واقعات کے متعلق طویل المیعاد پیشین گوئیاں کرسکنے کی خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ اس نے پُرزور طریقہ پر کہا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس وقت یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے سات سال میں کیا واقع ہونے والا ہے۔

اپنی تقریر کے اختتام پر پہونچکر (اور یہ کوئی تقریر نہیں بلکہ ایک شاندار غیر مسلسل گفتگو تھی) اس نے اتفاقاً کافی صفائی کے ساتھ یہ کہنا شروع کردیا کہ بیسویں صدی کے بقیہ حصہ میں کیا واقعات پیش آنے کی توقع کی جاسکتی تھی اور ایک برجستہ تقریر کرنے والے شخص کا ایسا کرنا غیر متوقع نہ تھا لیکن یہ

ایک نقصان رساں ناگہانی واقعہ تھا اور میں نے اپنے تردیدی جواب میں کارل مارکس کی پیش گوئی کرنے کی اہلیت کے حیرت انگیز فرق کا خوب مذاق اُڑایا۔ اس کا جواب فیاضانہ تھا اور ہوش مندانہ بھی۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس حادثۂ مسعود کی وجہ سے غالباً مجھے (مصنف کو) بحث میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی لیکن اس کی رائے میں اس سے طبقاتی جدوجہد کے ذریعے ارتقا کے نظریہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا تھا۔

اس بحث کے بعد ہم نے اکٹھے شہر کی سیر کی، اور میں نے کوشش کی کہ اپنے اُستاد جان ڈیوی کے بارے میں اس سے کچھ بصیرت افروز گفتگو سنوں۔ اپنی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے میں اب بھی ڈیوی کے آلاتی فلسفہ کی جانب رجوع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں رسل نے صرف یہ کہا "مجھے وہ نہایت سُست قسم کا انتشار پرداز معلوم ہوتا ہے"

اگرچہ اس کے بعد میں اکثر رسل سے ملا ہوں، ایک ہی ٹیکسی میں اس کے ساتھ سفر کیا ہے، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے اور دونوں نے ایک ہی پلیٹ فارم سے تقریریں کی ہیں لیکن باہمی گفتگو میں مذکورہ حد سے ہم کبھی آگے نہیں بڑھے۔ کوئی چیز ہم دونوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، خواہ یہ اس کی دماغی عظمت کے لئے میرے دل میں بہت زیادہ عاجزانہ جذبۂ ستائش ہے یا اس کی یہ رائے کہ میں کوئی دماغ ہی نہیں رکھتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کون سی بات ہمارے درمیان حائل ہے۔ ریاضی بلاشبہ میرے جیسا مزاج اور عادات رکھنے والے شخص کے لئے ایک پریشان کن چیز ہے۔ اگرچہ میں نے جبرو مقابلہ اور علم مثلث دونوں میں امتحان پاس کیا ہے،

علم جسامت اور علم سطح تو جانتا ہی ہوں، تاہم میں فوراً دو عددی مسئلہ بیان نہ کر سکوں گا اور نہ یہ بتا سکوں گا کہ لوگارتم کیا ہے گو میرے سر پر ڈمو کلیس[1] کی تلوار ہی لٹکتی ہو پس شاید یہ ریاضی کا بھوت ہی ہے جو ہمارے درمیان حائل ہے اور وہ بھوت اس پر اسرار اور نا قابل فہم اشارے سے مجھے اپنی جگہ پر رکھتا ہے جس نے دُنیا کے حساب نہ جاننے والے کل انسانوں کو گاؤدیش کا درجہ دے دیا ہے

بہر صورت اس ٹکڑہ میں برٹرانڈ رسل کا صرف ایک فقرہ اور درج کیا جائے گا جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ یہ فقرہ بھی اس وقت کہا گیا تھا جب ہم مباحثہ سے لوٹ کر گھر جا رہے تھے۔ اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا اور یہ حقارت آمیز انداز میں کہا گیا تھا) جو شخص بھی ہمارے ان مباحثوں اور تقریروں کو سنجیدہ اور اہم سمجھتا ہے وہ یقیناً بے وقوف ہے"۔ میں نے ان میں جو حصّہ لیا وہ سنجیدگی سے لیا تھا جیسا کہ میرے مسودہ سے ثابت ہے، اس لئے میں نے اس کا جواب کچھ بھی دیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرا دل اس سے کڑھا۔ چونکہ اس وقت اسے ان مباحثوں اور تقریروں سے جو نا تجربہ کار امریکی علم دوست اشخاص کو ایک عظیم برطانوی فلسفی کی زیارت کرنے اور اس سے حکمت و دانائی کے موتی رولنے کا موقع دے رہے تھے قابلِ رشک آمدنی حاصل ہو رہی تھی اس کو اپنی بہترین قابلیت کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔ مجھے یہ بھی خیال ہوا (اس وقت) کہ اس کی سیاسی رائیں اتنی ہی بے لطف اور سطحی تھیں جتنے کہ اس کے فلسفیانہ تخیلات عمیق تھے میرے

---

[1] لـ

عنوان "دو برٹرانڈ رسل،، کا ماخذ یہی خیال تھا۔ اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری شُستہ تقریر کا اس نے جو جواب دیا تھا وہ باوجود اس اتفاقیہ بے احتیاطی کے جو اس سے سرزد ہوئی بہت معقول تھا، لیکن اس جلسہ کے شائقین حاضرین کے ساتھ جو غیر سنجیدہ رویہ اس نے اختیار کیا اس کو میں اب بھی بہت ناپسند کرتا ہوں۔ ایک نقطۂ نظر سے لائبریری کی وہ کتاب بھی جو اصول ریاضی پر لکھی گئی ہو اس تقریر سے جو کوپر یونین میں شاہراہِ آزادی پر کی گئی بہت زیادہ بلند مرتبہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ میں ان دونوں مقامات پر ایک ہی برٹرانڈ رسل دیکھنا پسند کروں گا۔

میں اپنے منشا کی توضیح کے لئے ایک دوسری مثال دیتا ہوں۔ زیادہ سال نہیں گزرے کہ میں نے رینڈ اسکول برائے علوم عمرانی میں اس کی ایک تقریر سُنی۔ یہ تقریر ارسطو پر تھی اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک بڑا مجمع جو زیادہ تر مزدور طبقہ کے تھے اسے سُننے کے لئے جمع ہو گیا تھا اور دانشمندی اور رشد و ہدایت کے جو بھی جواہر پارے وہ اس مشہور اور حقیقتاً عظیم شخصیت سے حاصل کر سکتے تھے ان کو اپنی نہایت پُرشوق آنکھوں کے ذریعہ پیاسوں کی طرح نوش جان کر رہے تھے۔ اس عظیم شخص نے ایک نہایت عمدہ تقریر کی، شاید وہ اس کی کتاب "مغربی فلسفہ کی تاریخ" کا ایک باب ہو۔ خاص طور پر "خیر" کے موضوع پر جیسے ارسطو علوِ نفس (Megalopsy-chia) کہتا ہے اور جس کا ترجمہ اکثر غلط طور پر فراخ دلی (Magnanimity) کیا جاتا ہے۔ اس نے بصیرت افروز روشنی ڈالی۔ اس کے معنی عالی دماغی یا عزت نفس

کے مفہوم سے زیادہ وسیع ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے معنی "مقتضیاتِ امارت" ہیں کیونکہ دراصل یہ ایک امیرانہ صفت ہے۔ رسل کی تقریر اس موضوع پر بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز طور پر دقیق تھی۔ لیکن بعد میں انہی پر شوخ آنکھوں والے نوجوانوں میں سے ایک نے جو تیرہ اور اُنیس سال کے درمیان کی ایک لڑکی تھی اور جس کا سَرم کی وجہ سے اور مفہوم سمجھنے کے شوق میں سانس پھولا ہوا تھا۔ ایک سوال اس سے پوچھا، سوال شاید زیادہ محققانہ نہ تھا۔ اس نے لڑکی کو اس عامیانہ مذاق کے ذریعہ کہ وہ یہ مسئلہ مسز ارسطو سے دریافت کرلے دُنیائے علم سے خارج اور چلتا کیا۔ جب میں نے اس لڑکی کو بڑی کوفت کی حالت میں اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دیکھا تو میرے دل میں یہ خیال آیا "کیا خوب، اس نے . . . . . . .

ایک اعلےٰ درجہ کی تقریر فراخ دلی کی موافقت میں کی ہے لیکن اتنی ہی کامل مثال اس کے خلاف قائم کی ہے۔"

غالباً اس لیکچر کے بعد ہی یہ ہوا کہ برٹرانڈ رسل نے مجھ سے رینڈ اسکول کے ایک بغلی کمرے میں اپنی بے انتہا خراب مالی حالت کا رازدارانہ طور پر ذکر کیا۔ اس کے انقلاب آور خیالات نے خصوصاً ان خیالات نے جو وہ فوجی حب الوطنی اور شادی کے متعلق رکھتا تھا فلسفہ کی پروفیسری کے بے شمار عہدوں کے دروازے اس پر بند کردیئے تھے جو بصورتِ دیگر اس کے لئے کھلے ہوتے۔ اس مشکل کو گویا انتہا پر پہونچانے کے لیئے وہ فلیڈلفیا کی پرشور آرٹ فاؤنڈیشن کی پروفیسری سے یکایک علیحدہ

کر دیا گیا تھا۔ اس فاؤنڈیشن کو ارگیرول کنگ اور سابقہ انعامات کے لئے مقابلہ کرنے والے سنکی بھر البرٹ سی بارنیز نے قائم کیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ میں اپنی روزی کیسے کماؤں اور اس کی آواز سے حقیقی پریشانی نمایاں تھی۔

مذکورہ واقعہ سن کر ناظرین کو تعجب ہوگا لیکن وہ تعجب اس سے زیادہ نہ ہوگا جو مجھے اس وقت رسل کی کیفیت معلوم کرکے ہوا تھا۔ میں یہ جان کر یہ دیکھ کر کہ اتنا بڑا صاحب دماغ شخص ایسی مصیبت میں مبتلا ہے خوفزدہ سا ہو گیا کہ میں اگلی ہی صبح کو معاشرتی تحقیق کے "نیو اسکول" میں گیا اور اس کے بانی اور ناظم ایلون جانسن سے درخواست کی کہ وہ برٹرانڈ رسل کو کوئی ملازمت دے دے۔ (میرا جذبۂ ستائش رسل کے عمیق دماغ کے لئے اس ناپسندیدگی کے جذبے سے کہیں زیادہ قوی تھا جو اس کی غیر سنجیدہ باتوں سے میرے دل میں پیدا ہوا تھا) میرا خیال تھا کہ جانسن اور نیو اسکول دونوں اتنی جرأت رکھتے تھے کہ ایسے معاملے میں وہ رائے عامہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ مجھے جب جانسن سے اپنی درخواست کا جواب ملا تو مجھے یقین ہو گیا کہ رسل نے اپنی مشکلات کی کیفیت بیان کرنے میں مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ جانسن نے میری باتیں صبر سے سنیں؛ اس کی آنکھوں سے خوش مزاجی جھلک رہی تھی اور اس کے پائپ سے بھی خوش اخلاقی عیاں تھی۔ یہ دونوں چیزیں جانسن کی شخصیت کا ایک جز بن گئی ہیں اور جس وقت میری درخواست ختم ہوئی تو اس نے پائپ کو دوستانہ توجہ کے انداز میں منہ سے ہٹایا اور یہ کہا۔

میکس! مجھے تمھاری ہر بات سے اتفاق ہے ... لیکن یہ مسئلہ متولیوں کے سامنے ضرور پیش ہوگا۔ میں اسے ان کے سامنے پیش کرونگا لیکن میں تمھیں پہلے ہی سے یہ بتا سکتا ہوں کہ ان سے کوئی موافق جواب ملنے کی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔"

برٹرانڈ رسل کی دوہری طبیعت کی وجہ سے ان اُمور کے علاوہ جن کا میں ذکر کر چکا ہوں اور بھی دلچسپ اثرات رونما ہوئے ہیں۔ ڈبلو بی ایٹس نے ایک خیالی خط میں جو اس نے ایک اسکول ماسٹر کو اپنے لڑکے کی تعلیم کے بارے میں لکھا یہ دلچسپ بات درج کی ہے۔ میرے لڑکے کو ریاضی اس کی استعداد کے مطابق پورے طور پر سکھایئے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ برٹرانڈ رسل نے ہر بات غلط لکھی ہوگی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ کتنا بے وقوف آدمی ہے لیکن چونکہ میں ریاضی نہیں جانتا ہوں میں اس کی غلطیاں ثابت نہیں کرسکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا بھی ایسا ہی لاچار ہو۔"

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا بھی اس عظیم فلسفی کے متعلق اس دو رُخے اندازِ فکر میں شریک ہے۔ اس میں اسے ایک سوانح حیات سے متعلق مضمون میں مزاجی اعتبار سے قطعی یاسیت کے تابع اور انتہا پسند بتایا ہے اور یہ کہ دُنیا کے واقعات پر وہ تقریباً چڑچڑے پن سے تنقید کرتا ہے، اور اس میں یہ طنزیہ اعلان بھی موجود ہے کہ "موجودہ طبیعیات سے وہ ایسے مسائل اخذ کرنے میں خاص طور پر کامیاب ہوگیا ہے جو اس کے مزاج سے زیادہ سے زیادہ میل کھاتے ہیں۔" لیکن جب انسائیکلوپیڈیا کے لیئے نہایت دقیق اور

مشکل موضوع پر ایک مقالہ لکھانے کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسا مقالہ جس کے لئے تیزی اور توازن ذہنی کے ساتھ ساتھ نہایت قابلِ اعتماد قسم کے علم کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی خود موضوع ''علم'' ہو۔ ہم کیا اور کس طرح علم حاصل کر سکتے ہیں۔

میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے اگرچہ میں اس کی تصدیق نہیں کر سکتا کہ اس دوہری شخصیت کا وہ رکن جو نکما اور غیر ذمہ دار ہے اس وقت زیادہ بروئے کار آتا ہے جب اس کا امریکہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ بہت سے دوسرے ممتاز یورپین سالانہ سمندر پار کر کے یہاں آتے ہیں اور ہماری اسی صوبائی عقیدت مندی کی سونے کی کان سے جو ہمیں پرانی دنیا کی تہذیب سے ہے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں (یہ قدرتی چیز ہے) ان میں سے زیادہ تر تمام اشخاص نے ایک اچھا لیکچر دینے کی سخت کوشش کی خواہ وہ کوشش کتنی ہی ناکام رہی ہو۔ مثال کے طور پر ایٹس نے (۱۳) کے سوانح نگار کے بیان کے مطابق "اپنی بہترین قابلیت کو کام میں لانے کی ہمیشہ کوشش کی اور اس کے دل میں مذکورہ خیال پیدا ہونے کے اسباب میں اس کی اپنی عزت کے احساس اور دوسروں کے حقوق کے پاس و لحاظ کے مقابلہ میں اسکی پیدائشی خوش اخلاقی کا حصہ کچھ کم نہ تھا۔" لیکن برٹرانڈ رسل نے صرف یہ کیا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے خیالات کے اظہار میں بے ربط تقریر شروع کر دی۔ شاید یہ حقیقت ہے کہ وہ تنہا ایسا شخص تھا جو کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار اس خوف کے بغیر کر سکتا تھا کہ اس کا ذخیرۂ خیالات ختم ہو جائیگا یا اس ذخیرہ پر اس کا قابو نہ رہے گا۔ بہر حال میں یہ خیال کرنے پر مجبور

ہوں کہ وہ برطانیہ کے سامعین کے روبرو دیئے جانے والے لیکچروں میں ایسی شاہانہ بے پروائی کی روش اختیار نہ کرتا۔ وہ اپنی اس حالیہ کتاب میں لکھتا ہے کہ "انگلینڈ کی محبت شاید سب سے بڑا جذبہ ہے جو میرے اندر موجود ہے۔" یہ ایک ایسا بیان ہے جس کا اس شخص کی طرف سے پیش کیا جانا جو کائنات سے قریب ترین تعلق رکھنے والا معلوم ہوتا ہے اتنا حیرت انگیز ہے کہ اس سے میرے اس احساس کو تقویت ہوتی ہے کہ اس کی شخصیت اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہے۔

رسل خود بھی مذکورہ احساس کو کسی قدر تقویت پہونچاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری زندگی کا سنجیدہ حصہ میرے بچپن سے دو مختلف مقاصد کے لئے وقف ہے..... ایک طرف میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا کچھ علم حاصل ہو سکتا ہے اور دوسری طرف ہر وہ امکانی کام کرنا چاہتا تھا جس سے دنیا میں زیادہ مسرت پیدا ہو۔" اس پر وہ یہ اضافہ کرتا ہے کہ "میں نے ریاضی کی منطق پر جو شروع میں کام کیا تھا اس کے مقابلہ میں وہ کام جو میں نے معاشرتی مسائل کے سلسلے میں کیا ہے زیادہ مشکل اور نتائج کے اعتبار سے کم فائدہ مند معلوم ہوا۔" اس کا خیال ہے کہ آخر الذکر کام اس لئے زیادہ مشکل ہے کہ اس کی کامیابی دوسروں کو ترغیب دلانے پر منحصر ہے۔ "مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ معاشرتی اور سیاسی مسائل کے سلسلہ میں اس کا رجحان کام کرنے کے مقابلہ میں ترغیب دلانے پر زیادہ وقت صرف کرنے کا تھا۔ کام سے میرا مطلب صحیح رائیں قائم کرنا ہے۔ کم از کم اس میدان میں غیر سنجیدہ برٹرانڈ رسل

رسل اکثر اوقات اعلیٰ دسترس کا مالک معلوم ہوتا ہے۔

مذکورہ بیان کے بعد مجھے جلد ہی اتنا اضافہ اور کرنا چاہیئے کہ ۱۹۲۰ء میں جب وہ سوویٹ روس گیا تھا برٹانڈرسل بڑی تیزی سے اس رائے پر پہونچ گیا جس کی زمانہ نے تصدیق کردی ہے۔ جب کہ ہم میں سے بہت لوگ جو پہلی جنگ عظیم کے بارے میں اسی کی طرح دلیرانہ خیالات رکھکر اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کر رہے تھے وہ صحیح نتیجہ پر پہونچ گیا تھا۔ اس امر واقعہ کے بارے میں وہ اظہار فخر سے گریز کرتا ہے لیکن وہ پورے طور پر فخرو مباہات کے اظہار کرنے کا مستحق ہے۔ اس ابتدائی زمانہ ہی میں اس "عظیم تجربہ" کے متعلق اس کی مخالفانہ روداد میں تقریباً وہ سب کچھ درج تھا جو ہم باقی لوگوں نے بہت کچھ ذہنی قوت یا عاجزی پیدا کرنے میں وقت ضائع کرنے کے بعد کہا۔ یہ بات نہ تھی کہ گویا وہ مخالفانہ تعصبات دل میں لیکر وہاں گیا تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف ریل گاڑی میں سوار ہونے سے کم و بیش ایک ماہ قبل اس نے اپنے اشتمالیت (Communism) قبول کرنے کا حیرت انگیز اعلان کر دیا تھا۔ اسے اس اعلان کو اس زمانہ ہی میں واپس لینا پڑا جب کہ وہ کل مغربی دُنیا کی اشتمالیت پسند مطبوعات میں نمایاں ترین سرخیوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا تھا۔

اس واقعہ کی یاد میرے ذہن میں اس لئے زیادہ گہری ہے کہ اس نے میرے ہی رسالہ لبریٹر (Liberator.) میں اشتمالیت قبول کرنے کا پہلا اعلان شایع کرایا تھا۔ ہم نے اس کو بہت موٹے ٹائپ میں رسالہ کے اولین

صفحات پر چھاپا تھا اور ہم خوش ہوئے تھے کہ ہمیں ہمارے ساتھ مل کر جنگ کرنے والا ایک ایسا ساتھی مل گیا ہے جو ہمارے دشمن عوام الناس کے دلوں میں اگر خوف نہیں تو کم از کم احترام کے جذبات ضرور پیدا کرے گا۔ اس نے اپنی رجعت "لبریٹر" کو نہیں بھیجی بلکہ ہمارے حریف نیشن (Nation) کے پاس ارسال کی، غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے اس کے چھاپنے کی زحمت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں آزادانہ بحث و تمحیص اور عوامی انقلاب پر اعتقاد رکھتا تھا اور مجھے اس کو شائع کرنا پڑتا۔ موجودہ صورت میں مجھے احساس ہوا کہ میں اس عظیم المرتبت فلسفی کو جواب دینے پر مجبور رہوں، چنانچہ میں نے پورے عالمانہ زور کے ساتھ جواب لکھا اور اپنے مضمون کا عنوان رکھا "افلاطون، نیٹشے اور برٹرانڈ رسل"۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اس کی رجعت کو طبقاتی احساس کا ردعمل قرار نہیں دیا اگرچہ ایسا کرنا اس واقعہ کے پیش نظر آسان تھا کہ اس ہم سفر رابرٹ ولیمز نے جو مزدوران حمل و نقل کی برٹش یونین کا صدر تھا اپنی برٹش کے قطعی برعکس یہ اظہارِ خیال کیا "میری تمام سابقہ امیدوں اور توقعات کی کافی سے زیادہ تصدیق ہو گئی جب میں نے سوویٹ روس کے معاملات سے براہ راست واقفیت حاصل کی"۔ میں نے اس آسان دلیل پر توجہ نہ کی اور اپنے کامل غیر مارکسی قسم کے انقلاب پسند خیالات کے مطابق جواب دیا۔

میں نے لکھا "ان لوگوں کے لئے جن کی عقل شدّت پسند اور خالص ہے یا جو محاربانہ ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے

معاشی یا معاشرتی ماحول سے علیحدگی اختیار کرسکیں اور انقلابی جدوجہد کے عمل کو سائنٹیفک طریقہ پر سمجھیں اور اپنی ذاتی قوت کو اس سمت میں صرف کریں جہاں انسانی زندگی کی آخری اُمیدیں پوری ہو سکتی ہیں۔" بے لاگ منطق میں رسل کی استعداد اور فلسفہ میں سائنسی طریقہ کے استعمال کے لئے اس کی پُرزور حمایت دونوں کے لئے میں نے اسے خصوصی خراجِ تحسین ادا کیا۔"

میں نے پوچھا کہ "وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو معاشرہ کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے سلسلے میں اس سادہ اور مشہور طریقہ کو کام میں لانے سے روکتی ہے؟ یہ عیسائیت کی متعدی بیماری ہی ہے جو محض خوش گوار چیزوں کو نصب العین بنانے اور لاحاصل کی پرستش کرنے کی جانب انسان کو مائل کرتی ہے۔"

میں نے اپنے بلند پایہ عقیدہ پر اس کے نہایت تباہ کن حملہ کا جواب دیا۔ جب اس مضمون پر مشتمل میرا اداریہ شائع ہوا تو اس وقت برٹرانڈ رسل چین میں تھا۔ اس کی بیوی ڈورا رسل نے اس کا ایک لمبا چوڑا جواب لکھا اور اس نے میرے پاس اپنا مسودہ یہ کہکر بھیجدیا کہ اس میں رسل کے خیالات ہیں۔ میں کسی اعتبار سے بھی ایک زود رنج شخص نہیں ہوں۔ میرا احساس کمتری اس سے الگ دوسری شکلیں اختیار کرتا ہے، لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اپنی نہایت احتیاط اور گہرے غور سے لکھی ہوئی تنقید کے اس مشتبہ یا بے تکے طریقِ جواب سے خوش نہ ہوا اس وقت سے دو مرتبہ، ایک مرتبہ ایک خط میں اور ایک اتفاقیہ ملاقات میں، برٹرانڈ رسل نے مجھے یہ ملامت کی ہے کہ میں نے اس کی بیوی

کا خط شائع نہ کرکے آزادانہ بحث کے اصول کی خلاف ورزی کی ہے ہیں نے کسی موقع پر بھی جواب میں یہ بات نہیں کہی (جو میرا خیال تھا کہ بالکل عیاں تھی) کہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ناگوار صورت حال کی اشاعت کروں جس میں میں اپنے اداریہ کے اس جواب سے گھر گیا تھا جو اس نے ایک غیر معروف عورت کے ذریعہ سے دیا تھا جو اتفاقاً اس کی بیوی تھی۔ چونکہ مجھے اب بھی اس موضوع سے قریبی تعلق ہے اس لئے میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آیا وہ ایسا ہی مراسلہ کسی برطانوی مدیر کو بھیجنا پسند کرتا۔

میری تمنا ہے کہ میں اس "سخت تصوریت" کے بارے میں جسے میں مارکسی عقائد کی اس صورت میں کہ وہ ہیگل کے مابعد الطبیعیاتی خیالات سے پاک ہوں روح سمجھتا ہوں ایسی ہی خوش اعتقادی اب بھی رکھتا جیسی کہ ان ایام میں رکھتا تھا۔ جب برٹرانڈ رسل اپنا یہ تیقن ظاہر کرتا ہے کہ انسانی معاملات میں پائدار ترقیاں صرف وہ ہیں جن سے رحمدلی میں اضافہ اور ظلم و تشدد میں کمی ہو تو میرے احساسات اس شخص کے سے ہوتے ہیں جسے گزشتہ زمانہ کی یاد ستاتی ہو۔ میری پرورش اسی قسم کے خیالات پیدا کرنے والے ماحول میں ہوئی تھی اور میں اپنے بچپن کی طرف جانا پسند کروں گا، لیکن میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ ہم ایک بڑے پیمانہ پر رحم دلی کے جذبات میں اضافہ اور بے رحمی میں کمی پیدا کر سکتے ہیں۔ جب تک کہ ہم انتخابی پیدائش اور تربیت کے اصول پر عمل نہ کریں۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ سیاسی برٹرانڈ رسل ان اُمور کا مقابلہ اس ثابت قدمی، محنت اور منظم عظم بالجزم

کے ساتھ نہیں کرتا جس سے کہ فلسفی برٹرانڈرسل منطق یا ریاضی کے کسی مسئلہ کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان سیاسی امور کے بارے میں اتنا متیقن نہیں ہو سکتا جتنا کہ ریاضیاتی امور میں ہو سکتا ہے، لیکن انسان اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر سکتا ہے کہ وہ خود کسی امر پر ممکن حد تک یقین رکھنے سے پیشتر دُنیا کو اس امر پر یقین کرنے کا مشورہ نہ دے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی برٹرانڈرسل یہ پابندی اپنے اوپر عائد نہیں کرتا۔ سوویٹ روس جانے کے بعد اس کی رجعت ایک ایسا فعل تھا جسے ایک تحقیق کردہ سچائی کے ساتھ قابل ستائش عقیدت مندی کہا جائے گا۔ یہ عمل تعریف تحسین سے بے نیاز ہے، لیکن کیا اشتمالیت قبول کرنے کے متعلق اس کا حیرت انگیز اعلان ٹھیک اُس وقت جب وہ روس روانہ ہو رہا تھا اسی معیار کے مطابق کسی قدر غلط شعارانہ اور غیر صحیح نہیں تھا؟

معاشرتی مسائل پر کام کرنے کے دوران میں برٹرانڈرسل نے اپنی رائے میں بہت سی ایسی عجیب تبدیلیاں کی ہیں اور وہ تبدیلیاں بدلنے والے حالات کے تقاضوں کے تحت ہو سکنے والی تبدیلیوں سے کہیں زیادہ عجیب ہیں۔ مجھے یاد ہے (اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا) کہ اس نے نیو لیڈر (New Leader) میں یہ اعلان کیا تھا کہ محبت بہر حال ایسی قوت ہے جو دُنیا کو تباہی سے بچا سکتی ہے، لیکن ۱۹۴۸ء میں ویسٹ منسٹر اسکول میں ایک خطبہ دیتے ہوئے جسے شائع کرانے میں اس نے کافی محنت کی وہ کہتا ہے:۔

دُنیا میں صرف ایک مسلح فوج ہونی چاہیئے جو ماورائے قومیت اور سب سے طاقتور ہو تنہا اسی طریقہ سے بڑی جنگوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔

بین الاقوامی معاہدے کے ذریعے ایسی فوج قایم ہونے کی بہت ہی کم اُمید ہے۔ مغربی ممالک اور ریاستہائے متحدہ کا اتحاد اور دولت مشترکہ ایسی فوج کا مرکزی حصّہ ہیں۔ اسے کل دُنیا پر اپنے آپ کو حاوی کرنا چاہیئے اور بے مثل طور پر طاقت ور رہنا چاہیئے جب تک کہ دُنیا تربیت پاکر متحد ہونے کی صلاحیت پیدا نہ کرلے۔" یہ خطاب اس پیغام سے کہ محبت دُنیا کی نجات دہندہ ہے بہت زیادہ مختلف ہے۔

اگرچہ یہ کافی دلچسپ تبدیلیاں ہیں لیکن ان تیز رفتار تبدیلیوں میں سے کوئی بھی اتنی غیر متوازن نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ اشتمالیت کے خلاف جنگ کرنے کے موضوع پر گزشتہ سات سال میں اس کے جذبات اور رائے میں واقع ہوتی رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں نیویارک ٹائمس میگزین میں اس نے ایک نعرۂ جنگ شایع کیا جس نے ہزاروں اشخاص کو جو حقیقی اقدار کی پروا کرتے ہیں اس جنگ میں شرکت کرنے کے لئے اُبھارا ہوگا۔ اس نے محاربانہ فصاحت کے ساتھ کمیونسٹ آمریت کے تحت زندگی کے ہولناک مصائب کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:

"سوویٹ آدمی اپنے خاندان اور دوستوں کو ایسے حالات میں پھنسانے کے لئے جہاں وہ آہستہ آہستہ ذبح ہو جائیں گے گھٹنوں کے بل چل کر مخبری کرتا ہے۔" "وہ ایک ایسی دُنیا ہے جس میں انسانی احترام کوئی

معنی نہیں رکھتا۔" "ایک دنیا جس میں لوگوں کے ذلیل غلام بنائے جانے کو صحیح اور مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے غلام جو ان دیوتاؤں کے سامنے سجدہ کریں جو مملکت کی عظمت کے مظہر ہیں۔"

اس کا نعرہ یہ تھا کہ "ہمیں اس تصوّر کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ ایسا تصوّر ہے جو اگر غالب آگیا تو زندگی کی ہر قابل قدر چیز کو ختم کر دے گا اور ذلیل جانوروں کے ایسے گروہ کے سوا جسے سخت نظم و ضبط میں رکھا گیا ہو کسی کو نہ چھوڑے گا۔ میرے تصوّر میں اس سے زیادہ اہم اور وقیع معاملہ جس کے لئے جنگ کرنا ضروری ہو نہیں آسکتا۔"

اس نعرۂ جنگ کے شائع ہونے کے بعد آٹھ برس کے دوران میں "ذلیل جانوروں کے پابندِ ضوابط گروہ" نے باوجود اس کے کہ اس کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تمام دنیا میں مسلسل کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ جنگ جس کی ہمیں اتنی شان کے ساتھ دعوت دی گئی تھی اب بھی لڑی جا رہی ہے اگرچہ یہ کام کسی قدر زیادہ مایوس کن حالات میں ہو رہا ہے لیکن ہمارے علم بردارِ دانش اور ہمارے عظیم فلسفی کا اب کیا حال ہے جس نے خالص عقل کی بلندیوں سے نیچے اتر کر ہمیں "تمام انسانی اقدار" کی خاطر جنگ کرنے کی دعوت دی تھی؟ وہ پھر ایک مرتبہ بلندیوں پر چلا گیا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اشتمالیت کی طرح "خلاف اشتمالیت" بھی ایک ایسا عقیدہ ہے جس کی بنیاد اذعانی اصولوں اور کٹر پن پر رکھی گئی ہے اور جس کے ثبوت کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے،" وہ کہتا ہے کہ قومیت، فاشزم، اشتمالیت

اور اب خلاف اشتمالیت، سب نے اپنے کٹر اور پرجوش پیرو پیدا کر دیئے ہیں جو کسی خود پسند عقیدہ کے مفاد کے لئے دُنیا میں بے انتہا تباہی ور بربادی لانے کے لیئے تیار ہیں۔

اور تمام انسانی اقدار کے دُشمنوں کی اطاعت قبول کر لینے کی سند مہیا کرنے کے طور پر اس نے ایک دوسری کتاب مصنفہ کارلس لیمنٹ (Corbis Lamont) کا دیباچہ لکھا ہے۔ یہ مصنف مغربی دُنیا میں ذلیل جانوروں کے پابند ضوابط گروہ" کے سب سے زیادہ بے باک حامیوں میں سے ہے اس دیباچہ میں وہ امریکہ کے خلاف اتہامات کے سلسلہ کی انتہا پر پہونچ گیا ہے۔ یہ تحریر اگر کسی ایسے شخص نے لکھی ہوتی جو ذہنی کارناموں کے لحاظ سے اس سے کم شہرت کا مالک ہوتا۔ تو تقریباً اختلالِ دماغ کی کارگزاری معلوم ہوتی۔ میں اس مجنونانہ گفتگو کی صرف ایک مثال پیش کروں گا کیونکہ مجھے اس میں کوئی خوشی محسوس نہیں کرتا کہ برٹرانڈرسل کے کارخانہ کے اس پُر دار سٹریک کی ان پروازوں پہ بحث و تحیص کروں۔

"ایف۔ بی۔ آئی کے اراکین غیر متشدد" آزاد خیال تنظیموں میں بھی بحیثیت جاسوس شریک ہو جاتے ہیں اور غیر محتاط طور پر کہی ہوئی باتوں کے متعلق بھی رپورٹ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اتنا بھی کرتا ہے کہ کالے لوگوں کے لئے برابری کے حقوق کی تائید کرے یا اقوامِ متحدہ کی کچھ تعریف کر دے تو وہ اس کا مستوجب ہو جاتا ہے کہ ایف۔ بی۔ آئی کے افسر اس سے ملاقات کرنے آئیں اور اگر اس پر مقدمہ چلانے کی دھمکی نہ دیں تو

کم از کم سیاہ فہرست میں اس کا نام درج کیئے جانے اور نتیجۃً روزی کمانے کے ذرائع سے محروم ہو جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ جب ان ذرائع سے کافی دہشت پیدا کر لی جاتی ہے تو دہشت زدہ شخص کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے دوستوں کی جن کی تعداد خاصی بڑی ہوتی ہے مخبری کرے یا ان پر الزام لگائے تو اس کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔"

میرا خیال ہے کہ برٹرانڈ رسل اس انتہائی عدم رواداری کو جو بعض اشخاص کے اندر اشتمالیت کے خلاف جنگ کے جذبہ کے نتیجہ میں پیدا ہو گئی ہے اجتماعیت پرست سخت گیر ریاست کے منظم بہیمانہ مظالم سے تشبیہ دے کر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ غیر متعصب استدلال کی ایک مثال پیش کر رہا ہے، لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ گہرا اور غیر معقول متعصب ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن یہ وہ بات نہیں ہے جس پر میں اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا تھا "اس عظیم جنگ" کے بارے میں جس کی اس نے ہمیں اتنے شاندار انداز میں دعوت دی تھی اس کے ہر تازہ بیان میں جو غلطیاں پوشیدہ ہوتی ہیں ان کی بنیاد اس دعوت جنگ ہی میں موجود تھی جو اس نے ہمیں دی تھی۔ یہ کوئی "تصور" نہیں ہے جس کے خلاف ہمیں جنگ کرنا ہے بلکہ ایک سازش ہے۔ وہ سازش یہ ہے کہ سیاسی اقتدار حاصل کر کے اس مخصوص تصور کو دنیا پر اس کی مرضی کے خلاف مسلط کر دیا جائے۔ یہ مسئلہ درحقیقت پیچیدہ اور دقیق ہے کہ ایک نسبتاً آزاد معاشرہ کس طرح اپنی آزادی

تباہ کئے بغیر ایسی سازش کو شکست دے سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر بلا شبہ کئی رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن ایسی کوئی رائے قابل احترام نہ ہوگی جو اس حقیقت کو تسلیم نہ کرے کہ یہ ایک سازش ہے۔ رسل نے اس حقیقت کو نہ صرف اپنے ابتدائی نعرۂ جنگ میں پس پشت ڈالا بلکہ وہ اب بھی اسے نظر انداز کر رہا ہے جبکہ تمام سمجھدار دُنیا اس سے آگاہ ہو چکی ہے۔ وہ اپنے وقار کو نقصان پہونچائے بغیر تخریبی کارروائیوں کی کانگریسی تحقیقات کے خلاف استدلال کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ "فرضی تخریبی کارروائیوں" کا فقرہ استعمال کرتا ہے (واوین میری ہیں) تو یہ نظر آتا ہے کہ اس میں کافی ایمان داری یا ذہنی بلندی نہیں ہے جو اسے اس موضوع کا اچھی طرح مطالعہ کرنے پر آمادہ کرے جس کے لیے وہ ہمیں ترغیب دلانا چاہتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی اشتمالیت کے پروگرام سے متعلق کتابوں کا جائزہ نہیں لیا ہے اور نہ اس موضوع پر ایسی تنقیدی تصانیف پر ایک نظر ڈالی ہے۔ جیسی سڈنی ہک ( Sydney Hook. کا مضمون" ہیریسی یس کانسپیریسی نو -Heresy Yes) (Conspiracy no وہ گویا اس مسئلہ کے ان اجزا کو قصداً" نظر انداز کر رہا ہے جو اس کے حل کو مشکل بناتے ہیں۔ غور کرنے کا یہ ایسا طریقہ نہیں ہے جو کوئی شخص اس وقت استعمال کرتا ہے جب اسے ریاضی کے منطقی اصولوں میں غواصی کرنی ہوتی ہے یا جب انسانی علم کی

وسعت اور اس کے حدود اس طرح متعین کرنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اس کی خاطر اپنے فائدے کے لیے ہمیں یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ درحقیقت برٹرانڈ رسل دو ہیں، ایک پابندِ نظم و ضبط اور با اصول، اور دوسرا محض الفاظ اور کسی حد تک غیر ذمہ دار!

# چارلی چیپلن چند یادیں چند تاثرات

جب میں پیرس سے فلورینس موٹر میں جا رہا تھا جسے کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تو میں جنیوا جھیل پر بمقام ویوی ٹھہر گیا اور وہاں سے پہاڑی راستہ سے اس مکان پر پہونچا جہاں پر چارلی چیپلن رہتا تھا اور اپنی نئی زندگی ہرے بھرے ڈھلوان میدانوں اور لمبے چوڑے درختوں کے درمیان مع چھ عدد (اگر آپ یقین کریں پورے چھ) خوبصورت بچوں کے گزار رہا تھا۔ اس کے متعلق جس قسم کی زندگی اس سے قبل گزارنے کا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی موجودہ نئی زندگی کا ظہور پذیر ہونا نہایت حیرت انگیز ہے اور خصوصاً میرے لئے کہ میں اس کی گزشتہ زندگی میں اس کا گہرا دوست رہا ہوں۔ یہ واقعہ اتنا عجیب تھا کہ اس کی نئی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوا۔ موٹر میں ہمارے ساتھ پیرس کی ایک بہت خوبصورت لڑکی موریل بھی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کی موجودگی ہماری اس بلا اطلاع آمد سے چارلی کی خلوت پسندانہ زندگی میں ہونے والی مداخلت کی بدمزگی کو ضرور کم کر دے گی۔ میں نے اس کے ملازم کے ذریعہ اطلاع کرائی کہ امریکہ سے ایک پرانے دوست آئے ہیں لیکن بہت دیر

تک کسی نے شکل نہ دکھائی۔ آخر کار جب ہم کھڑے ہوئے انتظار کر رہے تھے موریل نے ایک بھورے بالوں والے سر کو زینہ کے کھلے حصّہ سے یہ معلوم کرنے کے لئے جھانکتے دیکھا کہ ہم کون لوگ تھے۔ آیا یہ اس کی خوبصورتی کا اثر تھا یا مجھے پہچان لینے کا جو چارلی کو نیچے لے آیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال چند سیکنڈ کے بعد چارلی نہایت شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ پر آیا اور ہمیں بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ ایلینا اور موریل کے رائے میں وہ اس وقت بھی کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں اپنے تمام علاقہ میں گھمایا اور تمام درختوں، پھولوں، پتھر کی دیواروں، ٹینس کورٹ، موٹر گیرج، ترکاری کے باغ وغیرہ کی طرف ہمیں متوجہ کرتا گیا اور تمام وقت بڑی تیزی سے باتیں کرتا رہا۔ ان کی رائے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس لمحہ کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں اسے یہ بتا سکوں کہ میں کیوں آیا تھا۔ میں نے بھی یہ دیکھا کہ اس کی گفتگو کا سیلاب مسلسل چلا آرہا تھا اور اس میں کسی سوال کی گنجائش نہ تھی لیکن اس وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ شاید اس کے ذہن پر ہمارے سیاسی اختلافات چھائے ہوئے ہوں! اور وہ یہ سوچتا ہو کہ میں کسی قسم کے پروپیگنڈے کے لئے آیا ہوں۔ یہ صحیح تھا یا نہ تھا لیکن یہ تناؤ دور ہو کر گفتگو اس وقت تک عام نہ ہوئی جب تک ہم مکان واپس نہ پہونچے اور اونا (.Oona) جو ایک مہربان، پُرجوش اور سادہ مزاج عورت تھی چائے پیش کرنے کے لئے نیچے اُتر کر نہ آئی اور ایک یا دو بچے بسکٹ لینے کے لئے ہمارے پاس نہ آئے۔ اس وقت چارلی کا اندیشہ اگر کوئی تھا بھی تو دور ہو چکا تھا اور وہ یہ محسوس

کرنے لگا تھا کہ میں صرف پُرانی دوستی کی خاطر وہاں پہونچا تھا اور اس کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔

جب میں اس سے ۱۹۱۹ء میں ملا تھا تو وہ دُنیا کا سب سے زیادہ مشہور آدمی تھا۔ وڈرو ولسن نے بھی حال میں یورپ کے دارالحکومتوں کا فاتحانہ شان سے دورہ کیا تھا لیکن چارلی چیپلن کو دیکھنے کے لیئے زیادہ خلقت جمع ہو جاتی تھی۔

"عظیم شہرت کی تاریخ" میں (جب کبھی ایسی کوئی کتاب لکھی جائے گی) اس باب سے زیادہ کوئی دیگر باب حیرت انگیز نہ ہوگا جس میں اس چھوٹے سادہ مزاج اور صرف ایک کردار کے اداکار کی یہ سرگزشت درج ہوگی کہ وہ تین سال کے مختصر عرصہ میں اتنے زیادہ لوگوں، اتنی زیادہ قوموں اور انسانی طبقات میں مشہور ہو گیا اور ان کا محبوب بن گیا اور اس کی سی شہرت اور ہردلعزیزی کسی دیگر شخص کو بشمول عظیم مذہبی پیشواؤں کے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش کا وقت اور اس کے نبوغ کی قطع وضع ایک جدید قسم کی تفریح کے عین مطابق واقع ہوئی تھی۔

اس کی سرگزشت ان لوگوں کے لئے جو دقیق اور پختہ فنکاری کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے عام ہردلعزیزی حاصل ہونا ممکن ہے۔ ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہے، کیونکہ چیپلن کی اداکاری اس کے ثمر کائے کار کی اداکاری سے کم از کم میرے نزدیک جن چیزیں میں خاص امتیاز رکھتی تھی وہ تمام اقدار میں دقیق ترین اور پختہ ترین قدر تھی یعنی محفوظ

قوت۔ اسے یہ طریقہ پسند ہے کہ وہ کسی چیز کو بالکل مکمل طور پر ادا نہ کرے اور اس طرح اپنے سامعین کو زیادہ شدید طور پر یہ احساس دلائے کہ اگر اس نے وہ چیز مکمل کر دی ہوتی تو کیا خوبی پیدا ہو جاتی۔

ہماری دوستی اس باہمی ہم مذاقی کی بنیاد پر شروع ہوئی۔ میں اس وقت کسی قدر بدنام تھا کیونکہ میں تقریباً تنہا ایسا اشترا کی شورش پسند تھا جس نے جنگ عظیم کی مخالفت اور روسی انقلاب کی موافقت کی تھی اور پھر بھی قیدخانہ کے باہر رہ سکا تھا۔ جنگ کے عارضی طور پر بند ہونے کے بعد میں نے جلد ہی ویسٹ کوسٹ کا سفر اختیار کیا جبکہ مشہور پالمر (Palmer.) حملے' اب تک نام نہاد غداری کو دبانے کے لئے جاری تھے۔ یہ سفر بہ نسبت ایک ایسے دورے کے جو لیکچر دینے کے لئے کیا جائے۔ ایسے حملے سے زیادہ مشابہ تھا جو کسی محاصرہ کیے ہوئے شہر سے نکل کر کیا گیا ہو۔ میرے جلسوں نے اصلاح پسندوں کو دو طویل برسوں کے اندر اپنی آواز بلند کرنے کا یہ پہلا موقع دیا تھا اور وہ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ پولیس بھی آئی۔ جہاں لاس انجلیز میں میں تقریر کر رہا تھا وہاں موسیقی کے سماعت خانہ کے اندر کی طرف بڑے نیلے عمدہ پروں والے شکاری پرندوں کی طرح چالیس پولیس کے آدمی قطار بنا کر کھڑے ہوئے تھے۔ میرے دوست باب واگنر (Bob Wagner. ج) بعد کو آئے جب کہ میں لوگوں سے ہاتھ ملا رہا تھا اور انھوں نے چپکے سے کہا۔ چارلی چیپلن بغلی کمروں میں ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔" اگر باب واگنر نے "جولیس سیزر" کا نام لیا ہوتا تو بھی مجھے

اس سے زیادہ استعجاب یا خوشی نہ ہوتی میری مسرّت اس وقت اور زیادہ ہو گئی جب ہاتھ ملاتے ہوئے پہلے الفاظ جو چارلی نے کہے وہ میری تقریر کی حقیقت پسندانہ تعریف میں تھے۔ اس کا خیال تھا کہ میری تقریر میں فصاحت تھی۔

اس نے کہا "تمھارے اندر وہ چیز ہے جسے میں تمام فنکاری کا عطر سمجھتا ہوں بلکہ اپنی فن کاری کا بھی (اگر میں اپنے آپ کو ایک فنکار کہہ سکتا ہوں) یعنی اعتدال و متانت" میں نے کہا۔ "آپ نے ان پولس کے آدمیوں کو بھی دیکھا؟"

لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ اس کا مفہوم یہ نہ تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ میں ہالی وُڈ سے نکلے ہوئے اس جملہ پر کہ "اگر میں اپنے آپ کو ایک فن کار کہہ سکتا ہوں،، اتنا حیرت زدہ ہوا کہ وہ جملہ حرف بحرف میرے حافظہ میں محفوظ ہو کر رہ گیا ہے۔"

اس رات ہم نے ساتھ کھانا کھایا اور دوسرے دن میں لا بریا ایوینیو (La Brea Avenue) میں جو اس کے اسٹوڈیو کے سامنے سڑک پر تھا بنے ہوئے انگریزی دیہاتی مکانوں کی چھوٹی سی قطار پر گیا۔ ہالی وڈ میں یہ تنہا ایسا اسٹوڈیو تھا جو کوئی گودام نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سنگ مرمر کے چھوٹے تالاب میں ہم ساتھ ساتھ تیرے اور تمام سہ پہر باتیں کرتے رہے اور اس وقت ہماری تصویر بھی لی گئی جب ہم کچے لیمو ایک درخت سے توڑ کر سیب کی طرح کھا رہے تھے۔ میں نے اصل چیپلن کو اتنا ہی دل فریب پایا

جتنا اسے فلم کے پردے پر پاتا تھا، تقریباً ہر شخص اس پر اسی طرح فریفتہ ہو جاتا تھا۔

مزاح ایک زندہ دلانہ چیز ہے۔ اگر آپ سنجیدہ ہو جائیں تو مزاح باقی نہیں رہتا۔ اس لئے یہ قدرتی بات ہے کہ دُنیا کا محبوب ترین مزاح کار دُنیا کا سب سے زیادہ دل فریب کھیل کا ساتھی بھی ثابت ہو۔ کسی جنس کا خواہ کتنا ہی سخت مزاج اور کتنا ہی بے حس انسان چارلی سے ملنے جائے لیکن اگر چارلی اسے اپنی دلفریبیوں سے مسحور کرنا چاہے گا تو ایسا کرنے میں اس کی کامیابی اتنی یقینی ہوگی کہ میرے علم میں دوسرا شخص ایسا نہیں ہے جو اس صفت میں اس کا مدمقابل ٹھہرایا جا سکے۔ اس روز کوئی ایسی چیز جو اس کی سحر آفرینی سے بھی زیادہ گہری تھی مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ غالباً اس کی حیرت انگیز شہرت کو اس میں دخل تھا۔ ہر وہ شخص جو جبلی طور پر مشاہیر پرست ہوتا ہے اس میں اس قسم کی کمزوری ہوتی ہے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ چارلی چیپلن میری رائے میں اور میرے فوری احساسات کے مطابق ایک عظیم شخصیت کا مالک تھا، اور اس خیال کے تحت میں نے اس کی شخصیت کا مطالعہ کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے جو اسے سمجھا ہے اس کے اظہار سے آج دُنیا میں اس کے مقام کے متعلق جو شتباہات ہیں ان پر روشنی پڑ سکے۔

اکثر تفریح مہیا کرنے والے اشخاص کے اندر اپنی اس صفت کا متکبرانہ احساس ہوتا ہے۔ لیکن چارلی میں گہرا انکسار موجود ہے۔ بلاشبہ تمام اداکاروں

کی طرح (اور اداکار اس صفت میں بالکل انسانوں کے مانند ہیں) وہ یہ پسند کرے گا کہ اسٹیج پر ایک کونہ میں رہنے کے بجائے وہ اس کے مرکز میں نمایاں طور پر رہے۔ لیکن اس میں دوسروں کی قدر کرنے کا ملکہ موجود ہے اور اس سے زیادہ کمیاب ملکہ اس میں یہ موجود ہے کہ وہ دوسروں کی بات زیادہ عرصہ تک شوق اور دلچسپی سے سُن سکتا ہے۔ وہ نہایت حساس اور حُسن شناس ہے اور جھوٹی اور سستی چیزوں سے فوری طور پر بدمزگی محسوس کرتا ہے اور ان سے اپنی توجہ ہٹانے یا کنارہ کشی کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا۔ اس عادت نے اس کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے تھے خصوصاً ہالی وڈ میں جہاں جھوٹی اور سستی چیزوں کی افراط ہے، لیکن ان لوگوں کے درمیان جنہیں وہ پسند کرتا ہے وہ اپنے دل کی گہرائی میں انکسار کا جذبہ رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے غریب لڑکے کی طرح ہو جاتا ہے جسے مواقع میسر نہ ہوں اور وہ سیکھنے کا شائق ہو۔ ایک مرتبہ بہت عرصہ گزرا لیکن اس وقت جبکہ اس کی حیرت انگیز شہرت عروج پر تھی اس نے مجھے ایچ۔ جی۔ ویلس کا ایک خط جس میں اس کے ہنر کی داد دی گئی تھی ایسے شوق سے دکھایا گویا وہ ایک انعام جیتنے والا بچہ تھا۔

اس نے کہا "وہ ایک بڑا انشاپرداز ہے کیا نہیں ہے؟ کیا وہ کافی اچھی شہرت نہیں رکھتا؟" اور اس کے بعد اس نے اس قیمتی خط کو اس نے اسے سینے کی جیب میں رکھ لیا۔

اس کی اس صفت کے بعد کہ وہ دوسروں سے کچھ حاصل کرنے اور

ان کو کچھ دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ جس کے بغیر ہر خوبی بے قیمت اور بے کار ہے۔ میں نے اس کی کشش کے خاص عناصر یہ دیکھے۔ پُراضطراب ذہن اور تصوّر، مزاح، حسین شکل و صورت، خوش ادائی۔ پھرتی اور یہ صفت کہ وہ اپنی ہر بات کو اپنی فطری حرکات کے ذریعے اور اگر ضرورت ہو تو رقص کے ذریعہ ایک زندگی بخش دیتا تھا میں اس کے "ذہن" کا نام ان لوگوں کی مخالفت میں لیتا ہوں جو خود اصل چیز سے محروم ہونے کے باعث یہ خیال کرتے ہیں کہ چارلی کے غور و فکر میں مسلسل حقیقی اور نتیجہ خیز دلچسپی محض ایک بناوٹی انداز ہے۔ وہ لوگ جو تصورات کی دنیا سے فطرتاً لگاؤ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اشیا کی دنیا سے بھی باخبر ہوتے ہیں ان کے متعلق ہمیشہ ایسی ہی غلط رائیں قایم کرلی جاتی ہیں۔ چارلی اپنے چاروں طرف کی تمام باتوں سے باخبر ہے۔ اسے کبھی اسکول کے نظم و ضبط سے ایسا واسطہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ وہ ایک بڑی کتاب مثلاً اسپنگر کی تصنیف "زوال مغرب" کو جستہ جستہ ایسے طریقہ سے پڑھتا ہے جسے دراصل عالمانہ طریقہ سے کوئی مناسبت نہیں، لیکن وہ اس کے خلاف کوئی دعویٰ کر کے دھوکا نہیں دیتا، کم از کم میرے ساتھ وہ ایسا نہیں کرتا، اور جو کچھ وہ اس کتاب سے لے کر بیان کرتا ہے اس کی حیثیت اس عجیب گھونگے کی سی ہوتی ہے جو سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے اُٹھا لیا گیا ہو۔ اور جو سمندر کے لب لباب کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن یہ گھونگا جو اس طرح اُٹھایا ہوا ہوتا ہے ہمیشہ عجیب ہمیشہ حسب موقع اور ہمیشہ اس میں کوئی مخصوص قسم کا خم یا رنگ ہوتا ہے۔ اس لیے بیں کتابوں

کہ اس میں ذہن بھی ہے اور قوتِ تخئیل بھی۔

اس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا پڑھنے کے معاملہ میں میں اپیکورس کا پیرو ہوں۔ غور و فکر کے لئے تھوڑی سی غذا کافی ہے!"

ایک دوسرے وقت اس نے کہا "میں نے بہت سی کتابیں خریدی ہیں اور اب انھیں پڑھنا ہے! لیکن مجھے انتخاب سے بہت کام لینا پڑے گا کیونکہ میں بہت سُست رفتار پڑھنے والا ہوں۔ میرے لئے ایک کتاب پر پوری توجہ مرتکز کر دینا بہت مشکل ہے۔ اسی سبب سے میں جدید ادب بہت کم پڑھتا ہوں۔ صرف چند روز ہوئے مجھے جوائس (.Joyce.) کی مختصر کہانیوں کا پتہ چلا۔ ان میں سے بعض کو میں نے تین یا چار مرتبہ پڑھا ہے۔ کلے (.Clay) نام کی ایک کہانی میں دس صفحے کے اندر انسانی کردار کے بارے میں اتنا کچھ سمو دیا گیا ہے جو ڈکنس (.Dickens.) کی دس کتابوں کے مواد سے بھی زیادہ ہے۔

چارلی کی آنکھیں نہایت گہرے نیلے رنگ کی ہیں۔ یہ ایسا رنگ ہے جو کیمرہ کے لئے بہترین سمجھا جاتا ہے۔ آنکھوں سے ایمانداری اور عزم کی پختگی جھلکتی ہے۔ وہ ایک شاندار پیشانی میں گہری جمی ہوئی ہیں اور جب وہ لوگوں سے جھوٹ بولتا ہے کیونکہ وہ انھیں یا ان کے سوالوں کو پسند نہیں کرتا اس وقت وہ آنکھیں اس کی بات کا لوگوں کو یقین دلا دیتی ہیں۔ ان کی وجہ سے دُنیا بھر میں اس کے متعلق متضاد قصے پھیل گئے ہیں اور سب پر لوگوں کو پورا یقین ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال

اس کو پسندیدہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے چہرے کا نچلا حصہ اتنا شاندار نہیں ہے جتنی اس کی پیشانی اور آنکھیں ہیں۔ اس کا منہ اتنا استوار نہیں ہے، لیکن اس کے بدن کی ساخت اور چال کے انداز کی اعلیٰ خوشنمائی اور حقیقی بے عیبی جو اس مرتبہ کی ہو جیسی قلابازوں، مست رقاصاؤں اور رسے پر چلنے والوں کے استاد کی ہو سکتی ہے یعنی پھرتی اور خوش ادائی کے بادشاہ جیسی اس کے سر کی اعلیٰ بے عیب ساخت سے مل کر اس کے نہایت خوبصورت ہونے کا یقینی احساس دلاتی ہے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اس کے اندر مکمل اور اعلیٰ قسم کی یکجہتی کا وجود نظر آتا ہے۔

اور یہ چیز بھی گمراہ کن ہے (یا ہماری دوستی کے زمانے میں تھی) کیونکہ اس وقت مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ اس کے کردار میں وحدت نہیں ہے نہ وہ کوئی اصول یا تیقن رکھتا ہے اور اس کے ذہن میں بھی ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے متعلق آپ معقول طور پر یہ امید کر سکیں کہ اگلی صبح تک جب وہ سو کر اٹھے گا تو اس کے دماغ میں موجود ہوگی وہ ایک اداکار تھا اتنا مکمل اور پکا اداکار کہ اگر آپ اس کی سحر کاری سے متاثر ہو کر اس کی کسی بات پر کوئی امید قایم کر لیں گے تو آپ زود یا بدیر یقیناً اس امید کو پادر ہوا پائینگے ہزاروں آدمیوں نے یہی بات کہی ہے تقریباً ہر آدمی نے جس کے ساتھ چارلی نے ایک شام پر لطف گفتگو میں گزاری ہو۔ اوہ! میں چارلی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہم گہرے دوست ہیں۔ وہ تو کل میرے مکان پر کھانا

کھائے گا۔ آپ بھی کیوں نہ آ جائیں اور اس سے ملاقات کرلیں؟" اور یہ بات وہ عموماً اپنے تمام بہترین اور اہم دوستوں سے اور رشتہ داروں سے کہتے ہیں۔ دوست اور رشتہ دار آتے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی لاتے ہیں۔ کھانے کا انتظام ایک بڑی دعوت کے طور پر کیا جاتا ہے، کاک ٹیل کے جام گردش میں آتے ہیں، گفتگو غیر معمولی طور پر زوردار ہو جاتی ہے، دروازہ کی گھنٹی کا بڑے اشتیاق سے انتظار کیا جاتا ہے، تعجب، بے صبری، سراسیمگی، کوفت، مایوسی، لیکن اس دن سے آج تک چارلی کی وہ بات دوبارہ نہیں سُننے میں آتی۔

کوئی شخص جو یہ نہیں جانتا کہ چارلی ایک گہرا اور پکا اداکار ہے وہ دراصل چارلی سے اچھی طرح واقف نہیں ہے چند ابتدائی رجحانات جیسے گھٹیا یا بناوٹی کپڑے سے نفرت، انقلابیوں سے ذہنی ہمدردی سکے جمع کرنے کا شوق اور اپنے آرام و آسائش کے لئے یقینی اور علانیہ پسندیدگی، ان کو چھوڑ کر اس کی صفات پر بالکل یقین نہ کرنا ہی بے خطر راستہ ہے اسکی رائیں اور عقائد اور بھی کم قابل اعتماد ہیں۔ لاس اینگلیز (Los Angeles) میں میری انتہائی ترقی پسندانہ تقریر کی اتنی زیادہ تعریف کرنے کے ایک دن بعد ہی اس نے غلامی پر اپنے پرجوش عقیدہ کا اظہار کیا اور اسے ایک غیر فانی ادارہ بتاتے ہوئے اس کی حمایت میں دلائل پیش کیے اور تمثیل سے سمجھانے کے لئے ایک مزاحیہ نقل بھی پیش کر دی جس سے اس کے سامعین اگر اس کی بات کے قائل نہ ہوئے تو حیرت زدہ ضرور ہو گئے

اسی زمانہ کے لگ بھگ اس نے (۲۱-۱۹۲۰) یہ بات کہی "جو کوئی مکمل طور پر آزاد اور گہری ذہانت کا مالک ہوگا آج وہ بالشویک ہوگا' مثال کے طور پر ایچ۔ ایل مینکن اگر وہ در اصل اس طرف آئے اور زندگی کے مسائل پر غور کرے، لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ ادھر نہیں آئے گا کیونکہ ایک بازیگر کی حیثیت سے وہ زیادہ پرلطف تفریح مہیا کرتا ہے"

میرے یقین کی حد تک اس نے اپنے دل میں کوئی بات پوشیدہ رکھے بغیر یہ دونوں رائیں ظاہر کیں یا ان دونوں کو سوانگ کے ذریعے سمجھایا اور اس نے کئی ایسی ہی متضاد اور مبہم باتوں کو سجھانے کے لیے سوانگ بھرا ہوگا۔ اس کا نبوغ اصلاً ڈرامائی ہے اور انجام کار آپ کو حسن کردار کی جگہ اس کے یہاں دقیق فراست ہی ملے گی جو آپ کے لئے اطمینان کا باعث ہوگی۔ میں نے اسی سے اطمینان حاصل کیا اور میرے خیال میں ہمارے اتنے برسوں تک باہم دوست بنے رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس کے دماغ کی ان قطعی منتشر اُڑانوں کو غور سے دیکھ کر میں نے بہت جلد یہ سمجھ لیا تھا کہ اس پر یہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی ایک بات کو ماننے والا بن جائے گا یا کسی ایک بات پر کچھ عرصہ قایم رہے گا اور میں نے اس سے ایسی توقع کبھی نہیں کی۔ اگر وہ میرے ساتھ غیر ذمہ دارانہ برتاؤ کرتا تھا تو اس کوفت کو دل میں رکھنے کے بجائے میں اس کا علاج اس سے ایسا ہی برتاؤ کرکے کر لیتا تھا۔ اگرچہ میں معاشرتی برتاؤ کے معاملہ میں سخت محتاط ہوں لیکن اُس وقت میں اخلاقی آزادی سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔

ایک دوسری صفت جس کو میں نے بہت جلد سمجھ لیا وہ چارلی کا روپیہ جمع کرنے کا جنون تھا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں اپنے میگزین کے لئے اپنے مغرب کے سفر میں روپیہ جمع کر رہا تھا جب اُس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت چارلی نے بڑی فراخ دلی سے میری تقریر کی تعریف کی تو مجھے اُمید ہوئی کہ غالباً ایسی ہی فراخ دلی سے وہ میری چندہ کی اپیل کا خیر مقدم کرے گا جو میرے ہم سفر اسک میک برائیڈ (Isaac McBride) کے ذریعہ سے کی گئی تھی۔ اس نے کہا کہ میں مدد دینا چاہتا ہوں اور کسی قدر جذبہ کے ساتھ یہ بات کہی اور پھر ہمیں صرف پچیس ڈالر دیئے۔ اگر اس نے کہا ہوتا کہ وہ مدد کرنا نہیں چاہتا تھا اور بعد ازاں ہمیں پچیس ڈالر دیتا تو میں کچھ دوسرا نتیجہ نکالتا۔ بصورت موجودہ میں نے قطعی یہ نتیجہ نکالا کہ مجھے کبھی آئندہ چارلی کو اس کام میں شرکت کی دعوت نہیں دینی چاہیئے۔ جیسا کہ میں اپنے بہت سے امیر دوستوں کو معاشرتی اصلاح کی مختلف تجویزوں کے متعلق دیا کرتا تھا۔ چارلی کو انتہائی اصلاح پسندانہ خیالات پسند تھے۔ وہ دُنیا کی کایا پلٹ کرنے کے بارے میں گفتگو کرنا پسند کرتا تھا لیکن اس گفتگو کیلئے وہ کچھ صرف کرنا نہیں چاہتا تھا اور کایا پلٹ کرنے کے کام کے لئے صرف کرنا اس کے لئے اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔

بلاشبہ ایک پیدائشی اداکار کی خصوصیت یہ ہے کہ جب آپ اس کے متعلق زوردار الفاظ میں کوئی رائے زنی کریں تو آپ کو اس سے پورا پلٹا کھانا پڑے گا۔ اور تقریباً بالکل متضاد رائے کا اظہار کرنا ہوگا۔ ایک مرتبہ

کا ذکر ہے کہ چارلی اتفاقاً نیویارک میں تھا اور اسی زمانہ میں ہمارا محاسب تین ہزار ڈالر جو لبریٹر کی رقم رکھنے کی دراز میں باقی رہ گئے تھے لے کر بھاگ گیا مجھ سے ہر طرف سے بہت کچھ اظہار ہمدردی کیا گیا لیکن صرف چارلی نے وہ بات کہی جو مجھے ایسے موقع پر کسی قدر معقول معلوم ہوئی۔ اس نے کہا "میں پوری رقم تو آپ کے لئے مہیّا نہیں کر سکتا لیکن ایک ہزار ڈالر دے سکتا ہوں،، آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کنجوس نہیں ہے۔ وہ اس سے زیادہ باریک بیں ہے۔ وہ سرمایہ کے لئے فکر مند رہتا ہے۔ وہ مجھے تین ہزار یا دس لاکھ بھی دے سکتا تھا، لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ افلاس کے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ اس نے افلاس کی خوفناک مصیبت میں پرورش پائی ہے۔ جب وہ نو سال کا تھا تو اس کی ماں اسے ایک یتیم خانہ میں لے گئی تھی اور اسے وہاں دو برس رکھا تھا کیونکہ وہ اس کے کھانے پینے کا انتظام نہ کر سکتی تھی۔ بچپن میں اس قسم کے تجربات اعصاب پر ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو جذبات کے بہاؤ کے لئے نالیوں کا کام دیتے ہیں۔ عقل کچھ بھی کہے جذبات انہی نالیوں میں بہتے ہیں۔ چارلی ہمہ وقت اس خوف میں رہتا ہے کہ مبادا اسے پھر اسی یتیم خانہ میں لے جایا جائے۔ بمٹ ایونیو میں اس کے مکان پر میں نے ایک مرتبہ ایک مہینہ عیش و آرام میں گزرا۔ ہر صبح کافی پیالوں کے بجائے دو دستہ والے چوڑے شوربہ کے بادیوں میں آتی تھی جن کا ایک دستہ ٹوٹا ہوا ہوتا تھا۔ یہ ایک معقول تخیل تھا۔ وہ ٹھیک پیالوں کی طرح معلوم ہوتے تھے، تاہم یہ

صورت حال. بیورلی ہلس ( Beverly Hills. ) کی فلمی دُنیا کے لکھ پتیوں کی زندگی کی عام فضا کے مطابق ہر گز نہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہی چھوٹا بھٹکا ہوا چیپلن تھا جو لندن کے ایسٹ اینڈ (غریبوں کی بستی) میں رہنے والا ایک لڑکا تھا اور یہ تقریباً اسی لڑکے کی طرح تھا جسے تم نے فلم کے پردہ پر یہ کردار ادا کرتے دیکھا ہوگا کہ وہ روپیہ خرچ کرنے میں نہایت محتاط تھا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے زمانہ میں ہماری دوستی عروج پر تھی۔ جب کہ میں ہالی وڈ اس غرض سے گیا تھا کہ اخبار "لبریٹر" سے کچھ عرصہ کے لئے دور ہو جاؤں (نیز ایک خوبصورت ادا کارہ کے جس سے میں محبت کرتا تھا قریب ہونا چاہتا تھا) اس وقت میں "احساس ظرافت" پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ چارلی بھی میری محبوب ادا کارہ کا پرستار تھا۔ اب ہماری دوستی کے تین زاویے تھے اور اس میں اب بھی بہت سے غیر معمولی جذبات بروئے کار آرہے تھے۔ جب میں ان ایام سرما کا تصوّر کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ چارلی اور میں تقریباً ہر شام کو باہم ملاقات کرتے تھے اور چیستاں ( Charades. ) تقریر اور ڈراما کا کھیل کھیلتے تھے آخر میں ہمیں چیستاں کا کھیل بالکل ترک کرنا پڑا کیونکہ ہم نے یہ دیکھا کہ ہماری پوری قوت اسے رات رات بھر کھیلنے میں ضائع ہو جاتی تھی اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی دن میں ذرّہ برابر کام نہ کر سکتا تھا۔

مجھے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے چیستاں کے کھیل معمولی فی البدیہ قیاسات کے کھیل نہ تھے بلکہ وہ بڑی محنت سے مکمل کئے ہوئے ڈراموں یا دلکش مناظر کے خاکوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کی تیاری میں تمام انسانی تجربات اور

چارلی کے مکان کی کل اشیا، کام میں لائی جاتی تھیں۔ اس کے کھانے کے کمرے سے ایک وسیع محرابی دروازہ کے ذریعہ لائبریری میں جا سکتے تھے اور اس میں دو مقابل گوشوں پر دو دروازے تھے جن میں سے ایک باورچی خانے کو جانے کا تھا اور دوسرا زینہ پر چڑھنے کا۔ محرابی دروازہ پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا جسے نیچے اور اوپر اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس پردہ کے ذریعہ مکان کا وہ تمام حصّہ جو آباد تھا ایک تھیٹر میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ ان پچھلے زینوں پر آپ مہمانوں کے آرام یا اطمینان میں مخل ہوئے بغیر چپکے سے چڑھ سکتے تھے اور ان کے کپڑوں کی میزوں اور الماریوں کا جائزہ لے سکتے تھے (اگر ان میں سے کسی نے وہاں پر رات بسر کرنے کی جرأت کی ہوتی) چارلی اور میں اپنی اپنی جماعت منتخب کرتے تھے اور یہ انتخاب ہم ایک دن پہلے کر لیتے تھے اور جن لوگوں کو ہم اپنی ٹیم میں شامل کرنا چاہتے تھے انھیں کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ ہم اس کھیل میں اتنے ماہر ہو گئے تھے کہ ہمارے خیال میں چیستاں کے کھیل میں کوئی خوبی نہ تھی اگر اس کا سلسلہ باقی نہ رہے، یعنی لفظ کا پہلا جز ایک ڈراما کا پہلا ایکٹ ہونا چاہیئے اور دوسرا جز دوسرا ایکٹ اور اسی طرح آگے۔

لوگوں کے مزاج میں ایسی کیفیت پیدا کرنا جس کے اثر سے وہ بیک وقت محنت کرنے اور ستانے کے لیئے تیار ہو جائیں آسان کام نہیں ہے اور اسی دشواری پر قابو پانے کے لیئے تقریر کا کھیل نکالا گیا۔ یہ کھیل میں نے نکالا تھا۔ اس طرح گویا میں اپنی طویل برسوں کی اس تکلیف کا بدلہ لے رہا تھا جو ایسے سامعین کے روبرو بولنے سے اُٹھائی تھی جب مجھے کوئی امداد نہ دیتے تھے۔

ہم یہ کھیل اس طرح کھیلتے تھے۔ کمرہ کا ایک گوشہ لوگوں سے خالی کرالیا جاتا تھا اور اس گوشے کو پلیٹ فارم مان لیا جاتا تھا۔ ہر شخص ایک کاغذ کے پُرزہ پر تقریر کے لیئے ایک مضمون کا عنوان لکھتا تھا، اس پُرزہ کو اچھی طرح تہہ کر دیتا تھا اور اسے ایک ہیٹ میں ڈال دیتا تھا۔ ہم ہمیشہ لوگوں کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ کسی سنجیدہ مضمون کا عنوان لکھیں۔ مزاحیہ کا نہ لکھیں (مزاح کی باری پھر آئے گی) ہم کمرہ میں موجود ہر شخص کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ ایمانداری سے کھیل میں شرکت کرے صورت یہ تھی کہ اگر ایک شخص بھی شرکت سے گریز کرتا تو سب گریز کرنے لگتے تھے۔ تب میزبان یا سرغنہ (جو کوئی بھی کھیل کو ترتیب دے رہا ہو) اپنی گھڑی نکالتا تھا اور ہیٹ کو اس شخص کے سامنے لے جاتا تھا جو پلیٹ فارم کے بائیں جانب پہلے نمبر پر کھڑا ہو۔ اس شخص (مرد یا عورت) کو ہیٹ میں سے ایک تہہ کیا ہوا پُرزہ نکالنا ہوتا تھا اور اسے لے کر پلیٹ فارم پر جانا، سامعین کے سامنے کھڑا ہونا، پُرزہ کو کھولنا اور اس میں لکھے عنوان کو بلند آواز سے پڑھنا اور اس عنوان پر ایک منٹ تک تقریر کرنا لازمی تھا۔ اگر وہ کوئی بات نہ کہہ سکتا تھا تو بھی ایک منٹ تک اسے سامعین کے سامنے کھڑا رہنا پڑتا تھا۔

اس طریقہ سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ایک منٹ کتنا طویل ہوتا ہے اور یہ لوگوں کو چیستاں کھیلنے کے لئے ترغیب دینے کا بھی بہت کامیاب ذریعہ تھا جب لوگ ایک سنسان منٹ تک سامعین کے سامنے کھڑے ہونے کی تکلیف اُٹھا چکتے ہیں تو وہ ہر بات کے لئے جو دوستوں کی صحبت میں انھیں پیش آتی ہے

تیار ہو جاتے ہیں۔

چارلی نے میرے تقریر کے کھیل میں یہ اضافہ کیا کہ ایک ہیٹ کے بجائے دو ہیٹ استعمال کئے جائیں۔ ایک میں مضمون کا عنوان ڈالا جائے اور دوسرے میں کسی کردار کا بیان، اور ہمیں عنوان پر تقریر کرنی ہوتی تھی اور دیا ہوا کردار ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے جلد ہی پوشاکوں کی ضرورت پڑ گئی اور چیستاں کے کھیل کی طرح یہ بھی ایک محنت طلب کھیل ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ چارلی نے ایک بے دانت بوڑھے جنگ آزمودہ سپاہی کے روپ میں ضبط تولید کے فوائد" پر تقریر کی تھی۔ میں اپنے تصور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ چارلی، گیری نیشن ( ) کے لباس میں مکمل طور پر ملبوس ہو کر اس کا روپ دھارے ہوئے ہے اور ایک چھوٹی گھڑی ہاتھ میں لئے "نوع انسانی کی ابتدا پر بعض شکوک" کے عنوان پر ایک لکچر دے رہا ہے۔ ڈیوڈ اور گولیاتھ پر ایک وعظ بھی پہلی مرتبہ چارلی نے ہمارے انہی کھیلوں میں سے ایک میں دیا تھا یہی وعظ "زائر" ( ) میں ایک نشاط انگیز انجام کا کام دیتا ہے جس وقت میں نے اسے دیکھا تو مجھے وہ شام یاد آ گئی جب میں نے پہلی مرتبہ اسے تقریر کے کھیل سے متعارف کرایا تھا اور وہ ایک منٹ تک گھبرایا ہوا اسکول کی لڑکی کی طرح پریشان اور دبی ہوئی ہنسی ہنستا ہوا زبان سے کچھ کہے بغیر دلیرانہ طور پر کھڑا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ جونہی اسے ایک کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا وہ اس کھیل کا شیدائی ہو گیا۔

چارلی نے اس کھیل کو ایجاد کیا جس کا نام ہم نے ڈراما کھیل رکھا ہے۔ یہ

چیستاں کے کھیلوں کی جگہ لینے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا جب وہ اتنے محنت طلب ہو گئے تھے کہ ان کی وجہ سے نہ چارلی کو اپنی تصویر "دی کڈ" پر نہ مجھے اپنی کتاب پر توجہ دینے کا ذرا بھی موقع ملتا تھا۔ اس جدید کھیل میں ہم ہیٹ میں ایسے عنوانات ڈالتے تھے جو ایک ایکٹ کے ڈراموں کے لیئے موزوں ہوں۔ ہم اپنے ساتھیوں کو جوڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ہر جوڑے کو ایک عنوان تیار کرنا ہوتا تھا۔ باہم مشورہ کرنے اور زینہ کے اوپر پوشاکوں کو دیکھنے اور حاصل کرنے کے بعد وہ ایک ایکٹ کا ڈراما اپنے مقررّہ عنوان کے مطابق پیش کرتے تھے اور اسی دوران میں باہمی مکالمہ کرتے جاتے تھے۔ مکان کے اندر کھیلے جانے والے تمام کھیلوں میں یہ کھیل میں نے سب سے زیادہ دلچسپ پایا۔

کچھ عرصہ بعد ماسکو میں اسی قسم کے دلچسپ کھیلوں کو میں نے اسٹیج پر دیکھا انقلاب کے بعد وہاں تخلیقی مہم جوئی کا ایک رجحان پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ بعض ظرافت پسند اداکاروں نے ایک فی البدیہہ مکالمہ کرنے والا تھیٹر جسے بیمپر اینٹے کہتے تھے قایم کیا اور تقریباً دس سال تک وہ یہ تماشہ اپنے سامعین کو جو اتنی تعداد میں آتے تھے کہ ہال بھر جاتا تھا دکھاتے رہے۔

شب کی ان عدیم المثال تفریحات کے علاوہ جو میری زندگی میں میسّر آنے والی بہترین تفریحات تھیں، میں چارلی کے اسٹڈیو (نگار خانہ) میں جایا کرتا تھا اور اسے تصویریں بناتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہاں میں نے اس کتاب کے لیئے جو میں مزاح پر لکھ رہا تھا بہت کچھ مواد حاصل کیا۔ ایک سہ پہر کو وہ ڈراما "دی آئڈل کلاس" (            ) کے لیے مضحک نگاری کر رہا تھا۔

ہیرو آپ کو یاد ہوگا ایک شرابی ہے۔ اسے ایک خط اپنی بیوی کی جانب سے جو کہیں چلی گئی ہے ملتا ہے اور اس میں درج ہے کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی، جب تک کہ وہ شراب پینا نہ چھوڑے گا۔ وہ شرابی اس میز کے سامنے جس پر اسکی بیوی کی تصویر رکھی ہوئی تھی کھڑا ہے اور کچھ بوتلیں اور ایک شراب کا پیمانہ بھی وہاں رکھا ہے۔ وہ تصویر اٹھا لیتا ہے اور اسے غور سے دیکھنے لگتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہوتے ہیں اور وہ گہری سسکیاں لے رہا ہوتا ہے وہ اس تصویر کو میز پر رکھنے کے لئے گھومتا ہے اور سسکیاں اس کے بدن کو بدستور جنبش دیتی رہتی ہیں۔ اس کے کندھے متواتر تیزی سے اوپر اٹھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سامعین کو یہ برا معلوم ہونے لگتا ہے۔ کیا چارلی انجام کار "جذباتی" ہوگیا ہے؟ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ واپس آتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ارفع قسم کا استغراق جھلکنے لگتا ہے اور اس کے شانے حرکت میں ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک شراب کے پیالہ کو ہلا رہا ہوتا ہے۔

چارلی نے اس چھوٹے سے ایکٹ کو نہ مرتبہ دہرایا جب کہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی ہوا کہ اس نے ہر مرتبہ مجھ سے مشورہ لیا (اس کی دلفریبی کا یہ بھی ایک جزو ہے) اور بعد ازاں ہم ساتھ ساتھ پروجکیشن روم (کمرۂ تظلیل) میں گئے اور ان میں سے بہترین عکس کا انتخاب کیا۔ اس سے بھی اس کا اطمینان نہ ہوا۔ دوسرے دن پھر وہ تیاری کے کمرہ میں گیا اور نو مرتبہ پھر اسی طرح ایکٹ کیا۔ ہم دونوں یہ سمجھتے تھے کہ میں اس کے بارے میں کسی دن کوئی مضمون ضرور لکھوں گا۔ چنانچہ میں اکثر اس کے جملوں یا جوابوں کو جو وہ میرے راز جویانہ سوالا

کے دیتا تھا لکھ لیتا تھا۔ میں نے اس سے اس شرابی کی نقل کے بارے میں سوال کیا "تمھارے پاس یہ نقل کہاں سے آئی، کیا تم نے اسے اس وقت ہی سوچ لیا تھا جب تم منظر نامہ لکھ رہے تھے یا تماشا گاہ ہی میں یہ تمھارے ذہن میں آگئی" میں نے اس کے جواب کو اس نقل سے بھی زیادہ پسند کیا۔ اس نے کہا "میکس یہ بالکل نہیں ہے۔ تماشا گاہ ہی میں ایک شخص نے مجھے اس سے آگاہ کیا تھا۔"

چارلی اپنی والدہ کو انگلینڈ سے اسی زمانہ میں لے آیا جب میں ہالی ووڈ میں ٹھہرا ہوا تھا اور اسے ایک آرام دہ مکان رہنے کے لئے دے دیا تاکہ اس میں وہ اپنے آخری ایام بسر کرے۔ وہ کسی قدر خبط الحواس تھی اور وہ خود یہ جانتی تھی اور کچھ دنوں وہ صحیح حالت میں رہتی رہی۔ اس کی دماغی حالت کی وجہ سے اسے دیہات میں لے جانا مشکل تھا، اور اس سے کہا گیا تھا کہ جب تبدیل وطن کے افسر اس سے بات کرنے آئیں تو ان کے ساتھ احتیاط سے بات کرنی چاہیئے لیکن اس کا دماغ بے قابو ہو گیا اور جب ان میں سے ایک افسر اس کے پاس آیا تو پہلی بات جو اس نے کی یہ تھی تم جیس کرائیسٹ (حضرت عیسٰے) ہیں۔ تب اسے یہ بات یاد آگئی کہ اسے احتیاط سے بات کرنی چاہیئے، پھر اس نے معقولیت اور دلچسپ مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

جناب میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ جب میں نے آپ کی آنکھوں میں دیکھا تو باوجود آپ کی نیلی ٹوپی کے مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ کریمانہ اور مذہبی طبیعت رکھتے ہیں۔"

اس طرح اس نے اپنی بات کو بڑی خوبی سے نباہا، وہ ایک بڑی دلفریب

خاتون تھی۔ تقریباً کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ وہ ہالی وڈ میں ہے اور جس دن چارلی مجھے اس سے ملانے لے گیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ میری زندگی کا ایک شاندار دن تھا۔ اس کے رُخسار گلابی اور بال سُرخ تھے، زبان بالکل لندنی تھی اور باعتبار پیشہ میوزک ہال کی گانے والی اور رقاصہ تھی۔ اس نے فونوگراف لگایا اور ہمیں ایک چھوٹا سا خوش آیند گیت سُنایا اور رقص دکھایا۔ پیانو پر ایک کینری پرند بیٹھا تھا۔ جب وہ ناچ رہی تھی تو وہ چہچہا رہا تھا۔ وہ یکایک ٹھہر گئی۔ اور اس کے پُرمسرّت چہرے پر انتہائی سوز وگداز چھا گیا۔ اس نے کہا یا گایا (کیونکہ اس کے الفاظ راگ کے اندر تھے) "غریب پرندوہ یہاں بالکل اکیلا ہے" اس کے بعد وہ پھر خوشی کے انداز میں ناچنے لگی اور آخر میں اس نے ایک چکر کاٹا اور آخری آواز پر وہ اس کرسی پر جس سے اُٹھ کر اس نے ناچنا شروع کیا تھا صحیح طور پر اور آہستہ سے بیٹھ گئی۔

بڑے چارلس اسپینسر چیپلن بھی اربابِ نشاط میں سے تھے۔ ان کے لڑکے کے قبضہ میں ایک پوسٹر تھا جسے حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس میں انھیں ایک "عام موضوعات کا گویا" کہا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عام موضوعات کے ایک اچھے گویئے ہوں (یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی کو اس کا علم ہے) لیکن میرا خیال ہے کہ چارلی کے بنوغ کا سرچشمہ اس کی والدہ تھیں۔

ہالی وُڈ کے ان ایام کے بعد ہماری دوستی میں ایک وسیع خلا حائل ہو گیا میں روس اور فرانس کے سفر پر چلا گیا اور بہت عرصہ کے بعد وطن واپس آیا۔

اس اثنا میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چارلی دُنیا کو اپنے شادی کے مسائل سے زیادہ لطف اندوز کرتا رہا تھا اور اس نے اپنی تصویروں کی جانب کم توجہ کی تھی میں شادی کے مسائل سے نفرت کرتا رہا ہوں اور میں خوش تھا کہ لیٹا گرے ( ) کا واقعہ میری ذاتی توجہ کے بغیر اپنے ناگزیر انجام کو پہونچ گیا تھا۔ ان خوشنما شاموں کو گزرے ہوئے جب ہم باہم لطف اُٹھاتے تھے چودہ سال ہو گئے تھے کہ میں نے پھر اپنے آپ کو اس کے لا بُریا ایوینیو پر واقع اسٹوڈیو کے قریب ٹہلتے ہوئے پایا۔

ہالی وڈ میں اب بڑی تبدیلی ہو گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا چارلی کے اندر بھی اتنی ہی تبدیلی ہو گئی ہوگی؟ میری یاد میں ہالی وڈ چھوٹا سا سنسان گاؤں تھا جس میں آبادی چند لکھ پتی امیرزادوں کی تھی۔ لیکن اب یہ مقام تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ وہاں تین چھوٹی حویلیاں تھیں جن سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں اور میں وہاں پہونچکر جذباتی بننا چاہتا تھا، لیکن میں انھیں نہ پا سکا، ان کا نشان تک بھی نہ تھا!

میں نے اپنے دل میں کہا "کیا چارلی بھی مرکزِ تجارت بن گیا ہوگا؟" اور یہ میں نے کسی قدر بے چینی کے ساتھ سوچا کیونکہ اس پر زوال آنے کے راستوں میں سے یہ بھی ایک راستہ ہو سکتا تھا۔ کم از کم میرا ایسا خیال تھا کیونکہ سکۂ رائج الوقت سے جو اسے پر شوق دلچسپی تھی اسے میں کبھی نہ سمجھ سکا تھا۔ علاوہ ازیں اس وقت عام خیال یہ ہو گیا تھا کہ چارلی تصویروں کا کام تقریباً ختم کر چکا تھا۔ میں نے اس کو پروجیکشن روم میں پایا۔ وہ اپنے عملہ سے موڈرن ٹائمس ( )

ز کی پہلی دو فلموں کی ریلوں کے بارے میں جو حال ہی میں ختم ہوئی تھیں گفتگو کر رہا تھا۔ پالٹ گوڈارڈ وہاں موجود تھی اس کی خوبصورتی سے ذہانت اور شوخی ٹپک رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا فلک نے خود ایک ستارہ اس کی گود میں ڈال دیا ہے۔ وہ خود بھی اپنی بہترین وضع قطع میں تھوڑے سے سامعین کے سامنے کھڑا تھا اور تصویر کی خوبیوں اور اس کے نقائص کو تمثیلوں کے ذریعے سمجھا کر ان کو لطف اندوز کر رہا تھا۔ تمثیلوں سے میرا مطلب اسی پرانے ناقابل تقلید چپ سوانگ سے ہے جس میں مزاح کی چاشنی ہوتی تھی۔ میں نے اس کے اندر کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہ دیکھی۔

اس نے مجھے وہ دو ریلیں چلا کر دکھائیں اور ٹینس کا ایک گیم کھیلا اور شام کی طویل گفتگو میں بھی مصروف رہے۔ اس کے بعد ہم اس کے نئے مکان پر گئے۔ روبہ تنزل یا اپنے کام میں ذرا بھی غیر متوازن ہونے کا شائبہ بھی وہاں نہ تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چارلی نے اپنی وضع قطع اور خود اعتمادی دونوں میں کافی ترقی کر لی ہے۔ اسے اس کی پروانہ تھی کہ بہت سے لوگ یہ خیال کرنے لگے تھے کہ اس کے اندر کام کرنے کی اہلیت تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ جب میں نے یہ سوال کیا کہ اس کے کام کی رفتار اتنی کم کیوں ہو گئی تھی کہ ہر ہفتہ پرانے اصول کے مطابق ایک تصویر تیار کرنے کے بجائے اب ہر ساتویں سال وہ ایک تصویر تیار کرنے لگا تھا تو اس نے نہایت بے پروائی سے مجھے یہ جواب دیا۔

میرا قیاس یہ ہے کہ میں زیادہ نفاست پسند ہو گیا ہوں۔ مجھے یہ فکر

زیادہ رہتی ہے کہ تصویر اچھی ہو۔ اس کے علاوہ پہلے یہ نئی چیز تھی ان دنوں یہ صنعت بالکل نئی تھی۔ ہر چیز ہیجان پیدا کرتی تھی۔ شروع میں کوئی نئے منظر نامے ) بھی نہ ہوتے تھے۔ ہم ایک تصویر سنیچر کو تیار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ سوموار کے لیے ہمیں ایک کہانی ملنی چاہیئے۔ سوموار کو ہمیں کہانی نہ ملتی تھی لیکن اسی جگہ سے اور ان لوگوں میں سے جو چاروں طرف وہاں اتفاق سے کھڑے ہوتے کوئی کہانی نکل آتی تھی۔ آپ کہتے "اچھا کیا آج صبح میں دو پولیس کے سپاہی بلا سکتا ہوں؟" اور اگر وہ کہتے "ہاں بلا لیجئے" تو آپ کہتے "ایک ڈھیر اینٹیں کیسی رہیں گی؟" اور اگر آپ نے ان کو بھی حاصل کر لیا تو آپ کی کہانی بن گئی۔ اب ہر شخص دراصل سست پڑ گیا ہے۔

میں نے کہا "ہاں لیکن اتنا نہیں جتنے تم۔ تم اتنے سست پڑ گئے ہو کہ عوام اس خوف سے پریشان ہیں کہ مبادا تم نے کام بالکل چھوڑ دیا ہے"

اس نے جواب دیا۔ کیوں، پریشان کیوں ہیں؟ کام کے لئے اتنا خوفناک اصرار کیوں ہے؟ کام تو ایک وحشیانہ چیز ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ ایک قسم کا مذہبی فریضہ بن جائے۔ یعنی اگر تم کام نہ کرو تو تم کھا نہیں سکتے کمیونسٹ معاشرہ میں وہ ہمیں اس سے بہتر فضا مہیا کرتے ہیں۔ یہ صورت حال نہایت پریشان کن اور خراب ہے۔ میں ایسا معاشرہ پسند کروں گا جہاں ہر شخص صبح اٹھ کر یہ کہہ سکے "بہت خوب! مجھے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے! جانوروں کو دیکھیے۔ وہ ہر وقت زندگی میں اخلاقی پہلو نہیں دیکھتے اتنی تعداد میں شاندار خوبصورت جانور دیکھیے! ان میں سکون عظمت ہے

ایک شیر کو دیکھئے۔ ان شور پسند انسانوں سے محفوظ۔ وہ شاندار زندگی بسر کرتا ہے۔ کام صرف اُس وقت کرتا ہے جب اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد بیٹھ جاتا ہے، آرام سے اور کافی عرصہ تک بیٹھا رہتا ہے۔ غروبِ آفتاب کو نیم وا آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اپنے بچّوں سے کھیلتا رہتا ہے۔"

جب وہ بول رہا تھا میں ایک شیر کا تصوّر کئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ وہ خود شیر ہو گیا تھا، اور کام میں اس کی رفتار سُست ہو جانے پر مجھے کوئی خاص پریشانی نہ تھی۔ معقول حدود کے اندر اس کا یہ انداز عقل کے موافق معلوم ہوتا تھا۔ دراصل ایک ممتاز ہونہار نوجوان کا یہ انداز (یعنی زیادہ تیزی سے کام کرنے کے جنون کے خلاف جس نے بہت سے امریکی فن کاروں کو بگاڑا ہے یہ بغاوت) اس کی آئندہ ترقی کی ایک اور علامت معلوم ہوتی تھی۔

اس نے مزید کہا "علاوہ بریں مجھے اب لوگوں کی محض دلچسپی کا سامان مہیّا کرنے میں اتنا اطمینان حاصل نہیں ہوتا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ جوں جوں انسان عمر میں زیادہ ہوتا جاتا ہے وہ کچھ ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس سے اسے روحانی اطمینان حاصل ہو۔ میں لفظ 'روحانی' سے نفرت کرتا ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ اس سے میرا مطلب کیا ہے۔"

ایک طرح ان چودہ سال میں ہم دونوں تبدیل ہو گئے تھے۔ اب ہمارا یکجا ہونا پہلے کی طرح ہمیں کھیل شروع کرنے پر مجبور نہیں کرتا تھا۔ جمی لیگنے وہاں موجود تھا مجھے یہ یاد ہے (وہ ڈراما کھیل کے لئے فطرتاً موزوں تھا) اور دو

دیگر اشخاص بھی موجود تھے جو پُرانی مسرّت انگیز راتوں کی طرح ایک رات میں حصّہ لینے کے لئے کافی پھڑپھڑ رہے تھے۔ لیکن اب کوئی خاص چیز وہاں نہ تھی، وہ غیر موجود چیز میرا خیال ہے نوجوانی تھی اور اس لڑکی کی جسے ہم اتنا چاہتے تھے خوش آئند اور دانشمندانہ ہنسی اور زندہ دلی۔ اس لئے بجائے کھیلنے کے ہم نے باتیں کیں اور جس مضمون پر باتیں کیں وہ کام تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ "موڈرن ٹائمس" تصویر بنانے پر کیسے آمادہ ہوا۔ اس نے جواب دیا۔

وہ ایک مجرّد تصوّر سے شروع ہوئی۔ اس جذبہ سے کہ اس طریقہ کے بارے میں جس میں اس وقت زندگی کا معیار قایم کیا جا رہا ہے اور زندگی کو شعبوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے اور انسانوں کو مشینوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نیز اس سلسلے میں میرے احساسات کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔ میں یہ جانتا تھا کہ میرا مقصد کیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں نے اس کی تفصیلات پر غور کیا ہو"۔

میں نے اسے یاد دلایا کہ اس تصویر کا تخیّل اس کے دماغ میں برسوں پہلے آچکا تھا اور نقلوں میں سے ایک کا فوٹو گراف بھی لیا گیا تھا۔ میں نے اسے اس کی تفصیل بتائی۔ ایک خوب آباد چورا ہے پر فٹ پاتھ پر ایک فقیر بیٹھا ہے۔ عوام سامنے سے جلد جلد گزر رہے ہیں، مشینوں یا جرمن سپاہیوں کی طرح سے تیز تیز۔ اکثر ان میں سے ایک جلدی سے ایک طرف گھومتا ہے اور فقیر کو ایک نکل (پانچ سینٹ کا سکہ) دیتا ہے اور فقیر اسی

رسمی انداز میں ہر سکّہ کو لیتا ہے اور اسے مقیاس زر پر بجاتا ہے!

پھر اس نے کہا "جدید زمانہ کی زندگی یہی ہے۔ ہر کام مشین کی طرح اور پابند ضوابط ہے یہاں تک کہ خیرات بھی!"

چارلی اسے بالکل بھول گیا تھا۔ اسے وہ نقل یاد ہی نہ تھی، لیکن یہ امرِ واقعہ ہے (اور ایسا واقعہ جسے بعد کو کچھ اہمیت حاصل ہو گئی) کہ ۱۹۲۰ میں کئی ہفتوں تک گفتگو کے دوران میں وہ اس روشن تخئیل کی باہر کے لوگوں کے دلوں میں تخم ریزی کرتا رہا اور حسب عادت ایسی امارت کی جانب سے بے پروا تھا۔ ان دنوں ہمارا ایک کھیل کا ساتھی فرانسیسی ڈائرکٹر موریس توڑنار

بھی تھا۔ یہ بات ناقابلِ تصوّر نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے جدید طربیہ نگاری کے لئے چارلی کا خیال فرانس پہونچا تھا۔ جب موڈرن ٹائمس تیار ہو گئی تو رینی کلیر (          ) اور اے نو لا لبرٹی (          ) کے پروڈیوسرز نے چارلی چیپلن کے خلاف سرقے کی نالش کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے اپنا دعوے واپس لے لیا اور میری یادداشت کے مطابق یہ دانشمندانہ فعل تھا۔ اس نابغہ (چارلی) نے جلتے بھی گناہ اپنے ضمیر کے خلاف (یا ایک باکمال ایکٹر میں جو چیز ضمیر کی جگہ لے لیتی ہے اس کے خلاف کیئے ان میں سرقہ شامل نہیں ہے۔

میرے ذہن میں مزاح پر ایک اور کتاب "لطف خندہ" لکھنے کا خیال تھا۔ لہذا میں نے اس تمام اپنی پُرانی عادت کا اعادہ کیا کہ اپنے باکمال دوست کا مطالعہ کرنے کے لئے پنسل ہاتھ میں

لے کر جاؤں۔ میں یہاں یہ بیان کروں گا کہ اس نے اپنی تخلیقی کیفیت مزاج اور طریقوں کے بارے میں مجھے کیا بتایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا اس کی تصویریں ہمیشہ ایک مجرد "تصور" سے شروع ہوتی تھیں اور اس نے جواب دینے میں تامل کیا پھر کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ وہ اسی طریقہ پر شروع ہوں۔ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ ایک صبح میں اس خواہش کے ساتھ اٹھوں کہ میں کچھ کہوں گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے کسی چیز کا احساس ہو۔ ایک سادہ مثال کے طور پر میں کہوں گا کہ مجھے ایک آوارہ گرد شخص اور ایک لاوارث لڑکے کے باہم اکٹھے ہونے کا تصور دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک گشتی گاڑی میں ملتے ہیں اور نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ دلچسپ ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ دراصل اس میں کونسی بات دلچسپ ہے۔ یہاں ذہانت کا کام شروع ہوتا ہے۔ مجھے اس تصور یا اس کو سامنے لانا چاہیئے۔ مجھے اسے صاحبِ عقل انسانوں کے سامنے لانا چاہیئے۔ مجھے عقل کے ذریعہ اس کے تمام پس منظر کو سامنے لانا چاہیئے۔ میں اس ذہنی کام میں لطف محسوس کرتا ہوں۔ میں اس تصور پر لگاتار غور کرنے میں لطف محسوس کرتا ہوں ہوسکتا ہے کہ میں اس لطف اندوزی میں بہت زیادہ وقت گزارنے لگا ہوں اور اسی سبب سے میری محنت کے ثمرات اب اتنے پیدا نہیں ہوتے جتنے ہوا کرتے تھے۔ آج کل اگر میں اپنی طبیعت کو بدمزہ پاتا ہوں تو اس کام کو فوراً ملتوی کر دیتا ہوں۔ اب مجھے اس کاہلی کے وقفوں کی عادت ہو گئی ہے۔ ان سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی وہ مجھے پہلے بے انتہا پریشان کرتے تھے"۔ میں کہتا تھا۔ تم

اب ختم ہو چکے ہو۔ تمھارا تخلیقی جذبہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گیا ہے!" وہ اپنی گفتگو جاری رکھتا۔ "اب میں بستر پر لیٹا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں۔ جب مجھے کسی کہانی کی تلاش ہوتی ہے تو میں ۹ بجے سوچنا شروع کرتا ہوں اور ۲ بجے ختم کرتا ہوں۔ اب ایک ماہ گزر گیا ہے اور مجھے کوئی تخلیقی تصوّر ہاتھ نہیں آیا۔ جو خیال مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کوئی تخلیقی تصوّر ملے گا اس کے پیچھے لگا رہتا ہوں۔ میں کہتا" تعجب ہے کہ تم اس سے کوئی کہانی تیار نہیں کر سکتے۔ تم اس میں لگے رہ سکتے ہو جب تک کہ کوئی کہانی نہ بنے!"

اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ تم بیٹھے ہوئے تخلیقی تحریک کا انتظار کرتے رہو۔ تمہیں تفریح بھی کرنی چاہیئے۔ خاص چیز جو تمھیں کرنی چاہیئے وہ اپنی قوت کو بچا کر رکھنا ہے۔ دو دن تک مکمل آرام اور خلوت نشینی اختیار کرنا اس میں مدد دیتا ہے۔ کسی سے ملاقات بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ میں اپنے جذبات کو بھی بچا کے رکھتا ہوں۔ میں کسی شخص یا چیز کے لیئے غصہ یا دیگر جذباتی افعال کا اظہار نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے کہ اس وقت تک نہیں کرتا جب تک کہ میری کہانی یا نقل مکمل نہ ہو جائے۔ میں اسی طرح وقت گزارتا ہوں اور خاموشی اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد ایک شب میں دیر تک باہر رہتا ہوں اور ۲ جام نوش کرتا ہوں (غالباً پوری رات گزر جاتی ہے) اور دوسری صبح بچائی ہوئی قوت باہر آتی ہے۔ لیکن تمھیں اب بھی قوت کو بچا کے رکھنا ہوتا ہے۔ قوت کا انتشار سوائے کچھ تفریح مہیا کرنے کے کوئی فائدہ نہیں پہونچاتا۔ تم اس طرح اسے اپنے اندر باندھ کر روک رکھتے ہو

اور یکایک تم کہہ اُٹھتے ہو"ادہ وہ موجود ہے"۔اور اس وقت کام شروع کرتے ہو۔"

موڈرن ٹائمس" کے نکلنے کے دو سال بعد مجھے پالٹ گوڈارڈ کا ایک ٹیلیفونی پیغام ملا۔ اس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کیا ایلینا اور میں ہالی وڈ آسکیں گے اور کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہیں گے۔ پالٹ گوڈارڈ نے کہا تھا کہ میرے وہاں پہونچنے سے چارلی کو فائدہ پہونچے گا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ چارلی کو فائدہ پہونچنے کا مطلب یہ تھا کہ میں اس سے ایک اور تصویر تیار کراؤں گا جسمیں پالٹ کام کرے گی۔ لیکن اس میں کوئی بُرائی نہ تھی اس لئے میں نے جواب دیا کہ اگر چارلی بھی چاہتا ہے کہ میں آؤں تو میں آؤں گا۔ اسی رات مجھے یہ تار ملا: "تمھارا انتظار ہے"۔ "چارلی"

کئی وجوہ سے ہم نے تقریباً دو ماہ تک وہاں جانا ملتوی رکھا اور ہم اسکے لئے زیادہ فکر نہ کرتے تھے بہر حال ہم نے تار کے ذریعہ آخر میں یہ اطلاع دے دی کہ ہم غالباً فلاں تاریخ کو آئیں گے۔ میں نے چارلی کو مسودات کے ڈھیر سے گھرا ہوا پایا۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ اس کا نصف جسم ان کے ڈھیر سے چھپا ہوا تھا۔

اس نے کہا"میں لکھنا سیکھ رہا ہوں۔ یہ تمام کاغذات جو تم ادھر اُدھر دیکھتے ہو منظر نامے ہیں اور ان میں مکالمے بھی ہیں"۔

میں نے کہا"تم بولنا سیکھ رہے ہو!" اس نے جواب دیا"شاید میں خود نہ بولوں گا۔ میں پالٹ کے لئے ایک پکچر ترتیب دے سکتا ہوں۔ لیکن جس چیز میں اس وقت مجھے دلچسپی ہے وہ لکھنا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمھارے لکھنے کا کیا طریقہ ہے۔ جب آمد ہوتی ہے تو وہ مجھے بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اِن

اوراق میں سے جو یہاں پڑے ہوئے ہیں لکھنے کے وقت میں ہر ایک کو انشا پردازی کا ایک اعلےٰ نمونہ خیال کرتا تھا، لیکن دوسرے دن جب میں ان پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ بھیانک معلوم ہوتے ہیں۔"

اس سب گفتگو کا ماحصل یہ معلوم ہوا کہ وہ اس وقت اس خیال میں تھا کہ ہم مل کر کام کر سکیں گے۔ آخر ہم مل کر اکثر کھیلے بھی تھے۔ اس نے کہا "دراصل میں ایک بولتی پکچر پر تمھارے ساتھ مل کر کام کرنا پسند کروں گا۔" یہ تجویز قدرتی معلوم ہوتی تھی۔ درحقیقت یہ کوئی نیا خیال نہیں تھا، اور جب کہ پالٹ کی خواہش بھی اسی سمت میں تھی تو اس پر عمل کیے جانے کا بہت امکان تھا۔ لیکن ایلینا جو چارلی سے بہت محبت کرتی تھی مجھ سے کہیں زیادہ اس تجویز پر مسرور تھی۔ میں نے اس سے کہا "جو میں تم سے کہہ چکا ہوں اسے یاد رکھنا، کسی چارلی چیپلن سے جس سے لطف اٹھانے کا تھیں خوش قسمتی سے موقع مل جائے ضرور لطف اٹھاؤ لیکن مختلف چارلی چیپلنوں کو ملا کر ایک قابل فہم شخصیت سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔ چارلی چیپلن کی شخصیتیں کئی ہیں۔ وہ شخصیت جو میرے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتی ہے میری رائے میں سمجھدار ہے لیکن مجھے شک ہے کہ رات گذرنے پر وہ شخصیت زندہ رہے۔" وہ شخصیت رات بھر اور اگلے پورے دن زندہ رہی۔ سہ پہر کو ٹینس کھیلنے کے بعد چارلی نے کہا "اگر تم کل ناشتہ کے بعد میرے کمرے میں آجاؤ گے تو ہم کام شروع کر دیں گے۔ اوّل ان کاغذوں کے ڈھیر میں سے جو میں نے لکھا ہے کچھ پڑھیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ آیا اس کا کوئی حصّہ کسی قابل ہے یا نہیں۔"

اگلی صبح پیشتر اس کے کہ میں سو کر اٹھا چارلی، مانٹیری ار
کو روانہ ہو گیا تھا کیونکہ اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ پالٹ سے دور ہو جائے گا
تو زیادہ اچھا لکھ سکے گا، اور یہ بات اس وقت بلا شبہ صحیح تھی۔ میرے لیئے
وہ یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں اس کے کشادہ سونے کے کمرے میں لکھنے کا کام
کر سکتا ہوں۔ جب وہ پھر میزبان کی حیثیت اختیار کرنے کے لیئے واپس آیا
تو ہمارے ساتھ ساتھ کام کرنے کا تصوّر پروگرام سے غائب ہو چکا تھا۔ اس نے
اس تجویز کا پھر ذکر کبھی نہیں کیا اور نہ میں نے کیا اور نہ اس سے ہمارے تعلقات
میں کوئی فرق آیا۔ مجھے کوئی شکایت نہ تھی۔ میں نے اس کی بے پروائی کا
جواب پہلے ہی دے دیا تھا۔

ایک دن جب کہ وہ ان معاشرتی آفتوں کے طوفان میں پھنسنے کی
زحمتیں اٹھا چکا تھا جو "دی گریٹ ڈکٹیٹر"
کی پہلی نمائش کے بعد رونما ہوئی تھیں۔ میں نے چارلی کو ایک تار "والڈورف
اسٹوریا" بھیجا جس میں یہ درج تھا۔

"اتوار کو آجاؤ اور ایک ساتھی کو ساتھ لانا۔ میں نے ایک جدید کھیل ایجاد
کیا ہے"۔ جب فرینک اس کا پرانا جاپانی ملازم یہ پیغام لایا کہ وہ آئے گا
تو میں نے ادبی تنقید نگار ایڈمنڈ ولسن اور اس کی خداداد قابلیت رکھنے
والی بیوی "میری میک کارتھی" کو اسٹیم فورڈ سے بلایا، اور اپنے دوست
چارلس ریٹیل کو جو بہ اعتبارِ پیشہ زوال پذیر صنعتوں کے ڈاکٹر تھے یہ پیغام
بھیجا کہ وہ ذہانت اور شخصیت کے معائنہ کے سامان کے ساتھ آئیں۔ ان

دعوت ناموں میں میں نے لکھ دیا تھا کہ چارلی چیپلن کی شرکت کا امکان ہے۔

چارلی دوپہر کو آگیا اور وہ ایک شریف طبیعت اور پُر کشش آنکھوں والے ایک ساتھی کو" برو کلن" سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہم نے مذکورہ معائنہ کے طریقوں کا کھیل ترتیب دیا اور ان پر بحث و تمحیص کرتے رہے اور رات کے ڈیڑھ بجے تک دُنیا کی ہر ایک بات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ ہالی وڈ کا پُرانا زمانہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہمیں اس بات سے تعجب ہوا کہ بنی ولسن Bunny Wilson) نے جو نمایاں طور پر ایک ادبی ذوق رکھنے والا شخص ہے، نازک مشینوں کو چلانے کی ٹیسٹ میں غیر معمولی نمبر حاصل کیے۔ ڈاکٹر ریٹیل نے کہا کہ درخواست دینے پر انھیں ساٹھ ڈالر فی ہفتہ کی ملازمت یقیناً مل سکتی ہے۔ اسی ٹیسٹ میں میرے لئے یہ کہہ دیا گیا کہ یہ شخص بہت محنت کے بعد صحیح نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ میرے پرچہ پر لکھا کہ اس شخص کو اُجرت پر مت لگاؤ۔"

چارلی نے پڑھنے کا چشمہ نہ ہونے کے عذر پر معائنے کا صرف آٹھواں حصّہ مکمل کیا۔ باقی وقت اس نے انسانوں کی درجہ بندی کرنے کے پورے منصوبے کی مذمّت کرنے میں صرف کیا۔

اس نے کہا: "یہ ٹیسٹ کچھ نہیں بتاتے۔ لوگ منفرد اشخاص ہیں۔ وہ چند صفات کے گچھّے نہیں ہیں۔ انھیں اچھی طرح جاننے کے لئے تمھیں اوّل ان کو اپنی وجدانی قوت سے جاننا پڑتا ہے"۔ مسٹر اور مسز بنی ولسن نصف شب کے قریب چلے گئے، اور باہر جانے کے چند منٹ بعد مسٹر بنی ولسن نے پھر اپنا سر دروازہ سے نکال کر کہا "جنٹلمین! معلوم ہوتا ہے کہ کار مجھ سے حرکت میں نہیں آتی، کیا تمھیں انجنوں کے متعلق

کچھ علم ہے؟"

چارلی اپنی کرسی سے خوشی میں کود کر کھڑا ہو گیا اور چلایا۔ "دیکھا آپ نے یہ واقعہ آپ کو بتاتا ہے کہ ان ٹیسٹوں کی کیا قدر و قیمت ہے۔" ولسن مشینوں کا بڑا کاری گر، ساٹھ ڈالر فی ہفتہ کا مشین ساز، اور اسے واپس آنا پڑتا ہے اور ایک شاعر سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ اس کی موٹر کار اسٹارٹ کر دے!"

بہر حال ڈاکٹر رٹیل کو ہمارے بارے میں اپنے گھر واپس ہونے کے وقت تک اس سے زیادہ واقفیت ہو گئی تھی جتنی معمولی گفتگو کے ذریعے اسے مہینوں میں ہو سکتی تھی۔ خصوصاً میرے خیال میں چارلی اور میرے بارے میں اس کی رائے حقارت آمیز تھی اور وہ ان وجوہ کو سمجھ گیا تھا جن کی بنیاد پر ہم دونوں میں اتنے عرصہ سے باہمی مفاہمت تھی۔ ہمارے شخصی اوصاف کی فہرست میں ہماری خصوصیات حیرت انگیز حد تک مشترک تھیں۔ جذباتی عدم استحکام میں چارلی کے نمبر ۸۴ فی صد تھے جب کہ اوسط درجہ کے شخص کے ۵۰ فی صد ہوتے ہیں اور ۷۰ فی صد نمبر ہونا اس امر کی علامت ہے کہ اس شخص کو کم از کم دماغی امراض کے معالج سے رجوع کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر رٹیل نے مہربانی کے لہجہ میں چارلی سے کہا "تمہارے نمبر اس میں زیادہ ہیں اور وہ اس امر کی یقین دہانی کرتے ہیں کہ تمہارے اندر عوام کے جذبات اُبھارنے کی قابلیت ہے۔ تم ان کے جذبات کو ان کے لئے بہت زیادہ بڑھا کر پیش کرتے ہو۔"

اس نے میرے لئے ایسے کوئی تسلّی بخش الفاظ نہیں کہے اگرچہ میں پاگل پن

کے اور بھی زیادہ قریب تھا۔ میرے نمبر ۸۷ فی صد تھے۔

ڈاکٹر کی فہرست میں ایک خصوصیت ایسی چارلی سے منسوب کی گئی تھی جو کہ بلاشبہ اس کے اندر ہے اور جو فلمی دُنیا کے کمزور قسم کے اجتماع پسند اور باتونی دماغ خراب کرنے والے اشخاص میں اسے تقریباً یکتا بنا دیتی ہے۔ وہ صفت اس کا اعلٰے درجہ کا "خود مکتفی" ہونا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا کہ "اس صفت میں تمہارے نمبر ۷۰ فی صد ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم تنہا رہنا پسند کرتے ہو اور دوسروں کے مشورہ کو نظر انداز کرنے کی جانب مائل رہتے ہو۔"

یہ جملہ ہالی وڈ میں چارلی کی زندگی کی تصویر کھینچ دیتا ہے یا اس سے آگے کی بھی۔ یہ اس رعب اور خوف (اگر یہ الفاظ زیادہ زوردار نہیں ہیں) کی نیز اس ناراضی کی جو چارلی کے خلاف فلمی دُنیا کی زیادہ زندہ دل مشہور ہستیوں کے دل میں رہتی ہے توجیہ کرتا ہے۔ اس سے اس اندوہناک حالت کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے جسے رحم کے غصّہ میں بدل جانے کی کیفیت کہنا چاہیئے اور جس میں لڑکیاں اس وقت پڑ جاتی ہیں جب ان کی تقریباً ہمہ گیر خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس پر پورا قابو پالیں (اور کسی حد تک اس کا خیر مقدم بھی ہوتا ہے) لیکن آخر میں وہ اس کے اندرونی قلعہ کو ناقابل تسخیر پاتی ہیں۔

اور یہ بات صرف لڑکیوں تک محدود نہیں ہے۔ ہر محبت میں اس شے کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے کا جذبہ ہوتا ہے جس سے محبت کی جاتی ہے۔ یہ یقین حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے کہ محبوب اس حد تک محبت کی گرمجوشی پر بھروسا کرتا ہے کہ جب

کبھی اس کی جانب سے گرم جوشی کی ضرورت ہوگی تو وہ اس سے دریغ نہ کریگا
چارلی کسی گرم جوشی پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا، اس وقت بھی نہیں جب وہ خود
محبت کرتا ہے۔ وہ خود مکتفی ہے۔

یہ صفت بعض لوگوں کو ڈرا دیتی ہے بلکہ پاگل کر دیتی ہے لیکن میں
اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس پر خوشی بھی محسوس کرتا ہوں، تاہم میرا خیال
ہے کہ آنے والے برسوں میں اس صفت نے اس پر بہت زیادہ قابو پالیا اور اسکے
کام میں نقائص کے رونما ہونے کا سبب بنی۔ بہت سے زیادہ غور و خوض کرنے
والے فن کاروں کی طرح چارلی بھی بے حد حساس ہے اور اگر تم اس کے کیے
ہوئے کسی کام کے بارے میں یہ کہہ دو کہ وہ اچھا نہیں ہے تو وہ بہت غمگین ہوجاتا
ہے۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ اپنے اسٹوڈیو میں کسی اعلےٰ درجہ کے نقاد کو جیسے:
"اڈی سودرلینڈ جو خود بھی ایک اچھا ڈائرکٹر تھا رکھتا تھا۔ وہ کہتا" چارلی اس
نقل کو مختصر کرو۔ یہ تو اکتا دینے والی ہے"! چارلی پر اداسی چھا جاتی اور ممکن تھا
کہ وہ ایک دو دن کے لئے کام بھی چھوڑ دے لیکن جب وہ واپس آتا تھا تو
اس تنقید کے پورے حقیقت پسندانہ اور صحیح احساس کے ساتھ آتا تھا۔

مجھے اپنا یہ محسوس کرنا یاد ہے کہ اس کی دو بعد کی پکچروں میں اس قسم کی
اصلاح کا فقدان تھا۔ وہ اپنی تنک مزاجی میں مبتلا تھا۔ اس نے جی حضوریوں
کو پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ عظیم ڈکٹیٹر" (The Great Dictator,
میں بالکل یہ کھلا ہوا نقص تھا کہ آخر میں جو چھوٹے حجام نے اپنی مہتم بالشان
تقریر کی تمہید کے طور پر کچھ بھی نہیں کہا گیا تھا اس تقریر کو بے ربط طور پر داخل

کر دیا گیا تھا اور وہ ان ایام جنگ میں ہمارے جذبات کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی خوش آیند تھی لیکن اس پکچر میں وہ اس کا ایک مناسب جزو ہونے کے بجائے ایک اضافی تتمّہ ہی شمار ہوتی ہے۔ اس کی اصلاح کے لئے صرف اتنا کرنا تھا کہ اس چھوٹے آدمی کو ایک ین (ایک جاپانی سکہ) تقریر کرنے کے لئے دے دیا جاتا اور ایک یا دو موقع اس سے قبل سامعین کو مخاطب کرنے کے دیئے جاتے جن میں وہ مزاحیہ انداز میں سامعین پر قابو پانے کی ناکامیاب کوشش کرتا اور اس کے بعد تقریر کا شاندار موقع آتا۔ طربیہ یا المیہ کے معاملوں میں بھی چارلی ایسا آدمی ہے جو اس فن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ اس موقع پر اپنا توازن کھو بیٹھا تھا اور میرے خیال میں یہ اس کے جذبات کے بوجھ سے ہوا تھا۔ اگر اس نے خود مکتفی ہونے کی کی قابل ستائش صفت سے کسی قدر کم کام لیا ہوتا تو "موڈرن ٹائمس" اور "عظیم ڈکٹیٹر" دونوں پکچریں اس سے بھی بہتر ہو جاتیں جیسی کہ وہ ہیں۔ کوئی شخص اتنا عظیم نہیں ہے کہ اس کی مدد نہ کی جاسکے۔

چارلی کی فہرست میں "مطالعۂ باطن" کے نمبر ۸۸ فی صد تھے۔ یہ اتنے اونچے نمبر تھے کہ ڈاکٹر تعجب سے چلا اٹھا۔ "تم ایک تارک الدنیا بن جانے سے زیادہ دور نہیں ہو۔ تنہائی کے ساتھ ترکِ دنیا تمہارے نزدیک بہشت ہے۔" اس بات سے ڈاکٹر کے طریقوں کا احترام پھر میرے دل میں زیادہ ہو گیا کیونکہ میں نے چارلی کو بہشت کے اس تصور کو بیان کرتے ہوئے کئی مرتبہ سنا تھا۔ بہت سال گزرے جب ہم دونوں کا یہ خیال ہوا تھا (کم از کم کچھ وقت کے لئے) کہ عوامی انقلاب آ رہا ہے تو اس نے کہا تھا۔

میرے لئے یہ سب ٹھیک ہے۔میں مزدوروں کا طرف دار ہوں۔لیکن وہ مجھ سے مورچوں پر پہونچنے کی توقع نہیں کر سکتے، میں کوئی بطل ( Hero. ) نہیں ہوں۔ مجھ میں قوت تخیل اتنی زیادہ ہے کہ میں بطل نہیں بن سکتا جب گولی چلنا شروع ہوگی تو میں ایک ڈبل روٹی لوں گا اور ایک ڈبہ مچھلیوں کا کا اور پہاڑوں پر چلا جاؤں گا۔"

جب اس نے یہ بات کہی تو گویا وہ تیزی سے پہاڑوں پر چڑھ رہا تھا۔ اسکے بعد وہ احتیاط سے پھر نیچے اُترا۔ اس نے کہا۔

"مجھے شاید ڈبہ کھولنے کے اوزار کے لئے واپس آنا پڑے گا لیکن انقلاب سے میرا کل مطالبہ یہی ہوگا۔"

ان ایام میں اس کے دل سے ایک گوشہ نشین کی زندگی بسر کرنے کا خیال کبھی دور نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مکان اس وقت ایک چھوٹی سی دیوار سے گھری ہوئی پہاڑی پر تھا اور درخت اس کے آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔

جب اس نے وہ مکان مجھے دکھایا تو کہا: "اگر ایک خندق اور ایک اُٹھاؤ پل میرے پاس ہوتا تو میں یہاں سال بھر تک بالکل تنہا اور خوش رہ سکتا تھا میں کبھی کبھی تمھیں ٹینس کے لئے آنے دیتا لیکن صرف اس لئے کہ مجھے ورزش کی ضرورت رہتی ہے۔"

ایک دوسری بات جس نے ہمارے ممتحن کو بہت متعجب کیا وہ چارلی کے کے تھوڑے نمبر یعنی صرف ۱۸ فی صد نمبر "حکومت بمقابلہ اطاعت" کے عنوان کے تھے

ڈاکٹر نے کہا "اس معاملہ میں تم نے یقیناً مجھے بے وقوف بنا دیا۔ میں ہمیشہ یہ خیال کرتا رہا کہ تم دوسروں پر حکومت کرنا پسند کرتے ہو لیکن میں یہ دیکھتا ہوں کہ تم بہت اطاعت پسند، امن پسند اور خاموش قسم کے آدمی ہو۔"

خود اعتمادی پر چارلی کے نمبر اور بھی کم تھے یعنی صرف گیارہ فی صد ڈاکٹر نے یہ حکم لگایا کہ "تمہاری خود آگاہی بڑی نقصان رساں معلوم ہوتی ہے اور تم کمتری کے معین احساسات رکھتے ہو۔ جارحیت کی نمایاں علامتیں یا اقتدار کے زوردار دعاوی جن کا اظہار تمہاری طرف سے ہوتا ہے، وہ محض ایک مدافعانہ عمل ہوتے ہیں نہ ایک ڈرپورک، متفکر اور پریشان روح پر چڑھا ہوا ایک باریک پتر یا پردہ ہوتے ہیں۔"

اس موقع پر میرے خیال میں ڈاکٹر کے طریقہ میں ایک بہت بڑا نقص ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ اقتدار جو ایک اساسی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اور اس اقتدار میں جس کی حیثیت ایک فوری معاشرتی رویہ کی ہوتی ہے ڈاکٹر کا طریقہ امتیاز نہ کر سکا تھا۔ وہ یہ سمجھنے میں بھی ناکام رہا تھا کہ شرمیلے اور بے حوصلہ لوگ اکثر اپنی رائے پر اعلیٰ ترین اعتماد رکھتے ہیں خواہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان کی اپنی رائے کیا ہے انھیں گھر جانا اور اپنے آپ کو ایسے کمرہ میں بند کرنا پڑے جہاں کوئی آواز نہ پہونچ سکتی ہو۔

آپ شرطیہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کسی متحرک پکچر تیار کرنے والی جماعت میں خواہ وہاں اسے کوئی جانتا نہ ہو چیپلن جلد ایک سرگروہ کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے، یا تو وہ ان کا سربراہ ہو جائے گا یا اسے قابو میں نہ آنے والے

ایک شخص کی حیثیت سے جماعت سے نکال دیا جائے گا، باوجود اس کے آپ ان میں کوئی تصادم نہ دیکھیں گے۔ وہ کبھی غصہ نہ کرے گا اور نہ اقتدار جمانے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس قسم کی بات سے اتنا متنفر تھا کہ اس نے ہمارے بہت زیادہ پرجوش اصلاح پسند انشا پردازوں میں سے ایک سے جو ہالی وڈ آیا تھا اور تمام دوسرے فلمی ستاروں نے اس کی تفریح کا سامان مہیا کیا تھا ملنے سے گریز کیا۔

اس نے کہا: "میں تہذیب یافتہ لوگوں کو پسند کرتا ہوں"۔

۱۹۱۴ء میں جب وہ نوجوان اور قطعی ناتجربہ کار تھا وہ ہالی وڈ میں میک سینٹ (Mack Sennett.) کے اسٹوڈیو میں آیا تھا۔ وہاں پہونچنے کے دو ماہ بعد یہ "اطاعت پسند" خاموش اور پُرامن قسم کا شخص ہر اس پکچر کا ڈائرکٹر بننے لگا جس میں وہ حصہ لیتا تھا۔ چھ ماہ بھی نہیں گزرے کہ اس نے وہاں کے (اگر ہر جگہ کے نہیں) طربیہ کھیلوں کی نوعیت اور تخئیل کو بدل دیا لیکن کسی قسم کی "جارحیت کی علامتوں"، یا اقتدار کے پُرزور دعاوی کے ظہور پذیر ہونے کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اس نے اپنے احترام آمیز بلکہ عاجزانہ برتاؤ سے ہر شخص کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا، لیکن وہ ڈائرکٹر کی ہدایت پر عمل نہ کرتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک سینما کے بکسوں سے شاندار خبریں آنا شروع نہ ہوئیں سینما کے مستقل منظر پر چارلی کی آزادیٔ رائے کو عام طور پر ایک خاص قسم کی حماقت سمجھا جاتا تھا۔ آخر کار میک سینٹ نے تنگ آکر اس کی اپنی ایک پکچر کی ہدایت کاری اسی کے سپرد کر دی یہ سوچتے ہوئے کہ اس بیوقوف

کو خود یہ پتہ چل جانا چاہیئے کہ ہدایت کاری کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

لیکن چارلی نے انہی ایّام کے متعلق ایک دوسری روایت مجھ سے بیان کی ہے جس سے اپنی ذات پر اس کی بے اعتمادی ظاہر ہوتی ہے۔

میک سینٹ مجھے ۱۷۵ ڈالر فی ہفتہ دے رہا تھا اور جب ہمارا معاہدہ ختم ہو گیا تو ایسینے ( Essenay. ) نے مجھے تین ہزار ڈالر فی ہفتہ دینے کی پیش کش کی۔ میں میک سینٹ کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ مجھے مذکورہ پیش کش دی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے یہاں کام کرتا رہوں گا اگر آپ مجھے ایک ہزار ڈالر فی ہفتہ ادا کریں گے اس نے تین سال کے معاہدہ کی تجویز پیش کی ۵۰۰ ڈالر فی ہفتہ پہلے سال میں، ایک ہزار ڈالر دوسرے سال میں اور تین ہزار تیسرے سال میں۔

"مجھے معلوم تھا کہ میں عوام میں مقبول ہو گیا تھا۔ تھیٹروں سے باہر سڑک پر میں نے لوگوں کے ہجوم دیکھے تھے، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ مقبولیت کتنی عارضی ہوتی ہے مجھے اپنے بچپن سے اس امر کا تجربہ تھا کہ تفریح بہم پہنچانے کے پیشہ میں کتنی بے یقینیاں سایہ فگن رہتی ہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اپنی مقبولیت کے چشمے کے خشک ہونے سے پہلے میں اس سے فائدہ اُٹھا لوں۔ میں نے میک سینٹ سے کہا "میں آپ کی پیش کش قبول کر لوں گا اگر آپ اسے اُلٹ دیں یعنی مجھے تین ہزار ڈالر فی ہفتہ پہلے سال دیجئے۔ ایک ہزار ڈالر فی ہفتہ دوسرے سال اور ۵۰۰ ڈالر فی ہفتہ تیسرے سال، اور میں آپ کے یہاں ٹھہرا رہوں گا۔"

سینٹ نے کہا کہ یہ ایک احمقانہ خیال ہے اور وہ ایسے معاہدہ پر دستخط نہیں کرے گا۔ لیکن میں یہی چاہتا تھا اور اس پر دستخط کرنے کو تیار تھا۔"

اس قسم کی بُزدلی میں یا اس کے آس پاس ایک قسم کی زیرکی ہوتی ہے اور چارلی انتہائی زیرک ہے۔

کاروباری آدمی کی حیثیت سے وہ صرف ان معاملات میں جن میں اپنی قدر واقعی پہچاننے کی ضرورت ہوتی تھی ناکامیاب ہوتا تھا۔ اسے یہ بات مضحکہ خیز نہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ اپنی انکم ٹیکس کی رپورٹیں اس اصول پر تیار کرے کہ وہ اور اس کا سوتیلا بھائی سائڈ (Syd.) "جو تصویروں میں اداکاری کرتا تھا" باہم شریک تھے۔ ناجائز ٹیکسوں اور جرمانوں کے طور پر لاکھوں ڈالر دینے کے بعد بھی وہ گورنمنٹ کی منطق کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکا تھا!

اس کی زیرکی یا احساس کمتری کی (میں نہیں کہہ سکتا کس کی) ایک اور مثال یہ ہے۔ میں ایک صبح والڈورف ایسٹوریا میں اس کے کمرہ میں گیا اور دیکھا کہ وہ اس وقت تک بستر پر آرام کر رہا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرہ پر ناقابلِ بیان رنج و غم کے ایسے آثار نمایاں تھے یا اس وقت اس نے پیدا کر لیے تھے جو اکثر اور لیکایک تھیئٹر کے پردے پر آپ کو دل شکستہ کر دیتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا "چارلی! کیا معاملہ ہے؟ تم اتنے اُداس کیوں ہو؟" اس نے ہاتھ بڑھایا اور کاغذ کا ایک پُرزہ بستر کے قریب کی میز سے اُٹھایا "اس کو دیکھو!" اس نے کہا۔ میں نے کاغذ لے لیا اور پڑھا۔ وہ اس کے ملازم سکریٹری کا

لکھا ہوا تھا "فلاں کمپنی آپ کو پندرہ منٹ کے پچیس نشریات کے لیئے ۸۷,۰۰۰ ڈالر کی پیش کش کرتی ہے"۔

میں ہنسنے لگا۔ میں نے خیال کیا کہ اس کا اُداس شکل بنانا ایک مذاق تھا، لیکن ایسا نہ تھا۔ اس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ میں یہ نہیں کر سکتا"۔ اور پھر زیادہ مغموم لہجہ میں کہا "مجھے روپیہ کی بھی ضرورت ہے۔ گورنمنٹ نے حال ہی میں مجھ سے ایک ملین ڈالر وصول کر لئے ہیں"۔

میں نے کہا "تم یہ کیوں نہیں کر سکتے؟ تم تقریر کر سکتے ہو!" اس نے جواب دیا "یہ بات نہیں ہے! تم جانتے ہو کہ میں تقریر کرنے کا کتنا شائق ہوں، بات یہ ہے کہ میں اپنے عوام سے اتنا قریب نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی قدر دور اور پُراسرار رہنا پڑتا ہے۔ وہ رومانی انداز میں میرا تصور کرتے ہیں۔ اگر میں اپنی اصل حیثیت اور معمولی انداز میں ریڈیو پر اپنے آپ کو پیش کروں گا تو تھیئٹر کے بکس آفس میں میری حیثیت کو زیادہ نقصان پہونچے گا"۔

مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میرے لیئے چارلی ایک راز ہی رہا اگرچہ اس نے اپنی اصل حیثیت اور معمولی انداز میں میرے ساتھ تعلقات بہت کچھ بڑھائے تھے۔ وہ ٹھنڈے اور اعلےٰ دماغ اور اندھے جذباتی محرکات میں غوطہ لگانے کے رجحان کا ایک ناقابلِ فہم مجموعہ تھا۔ اسے مشورہ کرنے کا شوق تھا۔ اسے ایسی طویل گفتگو پسند تھی جس میں دُنیا کے بہترین دماغ اس کے مسائل کی جانب پورے طور پر متوجہ ہوں اور یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ایک ناتربیت یافتہ لیکن ایک عظیم تخلیقی ذہانت کے حامل شخص کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ وہ اسے اسی طرح پسند

کرتا تھا جیسے ایک بطخ فوارہ تلے نہانا پسند کرتی ہے۔

مشورہ پر ہمیشہ نہایت توجہ سے غور کیا جاتا تھا اور جس حد تک وہ درحقیقت اچھا ہوتا تھا اسے قبول کر لیا جاتا تھا۔ ہر شخص اس کے پاس سے اس احساس کے ساتھ اُٹھتا تھا کہ نہایت اہم اور نپی اندازکے فیصلے کیئے گئے ہیں اگر وہ فیصلے اس کے برخلاف ہوتے تب بھی چارلی کے عمل پر ان کا اتنا ہی اثر ہوتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سنجیدہ فیصلوں اور اس کی آزاد مرضی کے افعال کے درمیان کوئی فوق الفطرت بے ربطی تھی۔ میرے خیال میں وہ اعصابی بدنظمی کا اس سے زیادہ مریض نہ تھا جتنے تخلیقی فنکار زیادہ تر ہوتے ہیں۔ انکو ایسا بننا پڑتا ہے تاکہ ہر قسم کے جذبات کی لہریں ان کے دل میں آسانی سے رسائی پا سکیں۔ اس معاملہ میں ڈاکٹر کا قول بالکل صحیح تھا۔ لیکن چارلی ان لہروں میں تیرنے کی یعنی ان سے اپنا سر اوپر رکھنے کی کوشش بمقابلہ اکثر سمجھدار لوگوں کے کم کرتا ہے۔ اس نے اپنے بچپن میں کبھی نظم و ضبط کی عادت نہ ڈالی بلکہ کبھی اس تصوّر سے ظاہرہ طور پر دلچسپی نہیں لی۔ یہ بات اس کے خیال ہی میں نہیں آتی کہ وہ کسی جذبہ کے تیز بہاؤ کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتا ہے یا تھوڑے عرصہ کے لیئے ہی اس کے خلاف چل سکتا ہے کیونکہ اس کا دماغ اسے کسی اور بات کی بھی یاد دلاتا ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اس پر افسوس کرنا بھی اس کے خیال میں نہیں آتا۔ میں نے کبھی اسے کسی بات پر پشیمان ہوتے نہیں سُنا۔ لیکن یہ سب باتیں صرف لوگوں سے اس کے تعلقات پر عائد ہوتی ہیں۔ اپنے فن کے لیئے (کم از کم اس زمانہ میں) اس ذہن با اصولی، دیانت داری، نظم و ضبط، صبر و تحمّل، استقلال ہر اچھی

اور اعلیٰ صفت موجود تھی۔ یہاں بھی اس کو ایک نا تربیت یافتہ بے خانماں شخص، ایک تخئیل سے بہرہ ور لاوارث آوارہ گرد، ایک نازک مزاج لاوارث بچہ" سمجھنا پڑتا ہے، ایک کاغذ کا ورق جس پر کوئی مقدس عبارت لکھی ہو اور لندن کے گندے محلّہ کی گلیوں میں اُڑا دیا گیا ہو۔

اگر آپ اسے کافی عرصہ سے جانتے ہوں تو اس کی بابت آپ بھی اندازہ کریں گے اور یہ اندازہ کرنے میں آپ معقولیت ہی سے کام لیں گے کیونکہ وہ بڑا وقار رکھتا ہے۔ آپ اس کے لیئے کسی قدر رحم کے جذبات رکھیں گے جیسے کہ سینما کے پردہ پر اس کے ہم نام کے لئے رکھتے ہیں۔ جب اس سے میری واقفیت ہوئی تو وہ ان چیزوں کا بھرپور مالک تھا جن کی لوگ اپنی زندگیوں میں تمنائیں کرتے رہتے ہیں یعنی دولت، شہرت، تخلیقی مشغلہ اور خوبصورت عورتیں لیکن وہ یہ کبھی نہ جان سکا کہ ان چاروں میں سے کسی ایک سے بھی کیسے لطف اُٹھایا جاتا ہے۔

شہرت سے لطف اُٹھانے میں اس کی ناکامی تو میرے خیال میں اس کے لئے باعث نیک نامی ہے چونکہ دراصل اسے سڑکوں پر تنہا گھومنا پسند ہے اس لئے وہ شہرت سے مضطرب ہوتا ہے، صرف یہی نہیں اس کے علاوہ وہ اس کے معنی سے بھی بدگمان ہے۔ اس کے جیسے شاہانہ مذاق کا آدمی اگر بڑے خاندان میں پیدا ہوتا تو وہ عوام کا دلدادہ ہوتا اور ان کی تعریفوں پر بھروسہ کر کے ان سے لطف و سرور حاصل کرتا۔ لیکن چارلی عوام کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں وہ خلوص اور استقلال کے ساتھ

تعداد سے غیر متاثر رہتا ہے۔ اگر عالمگیر مقبولیت اور چند ایسے لوگوں کی ستائش کے درمیان اسے انتخاب کا موقع دیا جاتا جن کی رائے کی وہ عزت کرتا ہے تو میرا یقین ہے کہ وہ قطب نما کی سوئی کے فطری فعل کی طرح آخر الذکر کی جانب جھکتا۔

ایک دن جب وہ مجھ سے ملنے کروٹن ( Croton. ) آیا تو میں اپنی کھلی فورڈ کار موڈل ٹی میں اسے شہر لے گیا۔ یہ موٹر کار ماضی میں اچھی حالت میں رہ چکی تھی۔ نیز خاموش اور پُرامن زمانہ دیکھ چکی تھی۔ میں نے اسے ایک چائلڈس ریسٹوران کے سامنے براڈوے کے قریب روکا اور ہم ریستوران کے اندر کچھ تلی ہوئی ٹکیاں اور دودھ پینے کے لئے گئے۔ اگرچہ ہم کمرہ میں ایک طرف جا کر بیٹھے لیکن تھوڑی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ بڑی کھڑکی میں جھانکنے والے بہت سے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ میں نے چارلی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کیونکہ میری زبردست انانیت کے نزدیک اس کا یہ امتیازی وصف مشکل سے قابلِ یقین تھا۔ اول وہ پریشانی کی حالت میں ہنستا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور کھڑکی کی جانب اپنی پشت کر لی اور اس نے کہا "میرے کاروبار میں اگر ایک تلی ہوئی ٹکیہ بھی لطف کے ساتھ کھانا ہو تو اس سے پیشتر قلعہ بندی ضروری ہے"۔

ہم نے خورد و نوش جلد ختم کر دی اور موٹر کار پر چلے گئے۔ میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ وہ پرانی فورڈ میری ہر مزاجی کیفیت کے مطابق کام کرتی تھی۔ اگر میں اتفاق سے کسی قدر پریشان ہوتا یا جلدی میں ہوتا تھا تو وہ موٹر کار لازماً کوئی کارآمد ڈاٹ ( Spark Plug. ) جلا دیتی یا کوئی جوڑ ڈھیلا کر دیتی تھی۔ ہم اب وہاں کار کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے اور تکلیف وہ طور پر فٹ پاتھ کے

سامنے تھے اور مجمع مسلسل بڑھ رہا تھا اور کار "ہیلو چارلی!" "واہ رے چارلی" "اس کے پاس جاؤ چارلی!" اس میں گیس بھرو چارلی،" کے نعروں کے جواب میں شور مچا رہی تھی اور جھٹکے کھا رہی تھی۔ چارلی یہ سب خوش مزاجی کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ لیکن جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو اس نے اتنی تلخی سے اس مجمع پر لعنت ملامت کی کہ میں حیرت زدہ ہو گیا۔

میں نے کہا "یہ لعنت ملامت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ تمھیں ان کی محبّت کو پسند کرنا چاہیئے۔" اس نے جواب دیا "یہ محبّت نہیں ہے۔ یہ انانیت ہے۔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی میرا خیال ذرا بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ خیال کرتے تو مجھے پریشان نہ کرتے، وہ اپنے بارے میں خیال کر رہے تھے۔ وہ اس بات پر فخر محسوس کر رہے تھے کہ اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ جا کر اس کے متعلق شیخی بگھار سکتے تھے۔"

جب وہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے مجھے بتایا کہ لندن کے مجموں کا برتاؤ اس سے کتنا مختلف تھا۔ اس نے کہا "جب میں ایسٹ اینڈ ( East End, ) میں اپنی پرانی جگہوں کو دیکھنے کے لئے گیا تو لوگوں کو اس کی خبر ہو گئی اور باقاعدہ ایک مجمع اکٹھا ہو گیا، لیکن وہ ہمیشہ اتنے دور رہے کہ میرے اور ان کے درمیان سو فٹ کا فاصلہ باقی رہتا تھا۔ وہ خاموش رہتے تھے یا آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے کبھی مخاطب نہیں کیا۔ انھوں نے مجھے یہ احساس دلا دیا کہ وہ مجھ سے محبّت کرتے تھے۔ لیکن یہ نیویارک کے لوگ ایسے نہیں ہیں میں انھیں جانتا ہوں!"

حسب معمول اس نے ایک پوشیدہ حقیقت کو سمجھ لیا تھا اور اسے کھود کر نکال لیا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بہت سے لوگ اپنی آسودہ خاطری کے لئے اس حقیقت کو مدفون رکھنے دینا ہی پسند کریں گے۔ مارک ٹوئین (Mark Twain.) بھی لوگوں کے بارے میں اسی طرح کا صحیح احساس رکھتا تھا لیکن اس نے اس بچوں جیسی مسرت کو جو اس کی مقبولیت سے اسے حاصل ہوتی تھی کبھی برباد نہیں کیا۔

چارلی کا اپنے پیسے سے لطف نہ اٹھانا نقائص سے اتنا پاک نہ تھا۔ یہ عیب خالصتاً اس کے محروم بچپن کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک اسٹوڈیو چلانے کے کثیر اخراجات کے تصوّر سے اتنا دبا ہوا تھا کہ اس سے کہیں زیادہ کثیر آمدنی کے باوجود جو اسے اس کی تصویروں اور ہنڈیوں سے حاصل ہوتی تھی وہ ہمیشہ اپنے آپ کو کم استطاعت خیال کرتا تھا۔ اسے جو یکایک دولت حاصل ہو گئی تھی اس کا پورا افسانہ اس غمگین بچّہ کی گرفت سے باہر تھا۔ ان کے تخیل میں صرف اخراجات کا پہلو رہتا تھا جس سے وہ اس افسانہ کی جسامت کا اندازہ لگاتا تھا۔ اس لئے روپیہ دینے میں یا رکھنے میں یا خرچ کرنے میں اسے کوئی لطف محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ ایک بدنصیبی تھی لیکن اس کی بدولت کم از کم عام لوگوں سے اس کا تعلق بحال رہتا تھا!

ایک دوسری چیز جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ چارلی ان سے مناسب طریقہ پر لطف اُٹھانا نہ جانتا تھا وہ لڑکیاں تھیں۔ اس کی زندگی میں لڑکیوں کا بھی ایسا ہی اہم مقام تھا جیسا کہ ڈالروں کا۔ لیکن ان کی طرف سے

وہ اور بھی زیادہ متفکر رہتا تھا۔ یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ وہ تعداد میں زیادہ نہ تھیں۔ لیکن لڑکیاں قسمتی سے ڈالروں کی طرح سب یکساں نہیں ہوتیں۔ ان میں عجیب عجیب قسم کی امتیازی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے حسن سے اثر پذیری بادِ مراد کی طرح کوئی مسلسل اور پائدار محرک نہیں ہوتی جس کے پیشِ نظر کوئی خاص لائحہ عمل مقرر کیا جاسکے اور کسی معینہ مقصد پر پہونچنے کی اُمید کی جاسکے۔ وہ مخالف ہواؤں کا ایک مستقل منبع ہوتی ہیں، کبھی تبدل پذیر یکایک آنے والے جھونکے کبھی آندھیاں کبھی موجیں کبھی فتنہ انگیز طوفان کبھی طوفانی ہوائیں اور کبھی طوفان بادوباراں جس کی وجہ سے انسان کا اصولی کردار ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔

ہر وہ عوامی شخصیت جو محبّت میں خوشی حاصل کرنے کے مسئلہ کو کچھ قوّت اور عزم کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتی ہے ایسی بے شمار بدنامیوں میں گھر جاتی ہے جن کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کا تعلق بدنامی کی باتیں گھڑنے والوں کی تشنہ شہوانی خواہشات سے ہوتا ہے۔ چارلی کے ساتھ رہنا میرے اندازے کے مطابق آسان نہ تھا، لارڈ بائرن یا کسی عکس نما (Keleidoscope) کے ساتھ رہنے کے مقابلہ میں زیادہ آسان نہ تھا۔ اس کا دوست بننے یا دوستی برقرار رکھنے کے لیئے جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں شروع ہی سے کافی سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی بعض دوست لڑکیاں یہ سمجھ رکھتی تھیں اور بعض نہ رکھتی تھیں، لیکن وہ سب ہر بات کو کھلی آنکھوں سے دیکھتی تھیں اور یہ رائے کہ عورتوں کے ساتھ چارلی کے برتاؤ میں کوئی بات غیر معمولی یا وحشیانہ اور

سنگ دلانہ تھی۔ محض عوام کی اختراع ہے اور اس کی نجی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ذاتی حقیقت جس سے چارلی کے ابتدائی ازدواجی حادثات کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بہت سادہ اور پرانی قسم کی ہے یعنی شاعرانہ تخیل رکھنے والے اشخاص کی محبت اکثر اندھی ہوتی ہے اور اگر ان لوگوں میں فہم و فراست بھی ہو تو تھوڑے عرصہ کے بعد محبت کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اکثر یہ بصیرت یکایک پیدا ہو جاتی ہے اور اپنی محبوب شے کو دیکھتی ہے۔

ایک مرتبہ میں نے چارلی سے اس کی ایک مشہور محبوبہ کے بارے میں جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا سوال کیا تو اس نے جواب دیا "میرا خیال تھا کہ وہ ملکوتی، قدرتی اور اصلی شخصیت رکھتی تھی، لیکن میں نے تجربہ کے بعد یہ پایا کہ وہ محض بھونڈی اور غیر مہذب تھی۔"

یہ بات اس شخص کے انداز میں کہی گئی جس نے ایک فاؤنٹین پین پانچ اور دس سینٹ کے اسٹور (کم حیثیت دوکان) سے خریدا ہو اور اسے اچھی طرح دیکھنے کے بعد پھینک دیا ہو۔ لیکن یہ ایک ایسے دماغ کی سنگ دلی تھی جسے حقیقت معلوم کرنے کا (خواہ کتنی ہی دیر سے ہو) شوق ہو۔ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ تجربہ اپنی زندگی میں ابدی رنگ میں رنگا ہوا تھا جیسے کہ اس قسم کے تجربے لاعلاج طور پر ہمیشہ ہوتے ہیں۔

غیر موزوں شادی کرنے والی بیویوں میں بہت کم ایسی ہونگی جو عدالت میں طلاق کے لئے نہ جاتی ہوں اور وہاں وہ تمام بدترین واقعات بیان کر کے جو وہ یاد رکھ سکتی ہیں ایک مرد کو بندر کے درجے پر نہ پہنچا دیتی ہوں

اسی طرح غیر موزوں شادی کرنے والے شوہروں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو اس کا جواب نہ دے سکتے ہوں اگر وہ جواب دینا پسند کریں۔ ہم ان طریقوں پر گفتگو کر رہے جن میں چارلی دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو سادہ طور پر بیان کریں تو کہیں گے کہ وہ لاعلاج طور پر رومانی (تخئیل پسند) تھا۔ وہ عورتوں کے حسن اور دل فریبیوں سے ایسا ہی متاثر ہوتا تھا جیسے ٹام مُور یا رابرٹ برنس ہوتے تھے اور جب عورت میں یہ چیزیں پائی جاتی تھیں اس کی پرستاری بھی ان ہی کی طرح بہت زیادہ کرتا تھا۔ لڑکیوں کے متعلق غنائی جوشِ مسرت پیدا کرنے میں اسے دراصل قدرتی طور پر مہارت حاصل تھی۔ ساتھ ہی اسے ایک دوست اور ساتھی عورت کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ نہ صرف اس کے حسیات کے بلکہ عقل و ہوش کے ساتھی کی۔

قدیم مستند طریقِ کار اور اگر دور کی مثال لیں تو وہ طریقِ کار جو جارج نے مارتھا واشنگٹن کے معاملہ میں اختیار کیا تھا جس میں مارتھا کی صفتوں اور مراتب کی فہرستیں بنائی گئیں تھیں اور ان کی رو سے جب اسے رفیقِ حیات بننے کے لئے موزوں سمجھا گیا تو رفیقِ حیات بنایا گیا تھا۔ کبھی چارلی کی سمجھ میں نہیں آیا وہ مختلف زمانے اور مختلف طرزِ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کو ایک سانچہ میں اس طرح نہیں ڈھال سکتا تھا جس طرح وہ اپنی پکچر کو ڈھالتا ہے اور تجزیہ کے لئے اس کے مرکزی مسئلہ کو "صاحبِ فہم دماغ" کے سامنے لاتا ہے اصل زندگی میں اس نے اس خوش گوار پہلو کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ بات اس کے اندر تھی ہی نہیں (کم از کم جب میں نے اس سے ملاقات کی تھی) کہ

عورتوں کے متعلق وہ اپنا دماغ استعمال کرے۔

اور یہ صورتِ حال اس واقعہ سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتی تھی کہ (اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں) وہ اس حقیقت کو جانتا تھا۔ وہ پورے سلسلۂ عمل کو اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی سمجھ لیتا تھا اور (افسوس) بے چارگی اور مجردانہ بے تعلقی کے ساتھ اس عمل کے مختلف مرحلوں کو وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتا جاتا تھا۔ یہ چیز اس کی پرستاری کے نخچیروں کے لیئے یقیناً صبر آزما ہوتی ہوگی۔

چارلی جب وہ بالکل نوجوان تھا اور اس کے بعد بھی بہت عرصہ تک ایک خوبصورت لڑکی سے جس کا نام ہیٹی ( Hetty ) تھا محبت کرتا رہا تھا۔ ہیٹی اس تھیئٹر میں کام کرتی تھی جس میں چارلی پہلی مرتبہ اسٹیج پر آیا تھا۔ وہ امریکہ اس لیئے آیا کہ (اپنی کیفیت مزاج کی بعض حالتوں میں وہ اس کا اقرار کر لیتا تھا) ہیٹی پہلے ہی یہاں آنے کے لیئے بُک ہو چکی تھی۔ لیکن جب وہ آئی تو وہ اس سے ملنے نہ گیا۔ وہ صرف اس کے بارے میں خیال آرائی کرتا رہتا تھا۔ وہ اس امر کا یقین نہ کر سکا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی (کیونکہ اس میں کافی خودی نہ تھی) اس نے ہیٹی کو اپنے دائرہ اثر سے اپنی ذات پر اعتماد نہ رکھنے کے باعث نکل جانے دیا۔ عام طور پر ایسے ہی مشہور ہے اور جب وہ کئی سال کے بعد لندن گیا تب بھی وہ ہیٹی کا احساس اپنے دل میں لیئے ہوئے تھا اور اب بھی اپنے سینہ میں اس کے ملنے کی ایک دُھندلی لیکن محبت آمیز مشکوک اُمید رکھتا تھا۔ لیکن وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ وہ فوت ہو چکی تھی۔ وہ اس کا فوٹوگراف اپنے ساتھ گھر لایا۔

جب اس نے شرماتے ہوئے وہ فوٹو مجھے دکھایا تو کہا یہ کچھ نہ تھا۔ وہ ایک قابل پرستش مورت تھی۔ اس وقت میں لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا۔" اس گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کی زندگی میں بیٹی بڑی اہم شے تھی۔

اب بھی میرا یہ گمان ہے کہ مذکورہ بالا کہانی میں اعتمادِ نفس کی کمی اور تحفظِ نفس کے احساس کی شدّت کا بڑا دخل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بیٹی سے بے انتہا محبّت تھی۔ اسے اب بھی یہ احساس تھا کہ وہ ایک قابل پرستش شے تھی۔ لیکن وہ اس کی ذات سے خوف زدہ تھا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے اس لڑکی کو حاصل کرلیا تو اپنی تخئیل پرستی ضائع کردے گا۔

اس کی یہ مبالغہ آمیز دور اندیشی یعنی اس چیز سے جو حاصل ہوگئی ہو چپکے رہنے کی ڈرپوک اور پر احتیاط خواہش ہی اس بات کا سبب تھی کہ چارلی نے اپنے تخلیقی فن سے پورے طور پر لطف نہیں اُٹھایا یا یوں کہئیے کہ اس سے لطف اُٹھانے کے بے مثل موقع سے مکمل طور پر متمتع نہ ہوا۔ اس کا اسٹوڈیو زیادہ وقت تک ایسا خاموش رہتا تھا جیسے کوئی قبرستان ہو۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ اس میں قوت یا ایجاد کے مادے یا سرمایہ کی کمی تھی جس کے ذریعہ سے اس کے اسٹوڈیو کے اندر تجرباتی حیرت خیز واقعات کا ہنگامہ پیدا ہوسکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی اس میں بے فکری اور بے پروائی کی کمی تھی فراخ دلی اور بے پروائی کی ایک اچھی مقدار اگر اسکے خون میں داخل کی جاسکتی تو اس سے اس کی حالت میں بڑا فرق پڑ جاتا۔

اگر یہ سچ ہے جیسا کہ الیگزنڈر وولکاٹ نے دل کڑا کر کے کہدیا ہے کہ پچرہ پر دکھائی جانیوالی

نے دل کڑا کرکے کہہ دیا ہے کہ پردہ پر دکھائی جانے والی ایک چھوٹی سی بے آواز تخلیق کے ذریعہ سے چارلی چپلن دُنیا میں سب سے اعلےٰ فن کار بن گیا تو یہ کہنا فضول گوئی نہ ہوگی کہ اگر وہ کوئی بڑا گروہ اپنے ساتھ جمع کرلیتا اور فنا عزانہ اور مالی اعتبار سے نیز ذہنی اعتبار سے آسان روی اختیار کرلیتا، بکس آفس کو بھول جاتا اور متحرک پکچر کی صنعت سے بالکل قطع تعلق کرلیتا تو وہ تاریخ کے اعلیٰ ترین فن کاروں میں سے ایک ہو جاتا۔ وہ "مولیر" (Moliere, ) اور "ایرسٹوفینیس (Aristophanes. ) کا مدمقابل ہو جاتا اور اس کے علاوہ اس کی زندگی خوش گوار گزرتی۔

اس میں کتنا چارلی کا قصور ہے کتنا ہالی وڈ کا یا امریکہ کا یا بیسویں صدی کا یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ میں صرف اس قدر جانتا ہوں کہ میں نے اسے کچھ چیزیں بناتے ہوئے اس وقت دیکھا جب کہ وہ یہ تقریر کرتا جاتا تھا کہ اگر تیاری کی لاگت کا سوال درمیان میں حائل نہ ہوتا، اگر پبلک جاہل نہ ہوتی اگر تجربہ کے خطرات نہ ہوتے۔ احتساب کی دُشواریاں نہ ہوتیں یا کوئی دوسری ایسی ہی شرط نہ ہوتی جو دُنیا کے بہترین فن کار کو مستقل طور پر مفلوج کردے تو جدید سینما میں کیا کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ چیزیں ایسی تھیں کہ اگر انھیں پردہ پر لایا جاتا تو وہ لوگوں کی آنکھوں نیز ان کے دماغوں کو ایسا ہی چوکنا اور حیرت زدہ کر دیتیں جیسا کہ اس کے پہلی مرتبہ اسٹیج پر آنے نے کیا تھا۔ کردار ادا کرنے کے خالص فن میں اسے بیباکانہ ایجاد کا ملکہ اور ہمہ جہتی کمال بلکہ عالمگیر کمال حاصل ہے۔ اس کی طربیہ نقلیں جنھیں پردہ پر لایا گیا ہے اس کے مذکورہ کمالات کو

محض اشارۃً ظاہر کرتی ہیں۔

میرا خیال ہے اس معاملہ میں ہم سب ہی قصوروار ہیں، چارلی، ہالی وڈ بیسویں صدی اور امریکہ، سب سے زیادہ امریکہ کیونکہ چارلی چیپلن دراصل امریکی ظرافت نگار ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کے کچھ سال لندن میں ضرور گزرے جہاں ڈانس سیکھ کر اور ایکٹنگ کے ذریعے اس نے افلاس کی مصیبت سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن جہاں اس نے فن کو وہ ترقی دی اور کرداروں کا ایسا تصور پیش کیا جس نے اسے شہرۂ آفاق بنادیا وہ امریکی اسٹیڈیو ہی کی ناہموار جمہوریت پسند، سرمایہ پرست اور جذباتی طور پر دوستانہ فضا تھی۔

اس کا ایک امریکی شہری نہ بننا جس کے بارے میں حال ہی میں اتنا شور و غل مچایا گیا ہے اس وجہ سے تھا کہ وہ سیاسی اداروں کی پروانہ کرتا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ ایک ادارے کو دوسرے پر ترجیح دیتا تھا۔ اگر وہ امریکہ میں پیدا ہوتا اور اس نے انگلینڈ میں اپنے پیشہ کی تعمیر و توسیع کی ہوتی تو وہ برطانوی شہری بننے کی فکر نہ کرتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے شاید صرف فن کار اور انارکسٹ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "بلاشبہ میں دراصل امریکی ہوں۔" (اور میں نے یہ لکھ لیا) میرے احساسات امریکی ہیں برطانوی نہیں ہیں۔ یہی خاص چیز ہے۔"

اب اس کے احساسات کیا ہونگے میں یہ قیاس نہیں کر سکتا، اور لوزان میں جو ہماری مختصر سی ملاقات ہوئی اس کے دوران میں نے اس بات کو دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دنیا آج کل سیاسی اعتبار سے اتنی زیادہ کشمکش میں ہے کہ کچھ

وقت گزر جانے کے بعد پرانے دوست بھی باہم محتاط انداز میں ملتے ہیں۔ مجھے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یک جماعتی طاقتوں کے حامیوں کے ساتھ خواہ وہ فاشسٹ ہوں یا کمیونسٹ میں غیر محتاط طور پر ملنا پسند نہ کروں گا۔ لیکن میں چارلی کو اتنے عرصہ سے اور اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں اسے اس قسم کا حامی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ کسی کا شریک بننے والا شخص نہیں ہے، نہ اس کا کردار اتنا قوی ہے اور نہ اعتقاد اتنا راسخ کہ وہ کسی سازش میں حصہ لے کر کام کر سکے۔ وہ عموماً ادنیٰ مزدور بننا پسند کرتا ہے یا اس کا اہل ہے۔ اس نے ان غلط بیانیوں کے ایک بڑے حصّہ کو جو کہ یہ ثابت کرنے کے لئے گھڑی جاتی ہیں کہ کریملن (روسی حکمران جماعت) کے مالدار عہدہ داروں کا نیا لوٹ کھسوٹ کرنے والا بے رحم طبقہ ادنیٰ مزدور طبقہ ہے یا اس کی نمائندگی کرتا ہے الہامی حقائق کی طرح صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ وہ اس سے زیادہ ہوشیار معلوم ہوا کرتا تھا۔ درحقیقت ہالی وڈ کے پرانے زمانہ میں فریب خوردہ تو میں تھا۔ یقیناً میں نے اسٹیلن ازم سے دھوکا نہیں کھایا تھا لیکن لینن اور ٹراٹسکی کے مسلک سے ضرور متاثر ہوا تھا اور وہ اس وقت محتاط متشکک تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ہم اتفاق سے نیویارک کی گلیوں میں ایک دوسرے سے ملے اور ہم نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا تو میں نے اسے حالیہ سیاسی زندگی کے واقعات سے اتنا ناواقف پایا کہ گویا وہ ابھی پیدا ہوا تھا۔ سرد جنگ سے متعلق پامال جملے چارلی کی زبان سے ضرور نکل رہے تھے۔ کچھ وقت تک اس کی مسلسل گفتگو کے دھارے کو میں نے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ کوشش اس وقت ترک کر دی جب اس نے پرزور طور پر

ظاہر کیا کہ اس پر "ولدیت" (Paternity,) کے مشہور مقدمہ میں اس لئے ظلم کیا گیا تھا کہ امریکہ فاشسٹ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی فلم "دی گریٹ ڈکٹیٹر" میں ہٹلر پر حملہ کیا تھا"۔

میں نے کہا "اگر تمہاری رائے دراصل یہی ہے تو ہمیں سیاست پر گفتگو ہی نہ کرنی چاہیئے کیونکہ میرے نزدیک یہ بات مجنونانہ ہے"۔ اس نے اس سے اتفاق کیا اور ہم نے وہ شام پرانی یادوں کے تذکرے اور فلسفیانہ گفتگو میں صرف کی۔ اس طرح یہ سمجھوتہ میرے لوزان پہونچنے سے پیشتر ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ چارلی چاؤ این لائی (Chou En Lias,) سے دکھاوے کی محبت کے مظاہرے کرتا تھا تو میں نے اس پر سنجیدگی سے توجہ کرنے کو ضروری محسوس نہ کیا۔ اس کے بارے میں میرے احساسات (اور میرے خیال میں خاص امریکہ کے احساسات) بہت نفاست کے ساتھ نیویارک ٹائمس کے ۵ جون ۱۹۵۴ء کے اداریہ میں ظاہر کئے گئے تھے جب کہ اس نے کمیونسٹوں کی منعقد کردہ عالمی امن کونسل کے "امن کے انعام" کو قبول کر لیا تھا۔

"اگر وہ روس کے بارے میں زیادہ علم رکھتا یا اگر کم تلخ گو ہوتا تو چارلی چپلن کو اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ "امن کا انعام" دراصل امن کا انعام ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ وہ انعام ان لوگوں کو پیش کیا جاتا ہے جو ایک وحشیانہ اور ظالمانہ شہنشاہیت کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں مدد دیتے ہیں۔ چارلی چپلن نے ایک مرتبہ بیان کیا تھا کہ اس کا عقیدہ "چھوٹے آدمی" کے لئے ہمدردی رکھنا تھا۔ اس کا حق ہے کہ اس کے پاس سر چھپانے کے لئے مکان ہو۔

روزی کمانے کے لیئے کام ہو اور وہ ایک خاندان کی پرورش کر سکے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے لیکن ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ چھوٹا آدمی جو اتنے پُر اثر انداز میں اور اتنی ظرافت لئے ہوئے اور اتنی بلند ذہانت کے ساتھ چیپلن کی اکثر فلموں میں گھومتا ہوا دکھایا جاتا ہے آج کل کے روس میں زندہ اور خوشحال نہیں رہ سکتا.....

اس نے ایک ناپاک سازش کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرے اور وہ چھوٹا آدمی ہی جس کا بیان اتنے پُر اثر طور پر اس نے کیا ہے اس سازش کا شکار بنایا گیا ہے. وہ چھوٹا آدمی جس کی اس نے کبھی وقت تصویر تیار کی تھی اور جس سے اب وہ جدا ہو گیا ہے کسی دن دُنیا میں آزادی سے اور بغیر کسی تکلیف کے زندگی بسر کرے گا۔ ابتدائی چیپلن فلموں کی یاد یا ان کی تجدید غالباً اس چھوٹے آدمی کو اس کی آزادی کی جدوجہد میں مدد دے گی لیکن چارلی چیپلن خواہ وہ اس سے واقف ہو یا نہ ہو اپنا راستہ چھوڑ کر دوسری سمت میں چلا گیا ہے۔ وہ بائیں جانب ماسکو کی طرف گھسٹتا ہوا جا رہا ہے اور شاید اسے احساس نہیں ہے کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ اور اغلباً وہ اپنے آپ کو کمیونسٹ یا ان کا ہم سفر نہیں کہتا لیکن وہ ادھر جا رہا ہے اور اس کی پشت کا جھکاؤ، اس کے کوٹ کا لٹکتا ہوا دامن، اس کے کانوں پر چھوٹی ڈربی ٹوپی کا جماؤ اور اس کی چھڑی کی بہت سی غمگین یادیں تازہ کرنے والی تیز جنبش ہمیں اتنا متاثر کرتی ہے کہ ہم تقریباً آنسو بہانے لگتے ہیں۔"

جتنا کہ اس "چھوٹے آدمی" سے جس کی تخلیق خود چارلی نے کی تھی چارلی کا

قطع تعلق کرنا تکلیف دہ ہے تقریباً اتنا ہی تکلیف دہ حکومت ریاست ہائے متحدہ کا وہ نازیبا برتاؤ ہے جو اس نے چارلی سے اس وقت کیا جب وہ ۱۹۵۳ء میں باہر گیا تھا۔ محکمۂ انصاف کو جب اس کے خلاف تفتیش یا کوئی کارروائی کرنے کی کوئی وجہ اس کے یہاں کے دوران قیام میں نہ ملی تو اس نے یہ کام محکمۂ تبدیل وطن کے سپرد کر دیا کہ جب وہ وطن واپس آنے کی درخواست کرے تو اسے روکا جائے۔ محکمۂ تبدیل وطن کا ایک ایجنٹ جب میرے پاس اس معاملہ کے لئے مواد کی تلاش میں آیا تو مجھے یہ خوش گوار موقع میسر آیا کہ میں نے اس عیارانہ کارروائی کے متعلق اس سے اپنے حساسات کا اظہار کیا۔ اس وقت کا انتظار کرنا کہ جب کوئی شخص وطن چھوڑ کر باہر جائے (خاص کر جب کہ وہ ایک عظیم اور ہر دلعزیز فن کار بھی ہو) اور تب دروازہ بند کر دینا اور اس سے کہنا کہ اب دیکھیں تم کیسے اندر آسکتے ہو؟ ایسی بات ہے جو مجھے امریکی حکومت کے مرتبہ سے گری ہوئی معلوم ہوئی۔ یہ کارروائی امریکی قوم کے جذبات کی ہرگز ترجمانی نہ کرتی تھی۔

اگرچہ یہ کارروائی ناقابل معافی تھی (اور چارلی کے خلاف کجروی کے متعلق بعض اتہام تراشی کے شائقین کا شور وغل جنون کی حد تک پہونچ گیا تھا) لیکن اس سے اس کے لئے اس امر کا جواز پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ اس بلند مقام سے جس پر وہ پہونچ چکا تھا نیچے اُتر آئے اور انتقامی پروپیگنڈے کی تصنیف وتالیف شروع کر دے۔ فرانس میں گزشتہ سال میں نے اس کا فلم "نیویارک میں ایک بادشاہ" (A King in New York.) دیکھا اور امریکی زندگی کی ان رسوم

پر جن کا ہم سب ان میں شرکت کے وقت مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایک یا دو[۲]
بے ساختہ پھبتیوں کو چھوڑ کر میں نے اس فلم کو اتنا بے مزہ اور بناوٹی پایا کہ
اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے یہ کام پورے دل سے
نہیں کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ فلم "لائم لائٹ (Limelight,) کے آخری
بیس منٹ جس میں قطعی سرور انگیز طربیہ کی آمیزش، سوز و گداز کے ساتھ نہیں کیونکہ
یہ تو پہلے کیا جا چکا تھا، بلکہ خود موت کی آخری المناکی کے ساتھ کی گئی ہے۔ ڈرامائی
فن کے عظیم ترین کارناموں میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ میں اسے اس بلند
مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ امریکی یا خلاف امریکی بن کر
رہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ اس کا رشتہ راستی اور نوع انسانی سے وابستہ
رہے جیسا کہ کبھی تھا۔

# جان ڈوی میرے اُستاد اور دوست

چونکہ یہ تذکرہ ڈوی کی سرگزشت زندگی کی شکل میں نہ کہ اس سے میری ملاقاتیں کے بیان کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس لئے یہ مناسب ہو گا کہ ہمارے باہمی روابط عام الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ میں نے کولمبیا میں تین سال تک اس سے تعلیم حاصل کی اور منطق اسکی نگرانی میں پڑھا تھا میرا کمرہ اس کے کمرہ سے ملا ہوا تھا اور دروازہ ہم دونوں کے درمیان عموماً کھلا رہتا تھا۔ پہلے سال کے دوران میں مَیں اس کے مکان پر ہر اتوار کو کھانا کھاتا تھا اور ہم سہ پہر اور اکثر شام بھی باہم بات چیت میں گزارتے تھے۔ دوسرے سال اس کے مقرر کرنے پر میں نے اس کے فلسفہ کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا میں نے اخلاقیات کی اس کتاب کے جو اس نے پروفیسر ٹفٹس ( Tufts, ) کے ساتھ مل کر لکھی تھی ابواب کی انگریزی پر نظر ثانی کرنے اور اس کے خیالات کے طریقۂ اظہار کو بہتر بنانے میں مدد دی۔ میں نے منطقی اصولوں پر اس کے لیکچروں کے کورس کو اور جدید فلسفہ پر ایک دوسرے کورس کو سُننے کے لیئے باقاعدہ حاضری دی۔ میں نے اپنا پی۔ ایچ، ڈی کے لئے لکھا ہوا مضمون "افلاطون کے اوصاف" ( The Quality of Plato, )

اس کے سامنے پیش کیا اور ہم نے اس پر کئی مرتبہ بحث کی۔ آخری مرتبہ ہماری بحث ۱۹۴۰ء میں ہوئی اور آخر میں ایک نوٹ بک لیئے ہوئے میں نے اس سے تین یا چار مرتبہ ملاقات کی۔ یہ ملاقاتیں اس تذکرہ کے لکھنے کی خاطر کی تھیں جب میں اس کا اور اس کے خیالات کی نشوونما کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا۔ اس کی لڑکی اور شریک کار ایولن" ( Evelyn, ) نے اس کا مسودہ پڑھا اور تبصروں اور تجویزوں سے میری مدد کی لیکن ڈوی نے خود اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اسے ایک باضابطہ سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا لیکن تمام وہ باتیں جو میں نے اس سے منسوب کی ہیں فوراً نوٹ بک میں لکھ لی گئیں تھیں اور انھیں لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔

جب میں نے اس دلچسپ کام کو ہاتھ میں لیا تو ڈوی کی عمر بیاسی سال کی ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی آواز میں ذرا بھی لرزش اور تحریر میں تھرتھراہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نووا اسکوٹیا ( Nova Scotia, ) میں جہاں وہ موسم گرما میں گیا تھا۔ اس نے سولہ جھیل کی گہرائیوں میں تیر کر وہاں کے لوگوں کو بے حد متعجب کیا۔ خود اس طرح تیر کر بچ نکلنے کے علاوہ ایک صبح اس نے مزید دو سو فٹ تیر کر اور بڑے سلیقے سے ایک ڈوبتی ہوئی عورت کو ڈوبنے سے بچا کر سب کو حیرت زدہ کر دیا۔ وقتاً فوقتاً سنٹرل پارک ویسٹ میں وہ شراب کی پارٹیاں منعقد کرتا تھا۔ اس میں ہر عمر، ہر مذہب، ہر رنگ اور ہر معاشرتی حیثیت کے اشخاص کا ایک رنگ برنگ مجمع اکٹھا ہوا کرتا تھا اور وہاں اخلاقی تہذیب کی عمر رسیدہ خواتین سے لے کر جدید مصوری کے بنیادی

نقوش کے عظیم مبصرین تک آیا کرتے تھے۔ ان پارٹیوں میں وہاں کے تمام لوگوں میں وہ ہمیشہ سب سے زیادہ پھرتیلا شخص معلوم ہوا کرتا تھا۔ اس دعوے میں بھی وہ سب سے آگے تھا کہ وہ ان سب کو پہچانتا تھا کہ وہ کون تھے اور سب کے پاس شراب کے پیالے لے جانے میں بھی سب سے زیادہ پھرتیلا تھا۔

جان ڈوی کو ایسا آدمی کہنا بالکل ٹھیک ہوگا جس نے ہمارے بچوں کو اکتاہٹ کی مہلک مصیبت سے بچالیا جس میں وہ اسکولوں میں مبتلا رہتے تھے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا نے اپنے تعلیم کے مضمون میں اس حقیقت کو بیان کرنے میں اختصار اور جامعیت سے کم کام لیا ہے۔ اس میں لکھا ہے "۱۹۰۰ء کے لگ بھگ مرکز کشش ثقل تعلیم کے نصاب سے ہٹ کر خود زیر تعلیم بچہ کی طرف آگیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں اسکول اب ایسی جگہ نہیں سمجھا جاتا تھا جہاں بچے زندگی کے لیئے تیاری کرتے تھے اب وہ ایسی جگہ ہوگیا تھا جہاں بچے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں جو زیادہ تر جان ڈوی کی تعلیم کے زیر اثر وجود میں آئی ہیں بیسویں صدی کے امریکی ابتدائی اسکولوں کے نمایاں مقاصد بن گئی ہیں۔" جان ڈوی کی شخصیت کا نصف حصہ تو یہ ہے دوسرا نصف حصہ اس کی اس حیثیت پر مشتمل ہے جو وہ بطور ایک اصل فلسفی کے رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی روزی اس قسم کے سوالوں پر بحث کے ذریعہ حاصل کرتا تھا جیسے کہ "ہم کیسے سوچتے ہیں"۔ اور "خیال ہماری ہستی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟"

پیرس کی یونیورسٹی نے ۱۹۳۰ء میں اسے ڈگری عطا کرتے ہوئے اس کے متعلق یہ کہا تھا "وہ امریکی فطانت کا عمیق ترین اور مکمل مظہر ہے"، اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا والدو فرینک نے اسے "سب سے زیادہ باا‌ثر امریکی" کہا تھا۔

اس درجہ اول کی شہرت کو دو باتیں حیرت انگیز بناتی ہیں۔ ایک یہ کہ ڈوی شہرت کی طرف سے نہایت تنک مزاجی اور ضد کے ساتھ بے پروائی برتتا تھا۔ اس نے کبھی مشہور ہونے کی خود کوئی کوشش نہیں کی اور جب اس کے مہربان دوستوں نے ایسی کوئی کوشش کرنے کا ارادہ کیا تو بھی اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ اس کے اسّی سالہ جشنِ سال گرہ پر اس کے اعزاز میں جو بڑے پیمانے پر ضیافت دی گئی اس میں اس نے شرکت نہیں کی اگرچہ دُنیا کے بعض ممتاز ترین شہری اس میں موجود تھے۔ اسے اس وقت اپنا وہ وعدہ یاد آگیا جو وہ اپنی لڑکی ایولن کے دیہاتی مکان پر مسوری کے شمال مغربی گوشہ میں پہنچنے کا پہلے ہی کر چکا تھا۔ یہ تمام باتیں ایک مرتبہ پہلے جب وہ ستر سال کا تھا کی جا چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے ایولن سے کہا "یہ سب مجھ سے دوبارہ برداشت نہیں ہوتا۔" دوسری چیز جس نے اس کی شہرت کو تعجب خیز بنا دیا یہ ہے کہ اس کی طبیعت میں نمائشی طمطراق کا فقدان تھا۔ اس نے چالیس کتابیں اور آٹھ سو پندرہ مضامین اور پمفلٹ شائع کرائے (یعنی ۱۲ فٹ، ۷ انچ اونچا انبار) لیکن اگر اس نے کبھی کوئی جملہ نقل کیے جانے کے قابل لکھا ہو تو وہ اس انبار میں مستقلاً گم ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ کہ خود اس کا طرز نگارش بے مزہ تھا بلکہ اس کی بے مزگی ہر اس شخص پر اثر انداز ہوتی تھی جو اس کے تعلیمی اصولوں پر کچھ

کہنا چاہیئے۔ ایک ایسی اصلاح کو جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ضرورت کی جس کے لیئے اسکول کو دوزخ بنایا جاتا تھا اور جس سے تیز دماغ بچے عرصہ سے واقف تھے ایک نمو یافتہ اور ترتیب دی ہوئی شکل تھی۔ تنظیم پرست معلّموں کی نہایت بے لطف زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ ظرافت یا شاعری کی چمک دمک کا اس میں کوئی نشان نہیں ملتا۔

شاید ڈوی کی پیدائش کا اس سے کچھ تعلق ہو۔ وہ کالون کولیج (Calvin Coolidge), Vermont, ) کی طرح ورمانٹ ( میں پیدا ہوا تھا اور جو کچھ اس کے دماغ میں گزر رہا ہے یا نہیں گزر رہا ہے اس کو اپنی ظاہری روش سے پوشیدہ رکھنے کی صفت اس میں بھی پیدائش سے موجود تھی۔ ورمانٹ کے باشندے خشک مزاج اور ضرورت سے کم بولنے والے ہیں۔ ان کی کم گوئی اتنی شدید ہوتی ہے کہ آپ یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ آیا وہ مذاق کر رہے ہیں یا غصّہ دلانے کی ناکامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ ڈوی نے اپنے تعلیمی نظریوں کی ڈائنامیٹ (انقلاب آفریں قوت) کو محض اپنی تفریح کی خاطر خشک گھاس کے ایک ڈھیر میں چھپا لیا ہو۔

اس کے والد معمولی طور پر ایک جوکر (مسخرے) کی حیثیت سے مشہور تھے وہ برلنگٹن ( Burlington, ) میں ایک اسٹور کھولے ہوئے تھے۔ اس قصبہ کی آبادی دس یا بارہ ہزار تھی اور وہ اس قصبہ کے ہر دوکان دار سے زیادہ سامان فروخت کر لیتے تھے۔ اس کا سبب ان کے کام کرنے کا انوکھا طریقہ تھا۔ اسٹور کے باہر ایک سائن بورڈ تھا۔ اس پر لکھا تھا "ہیم (سور کی ران جو دھوئیں میں

پکائی جاتی ہے) اور سگار۔ دھوئیں میں پکائی ہوئی اور نہ پی ہوئی ہے" اس سے خریداروں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ ان سے بہت زیادہ سنجیدگی کا برتاؤ نہ ہوگا۔ ایک پہیہ کے ٹھیلہ پر جسے وہ اکثر عاریتاً لے لیتے تھے بڑے سرخ حرفوں میں وہ یہ الفاظ نقش کر دیتے تھے۔ اے۔ ایس۔ ڈوی کے یہاں سے چرایا ہوا" اپنی عام مقبولیت کے باوجود اے۔ ایس۔ ڈوی کی کبھی بہت اچھی حالت نہیں ہوئی کیونکہ لوگوں سے بل ادا کرنے کے لئے کہنے سے ان کو تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ وہ ہکلاتے تھے اس لئے جب وہ روپیہ طلب کرتے تھے تو یہ ایک خاص قسم کا تمسخر معلوم ہوتا تھا۔

مسز اے، ایس، ڈوی (نام ارچیبالڈ اسپرگ ہے)، اسکوائر رچ ( Squire Rich, ) ساکن رچولے ( Richville, ) کی بیٹی تھی اور اس کا دادا کانگریس میں رہ چکا تھا، لیکن مال و دولت کے لحاظ سے رچ خاندان کچھ زیادہ اچھی حالت میں نہ تھا اور جان کے بچپن کے گھر کے کاروبار کو نہایت کفایت شعاری سے چلایا جاتا تھا۔ اگر اسے صرف کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی تھی تو اسے کمانا پڑتا تھا اور وہ یہ کمائی اسکول کے بعد اخبار تقسیم کر کے کرتا تھا (امریکی طرزِ زندگی کے مکمل اظہار کے لئے اس کا یہ عمل قطعی موزوں معلوم ہوتا ہے) اس کام سے اسے ایک ڈالر فی ہفتہ مل جاتا تھا، اور موسمِ گرما میں جب وہ چودہ سال کا ہو گیا تھا تو اسے ایک خاصا کام مل گیا۔ وہ ایک کباڑ خانہ میں حساب بہی کا کام کرتا تھا جس سے اسے چھ ڈالر فی ہفتہ حاصل ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اسے گھر کے مختلف قسم کے کام بھی

کرنے پڑتے تھے اور جب وہ کبھی دھوکا دیتا تھا تو اسے سزا دینے کے طور پر اس کے ضمیر سے اپیل کی جاتی تھی، یہ سزا اس کو پیٹے جانے کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔

اس کے والدین وہائٹ اسٹریٹ کے جماعتی گرجے سے تعلق رکھتے تھے باپ ایک مذہبی شخص تھا۔ زیادہ تر اس سبب سے کہ اس کے خلاف عمل کرنے کا اسے کبھی خیال ہی نہ آیا ہوگا۔ ماں کو مذہب سے کچھ زیادہ دلی تعلق تھا۔ اسکی پرورش ایسی فضا میں ہوئی تھی کہ وہ عالمگیریت کے عقیدہ کو مانتی تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پچاس یا ساٹھ ہزار ایسے عیسائیوں میں سے تھی جو اپنی رحم دلی کی بنا پر یہ یقین کرتے تھے کہ ہم سب نجات پائیں گے۔ یہ عقیدہ کالون ( Calvin, ) کے اس عقیدہ سے کہ ہم خدا کے منتخب بندے ہیں بہت مختلف تھا۔ کالون کے اس عقیدہ کو نیو انگلینڈ کو کمینہ خصلت اور امارت پرست بنانے میں بڑا دخل تھا۔ اپنی نوجوانی میں اس نے احیائے مذہب سے متعلق جلسوں میں شرکت کی تھی اور اس کے بیٹے کے اصل الفاظ میں "وہ جذبات کے اعتبار سے شدید مضمحل اور زاہد خشک نہ تھی لیکن خاصی پابند اخلاق تھی"۔ سستے ناول پڑھنا اور مستقلاً انٹے کھیلنا منافی اخلاق نہ تھا۔ جان ڈیوی ہنٹے (تاش کا ایک کھیل) کا ایک بہترین کھلاڑی تھا اور میری رائے میں وہ پوکر (تاش کا ایک کھیل) میں اور بھی زیادہ ہوشیار ثابت ہو سکتا تھا، لیکن ناچنے میں وہ اتنا ہوشیار نہ تھا۔

جان ڈیوی کی ابتدائی زندگی اور حالات تکلیف دہ طور پر یا آپ چاہیں

تو کہہ سکتے ہیں تقدیری طور پر اوسط معیار کے تھے۔ وہ چیپلن جھیل میں تیرتا اور اسکیٹنگ کرتا تھا لیکن زیادہ اچھی طرح نہیں۔ وہ کھیل پسند کرتا تھا۔ لیکن بازی کے کھیلوں میں کوئی خاص درجہ نہ رکھتا تھا۔ میرے خیال میں مقابلہ میں کافی تیز نہیں تھا۔ وہ بہت پڑھنے والا تھا لیکن مقررّہ اسباق پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتا تھا۔ اسکول کے اوقات میں وہ کافی محنت کرتا تھا لیکن یہ صرف اس لیے کہ وہ نصاب کی کتابیں گھر لے جانا نہ چاہتا تھا گاؤں کی لائبریری میں اسے ایسی کتابیں ملتی تھیں جن کو وہ زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس نے گرامر اسکول اور ہائی اسکول کے مرحلے جلد طے کر لئے لیکن زیادہ اونچے نمبر حاصل نہیں کئے، لوگوں پر اس کی خوش مزاجی اور بے غرضی کا بمقابلہ اس کی دماغی قوت کے زیادہ اثر تھا۔

ڈوی کا خیال تھا کہ شاید وہ کالج میں نہ جا سکتا تھا اگر قریب ہی برلنگٹن میں کالج نہ ہوتا جہاں وہ آسانی سے داخل ہو گیا۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ وہ ورمانٹ یونیورسٹی میں پندرہ سال کی عمر میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی لیکن اس پر کسی نے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا اور سب سے کم اس نے اسے قابل اعتنا سمجھا۔ کالج کے پہلے تین سال بھی اس نے کامیابی کے ساتھ گزار دیئے لیکن ان میں بھی جولانی طبع کے شرارے نمودار نہ ہوئے جن سے اس کے مستقبل کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی۔ اس قدر ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ کوئی کاریگر نہ بنے گا، اور اس امر کا یقین آپ کو فوراً اس وقت ہو جاتا جب آپ اسے کوئی کیبل گاڑتے ہوئے دیکھتے۔ اس نے

گرجا میں اپنے کالج کے دوسرے سال میں شرکت کرنا شروع کر دی۔ اس نے پرخلوص مذہبی جذبہ کے ساتھ ایسا کیا لیکن اس پر تبدیلیٔ عقائد کا گہرا اثر نمودار نہ ہوا۔ وہ ایک نیک لڑکا تھا اور برابر بہتر بننے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ خدا اس کی مدد کرے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

وہ بہرحال ایسے لڑکے کے باطنی نور کے ذریعے بہتر بن رہا تھا جس کی جنسی زندگی تقریباً مکمل طور پر پاکیزہ رہی ہو۔ وہ اندرونی طور پر اتنا شرمیلا تھا کہ کسی لڑکی سے محبت کرنے کا خیال بھی اس کو نہ آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "میں جب انیس سال کا تھا تو کچھ معاملہ اپنی چچازاد بہن کے ساتھ میں نے پیدا کرنا چاہا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ کرنا ضرور چاہیئے لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ میں بہت ہی جھینپو تھا بلکہ غیر معمولی طور پر۔"

اس حقیقت اور اس کی ماں کی اخلاقی تعلیمات نے مل کر جان ڈوی کو اس قابل بنا دیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی سنڈے اسکول کے ایک فرشتہ صفت اُستاد کی حیثیت سے شروع کی۔ وہ وہائٹ اسٹریٹ کے مذہب کے بعض عقائد کو معتدل انداز میں زیر بحث لاتا تھا۔ ایک اتوار کو عین عبادت کے دوران اس کے ذہن میں بہ تکلیف وہ سوال آیا "یہ عبادت وغیرہ کیا رسمی چیز نہیں ہے؟" اس سوال نے اسے بہت زیادہ اور کافی عرصہ تک پریشان رکھا، لیکن نیک بننے کی عظیم اہمیت کے بارے میں کبھی اس کے دل میں شک پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ اپنی حیاداری کی صفت کی بدولت اس نے نہ صرف

دوسروں کو نیک بننا سکھایا بلکہ خود بھی نیک بن گیا۔

اس کے جونیر سال کے اختتام کے قریب ایک واقعہ پیش آیا جس نے ترقی کی اس پرسکون روش کو درہم برہم کر دیا۔ اے۔ جان ڈوی کی زندگی کا عظیم بحران یا نقطۂ انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ آپ کی یا میری زندگی میں ایک بحران نہ ہوتا لیکن ہمیں پیرس کی یونیورسٹی سے یہ ڈگری بھی نہ ملتی کہ ہم امریکی فطانت کے عمیق ترین مظہر ہیں۔ یہ بحران علم عضویات کی ایک نصابی کتاب مصنفہ طامس ہنری ہکسلے کی بدولت نمودار ہوا۔ ڈارون کے اس ذہین شاگرد سے جو اس وقت اصولِ ارتقا کیلئے صحیفۂ مقدس (انجیل) کی "ناقابل فسخ چٹان" کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا۔ اس اتفاقیہ ملاقات نے جان ڈوی کو دُنیا کو سمجھنے کی کوشش کے نہایت نظرفریب جذبہ سے آگاہ کر دیا۔ اس نے ڈوی کو ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار کر دیا کیونکہ جب اس نے انسان کے جسم و دماغ کے کام کرنے کے طریقوں سے متعلق ہکسلے کی معروضی تشریحات کو پڑھا تو ڈوی کو یہ محسوس ہوا کہ وہ اس دُنیا سے جس میں بحیثیت وہائٹ اسٹریٹ سنڈے اسکول ٹیچر کے وہ لڑکوں کو نیک بننے کی تلقین کیا کرتا تھا بالکل مختلف دُنیا میں پہونچ گیا ہے۔ اس نے ہکسلے کی دُنیا کو ہیجان انگیز پایا ہے۔ وہ سائنسی علم کی وجد انگیزی کے دھارے میں بہہ گیا۔ لیکن پرانا اخلاق پرستانہ انداز اتنا وزن رکھتا تھا کہ وہ اپنی جگہ قائم رہا۔ وہ یہ خیال نہ چھوڑ سکا کہ انسانی زندگی اخلاقی عزم اور غور و فکر سے بنائی جا سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس سے بھی انکار نہ کر سکا کہ ہکسلے کی تشریحات کے مطابق مادی قوتوں نے بھی اس کی تشکیل کی ہے۔ اس موقع پر ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ کوئی ایسی جدائی، خلا، کوئی نہایت منحوس شگاف تھا جس پر یہ دبلا پتلا، نرم مزاج، شرمیلا، سیاہ چشم لڑکا ایسے عمیق انداز میں تاسف کر رہا تھا جیسے اکثر لڑکے اس جدا کرنے والی خلیج پر کرتے ہیں جو ان کے اور ان کی بہترین محبوبہ کے درمیان حائل ہو گئی ہو۔

اس کے نتیجہ میں کالج کے سینیر سال میں اس کی کوشش اور مہم جوئی بہت تیز و تند رہی۔ وہ اپنی تعلیم میں دل و جان سے غوطہ زن ہو گیا۔ وہ بہت رات گئے تک پڑھتا اور محنت کرتا تھا۔ اس نے فلسفہ میں نہایت اونچے نمبروں کا ریکارڈ قایم کیا اور کلاس میں اس کا نام سرفہرست رہا۔ بعض اوقات اس کے کلاس کے ساتھیوں کو یہ احساس ہوتا تھا کہ جب وہ کسی سوال کا جواب دیتا ہے تو اپنا سبق پروفیسر کو اعتماد نفس کے ساتھ نہیں سمجھاتا۔ اس سال کے ختم ہونے تک ڈوی کے خاندان کو اس کی بہت کم امید رہ گئی تھی کہ ڈوی ایک فلسفہ داں بننے کے سوا کوئی اور کارآمد کام کرنے کے قابل بھی ہو گا۔ سوال یہ تھا کہ آپ ایک انیس سالہ فلسفہ داں سے کیا کام لے سکتے ہیں؟ اور کاشتکاروں کی اس مختصر جماعت میں کوئی شخص اس سوال کا معقول جواب نہ دے سکتا تھا اور خود جان شاید اس کا بالکل کوئی جواب نہ دے سکتا تھا۔

اس سوال کے عارضی حل کے طور پر جان "آئل سٹی"، (oil city) پنسلوینیا چلا گیا اور وہاں ایک ہائی اسکول میں جو اس کی ایک چچازاد بہن چلا رہی تھی تعلیم دینا شروع کر دی اور چالیس ڈالر ماہانہ کمانے لگا۔ "ڈولالوں" نے جو اسی بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے اسے کچھ اور روپیہ قرض لینے اور اسے شہر

کے جدید ترین ولولہ خیز کام میں یعنی اسٹینڈرڈ آئل میں بطور سرمایہ لگانے کی ترغیب دی۔ اس کے بجائے اس نے کتابیں عاریتاً حاصل کیں اور تیل ایک لیمپ میں استعمال کیا۔

ایک شام کو جبکہ وہ بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا اسے ایک واقعہ پیش آیا جسے وہ پُر اسرار تجربہ کہتا ہے۔ یہ اس سوال کا جواب تھا جو اب تک اسے پریشان کررہا تھا یعنی جب وہ عبادت کرتا تھا تو کیا واقعی اس کی پوری توجہ اس کام ہی کی طرف ہوتی تھی۔ اس کا یہ پراسرار تجربہ زیادہ ڈرامائی نہ تھا۔ اس کو کوئی شکل نظر نہ آئی۔ کوئی مخصوص جذبہ بھی پیدا نہ ہوا، اس کے دل میں صرف ایک عظیم ترین خوش آیند احساس پیدا ہوا کہ اس کی پریشانیاں ختم ہوگئی تھیں۔ ڈوی کی تشریح کے مطابق پراسرار تجربات عام طور پر خالص جذباتی ہوتے ہیں اور ان کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، لیکن جب اس نے اپنے تجربے کو الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی تو اس کے الفاظ یہ تھے:

"آخر تم کس بات پر پریشان ہو رہے ہو۔ ہر چیز جو یہاں ہے وہ ہے اور تمہارا کام صرف یہ ہے کہ تم اس پر قانع رہو" اس نے مزید یہ کہا "اس وقت سے میرے تمام شکوک ختم ہوگئے ہیں۔ نہ عقائد کا سوال باقی ہے۔ میرے لئے یمان کا مطلب ہے پریشان نہ ہونا"

اگرچہ اس کے مذہب میں اثباتی عقائد اتنے کم تھے (اور اسے یقین تھا کہ مذہب کا اس کے فلسفہ سے کوئی تعلق نہ تھا) تو بھی وہ اس کو ورڈس ورتھ (Wordsworth) کے شاعرانہ وحدۃ الوجودی عقیدہ سے تشبیہ دیتا تھا

جس کے کلام کو وہ اس وقت پڑھ رہا تھا نیز اس کو والٹ وھٹمین (Walt Whitman,) کے احساس وحدت کائنات کے عقیدے سے بھی مشابہ سمجھا تھا۔ یہ سوچ کر کہ آپ شاید یہ بات کہیں وہ خود آپ سے کہیگا کہ غالباً یہ جنسی پاکیزگی کا نتیجہ ہے اور یہ بھی کہے گا کہ اس سے اس کی باقاعدگی اور اہمیت کم نہیں ہوتی۔

اس نے کہا "میرا دعویٰ ہے کہ مجھے مذہب مل گیا ہے اور وہ مجھے اس شب آیل سٹی میں ملا"۔

سال کے اختتام پر ڈوی کی چچازاد بہن نے اپنے کام سے استعفٰے دے دیا اور اس کے ساتھ ہی ڈوی کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ وہ پھر برلنگٹن آگیا۔ اب اس کے دل میں ایک نئی قسم کا اطمینان موجود تھا لیکن اس کے سر میں اب بھی اس پرانے اختلاف کی کشمکش موجود تھی جو اس نے مادی اور اخلاقی علوم کے درمیان دیکھا تھا۔ اختلاف کی اس خلیج کو پاٹنا ہمیشہ جان ڈوی کے نزدیک ایک عظیم مسئلہ رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ کہا کہ اس نے اپنی پوری ذہنی سرگرمیاں اس مسئلہ کے حل کے لئے وقف کر دی تھیں۔ لیکن اس وقت یہ ایسا مسئلہ نہ تھا جس کے حل کے لئے برلنگٹن میں کوئی شخص روپیہ صرف کرنے کے لئے تیار ہوتا۔ اپنا کام چلانے کے لئے جب کہ وہ اس مسئلہ کے حل کی کوشش کر رہا تھا اس نے ایک دوسری ملازمت کرلی۔ اس مرتبہ اس نے چارلٹ ورمانٹ میں ایک چھوٹے ڈسٹرکٹ اسکول ہاؤس میں پڑھانے کا کام لے لیا۔ چارلٹ (Charlotte,) برلنگٹن سے زیادہ دور نہیں ہے۔ حالانکہ ڈوی اسکول میں حروف ابجد سے لیکر

سطح کے علم ہندسہ تک کا درس دیتا تھا لیکن وہ اپنے بچے ہوئے وقت کو اپنے پُرانے فلسفہ کے پروفیسر ایچ، اے، پی ٹوری ( H, A, P, Torry, ) کی رہنمائی میں فلسفہ کی قدیم مستند کتابوں کے مطالعہ پر صرف کرتا تھا پروفیسر موصوف اپنا وقت اور رہنمائی اس کو بلامعاوضہ دیتا تھا۔ ڈوی نے اپنا مختصر سا فلسفہ بھی علیحدہ مرتب کرنا شروع کیا۔

۱۸۷۹ء میں جب جان ڈوی نے علم عضویات اور علم اخلاقیات کو ہم آہنگ بنانے کے کام کو جو اس کی زندگی کا خاص مقصد تھا شروع کیا امریکہ میں فلسفہ کو مقصد حیات بنانے کے امکانات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ پورا ملک اس معاملہ میں برلنگٹن ورمانٹ سے بہتر نہ تھا۔ فلسفہ کے پروفیسر الٰہیات کے پادری ہوتے تھے جو کسی سبب سے جس کا تعلق کبھی ان کی گویائی کے اعضا کے نقص سے اور کبھی ان کے دماغ کے نقص سے ہوتا تھا مذہبی خطبے دینے کے کام کے مقابلے میں تدریس کے کام کو سہل سمجھے تھے۔ وہ ایک قسم کے سادہ کپڑوں میں ملبوس پادری ہوتے تھے۔ کالجوں میں انھیں اس لیئے پڑھانے کے کام پر رکھ لیا جاتا تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کریں کہ طالب علموں کے دماغ سائنس کی تعلیم کی وجہ سے بھٹک نہ جائیں۔ چند مستثنیات میں سے ایک ڈبلو، ٹی ہیرس ( W. T. Harris, ) تھا جس نے ایک مجلہ فلسفۂ قیاسی ( A Journal of Speculative Philosophy, ) سینٹ لوئی، مسوری میں شائع کیا تھا۔ ہیرس ایک ایسا فلسفی تھا جسے ایک اتائی فلاسفر کا نام دیا گیا تھا اور ڈوی اگرچہ وہ اب تک گرجا جانے والوں میں سے تھا تاہم اتنا اتائی ضرور تھا کہ اس نے اپنی پہلی طبع زاد کتاب ہیرس

کے پاس بھیجی۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب تھی جسے اس نے چارلٹ میں اسکول کے گھنٹوں کے بعد کے وقت میں "مادیت کے مابعد الطبیعیاتی مفروضات" پر بہ آسانی مرتب کر دیا تھا۔ اس نے اسے رسالہ میں شائع ہونے کے خیال سے پیش نہیں کیا تھا۔ وہ ہیرس سے اس کے متعلق صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا اس میں کچھ ایسی علامات ہیں جن کی بنا پر آئندہ ترقی کرنے کی توقع کی جاسکے جب اسے اشاعت کے لئے قبول کر لیا گیا تو اس نے طے کیا کہ وہ بھی ایک نامی فلاسفر بن جائے گا۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ جب تک وہ اس کے لئے تیار ہوگا اس وقت تک ملک میں فلسفیوں کے لئے جگہیں بھی وجود میں آجائیں گی اس نے یہ بھی قیاس کر لیا کہ کسی امریکی کے لئے فلسفہ کی تعلیم کی غرض سے جرمنی جانا کوئی ضروری نہیں۔ آج کل تو یہ ایک کھلی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں یہ ایک انقلاب آفریں بات تھی۔

ایک صاحب تخیل تاجر جانس ہاپکنس ( John Hopkins, ) نے حال میں بالٹیمور میں علمی تحقیق کی ایک نئی قسم کی یونیورسٹی قایم کی تھی اور ڈوی کو خوش خبری دینے والے فرشتہ پروفیسر ہکسلے نے اس کا افتتاحیہ خطبہ پڑھا تھا۔ نئی یونیورسٹی دو ہزار پانچسو ڈالر کی فیلوشپ دے رہی تھی اور اس کے لئے کالج کے گریجویٹ مقابلہ میں شریک ہو سکتے تھے۔ ڈوی نے ایک فیلوشپ کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ (تھرسٹن ویلن نے بھی کوشش کی لیکن ناکام رہا) لیکن ڈوی کی ایک چچی تھی جس کے پاس پانچسو ڈالر تھے اس نے وہ ڈالر قرض لے لئے اور کسی طرح جانس ہاپکنس کے یہاں پہونچ گیا۔ ایک سال مطالعہ میں مصروف

رہنے کے بعد اس نے پھر فیلو شپ کی کوشش کی اور اسے حاصل کر لیا۔ اس کو ایک ملازمت بھی مل گئی جس میں انڈر گریجویٹ طلبہ کو فلسفہ کی تاریخ پڑھانے کا کام تھا۔ پس کون کہتا تھا کہ امریکہ میں فلسفہ کے ذریعہ کوئی کام نہیں مل سکتا تھا؟ اگرچہ اس کام کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی لیکن اس کام کے کرنے کا حق حاصل کرنے کیلئے اسے خود بھی کچھ نہ دینا پڑتا تھا۔ وہ خوش تھا۔ اسے ایک اعلیٰ درجہ کا اُستاد مل گیا تھا جو ہیگل کا پیرو تھا اور اس کا نام جارج سلویسٹر مورس تھا۔ ڈوی کا صاحب دماغ بڑا بھائی ماہرِ معاشیات ڈیوس آر (Davis R.) جس کو "کون کیا ہے" (Who's Who,) میں بمقابلہ جان کے طویل تر جگہ دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ رہنے اور پڑھنے کے لئے آگیا۔ ڈوی جنس سے متعلق کوئی مسائل نہ رکھتا تھا اور وہ ہیگل کی محبّت میں دل و جان سے مبتلا ہو گیا۔

تاوقتیکہ آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہیگل کی محبّت میں مبتلا ہونا کس قدر ولولہ انگیز بات ہے (اور کتنا محنت طلب کام ہے) جان ڈوی آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان تین سال کے دوران میں جو جانس ہاپکنس کے یہاں گزرے کیا کام ہوا۔ وہ تینوں سال صبح سے نصف شب تک مکمّل طور پر فلسفہ سے بھرے ہوئے تھے اور فلسفہ اتنی عظیم شے ہے کہ اس کی تعریف کرنا آسان نہیں عام طور پر اس کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ سائنس کے ذریعہ جو نتیجے مترتب ہوتے ہیں، وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چیزوں میں باہم کیا مشابہت ہے اور مخصوص سلسلوں میں واقعات کی تقدیم وتاخیر کے اصول کیا ہیں، لیکن یہ چیزیں کیوں وجود میں آئی ہیں اور ان کا انجام

کیا ہوگا یہ بات سائنس طے نہیں کر سکتی، اور نہ یہ باتیں دراصل فلسفہ بتا سکتا ہے، اور وہ فلسفی جو فلسفہ کے متعلق یہ بات تسلیم کرتے ہیں یعنی مشکک فلسفی دراصل وہی ایسے لوگ ہیں جو ہمیں عمیق راستی کا احساس دلاتے ہیں۔ دوسری قسم کے فلسفیوں کا زیادہ تر یہ کام ہوتا ہے کہ سائنس اشیا کے جن مایوس کن تصوّرات پر پہنچتی ہے۔ اس کی یاس انگیزی کی شدّت کو کم کرنے کے طریقے سوچیں۔ مغربی یورپ کے فلسفہ کا بڑا حصّہ فی الواقع اس امر کی کوشش ہے کہ اسے پڑھنے والے کائنات میں خدا کے وجود پر یقین کرنے لگیں اور یہ کام اتنی ہی تیزی سے کیا جاتا ہے جتنی تیزی سے سائنس خدا کے عقیدے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اگر آپ علم مابعد الطبیعیات کو پادریوں کے ہاتھوں سے نکال بھی لیں تب بھی بقول فیور باش ( Feuerbach, ) وہ بدلے ہوئے بھیس میں علم دینیات ہی معلوم ہوتا ہے۔"

اور ہیگل نے اس کے لیے نہایت انوکھا اور مدبّرانہ بھیس اختراع کیا ہے۔ یہ اختراع خدا کو دُنیا میں قایم رکھنے کے لیے ایک نہایت حیرت انگیز منصوبہ ہے اور اس کا مضائقہ نہیں کہ ایماندارانہ چھان بین کرنے پر دُنیا کتنی ہی سختی پسند، متلون، خونخوار اور معیاری مفادات کی طرف سے بے پروا نظر آئے۔ اس کی اسکیم مختصراً یہ تھی کہ تمام حقیقت اچھی اور بُری مل کر خدائی روح ہے اور اس کا عمل اندر کی طرف، آگے کی طرف اور اوپر کی طرف اپنی آزاد اور مکمل ہستی کے حصول کی جدوجہد میں جاری ہے۔ اس سے بہت سال پہلے ماہرینِ علمِ طبیعی نے دُنیا کو ارتقا کے عمل میں مصروف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہیگل

ان کے مقابلہ کے لئے اپنے اس نظریہ کے ساتھ تیار ہو گیا کہ خدا خود ایک دُنیا ہے جو عمل ارتقا میں مصروف ہے۔ سائنس کے مقابلہ میں روحانیت کو فروغ دینے کے لیے ہیگل کی اس اسکیم سے زیادہ حیرت انگیز اور مُدبّرانہ شے انسانی دماغ نے اس سے پہلے کبھی ایجاد نہیں کی تھی۔ یہ بات ضرور ہے کہ ایک نہایت محنت کرنے والا شخص ہی اس کا گُر سمجھ سکتا ہے۔

جان ڈوی کے سوانح حیات کو سمجھنے کے لئے فنی نوعیت کا اتنا علم ضروری ہے۔ اس کا تعلق برلنگٹن میں وہائٹ اسٹریٹ کے جماعتی گرجے سے تھا۔ اسکی تربیت ایک انجیل آموز اور خاصی پابند اخلاق ماں نے کی تھی اور طامس ہنری ہکسلے نے اس کے فلسفیانہ تخیلات کو بیدار کیا تھا۔ ہکسلے سائنس کا "پیغمبر" وہ شخص ہے جس نے خدا کے متعلق اپنے مشکک رویّہ کو واضح کرنے کے لئے ایک دن اپنی بیوی کے مشورہ سے لفظ "لاادری" ( Agnostic, ) وضع کیا۔

بہرحال ہکسلے کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈوی خدا کے بارے میں پریشان نہ ہوا۔ بحیثیت ایک نوجوان فلسفی کے اس نے مذہب کا بچاؤ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کیونکہ جب اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اصل دُنیا کی تربیت اس منصوبہ سے کچھ مختلف ہے جو وہائٹ اسٹریٹ سنڈے اسکول میں پیش کیا جاتا تھا تو اس سے وہ پہلے ہی کافی پریشان ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک صبر آزما ذاتی بحران" تھا لیکن وہ بحران ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے گزر چکا تھا اور ہکسلے کے پاس آنے سے پیشتر اس کے خیال میں کام چلانے کے لئے تسویہ

پیدا ہو گیا تھا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے مذہب کو بالکل مسترد کر دیا تھا یا لفظ خدا کو بے معنی قرار دیدیا تھا جیسا کہ ہکسلے نے کیا تھا، لیکن اس نے مذہب کے زیادہ ناقابلِ یقین حصّہ کو جس کی تشریح وہائٹ اسٹریٹ میں کی جاتی تھی ضرور مسترد کر دیا تھا اور جو حصّہ باقی رَہ گیا تھا اس پر بحث کرنا وہ مناسب نہ سمجھتا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ (یہ اسی کے الفاظ ہیں) ہر حقیقی اور صحت مند مذہبی تجربہ ایسا ہونا چاہیئے جس میں ان عقائد سے جن کو عقل کے مطابق انسان قبول کرنے کا حق رکھتا ہے خواہ وہ کچھ بھی ہوں مطابقت کرنے یا کر سکنے کی اہلیت موجود ہو۔"

خدا سے متعلق یہ محتاط اور غیر ولولہ انگیز رویّہ (گویا اس کو بازو کے کمرے میں انتظار میں بٹھا دیا ہے جب کہ آپ دُنیا سے مُلاقات کر رہے ہیں) جان ڈوی کی خصوصیت تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آیا یہ معاشرتی کردار کی ایک مثال کی حیثیت سے ورمانٹ کی خصوصیت تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے تاریخ میں کہیں یہ چیز نہیں ملتی اور اس امریکی فلاسفر کو سمجھنے کے لئے یہ بنیادی چیز ہے ڈوی خدا کے لئے نہیں بلکہ انسان کے لیئے متفکر رہتا تھا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہکسلے نے جو ٹھوس حقائق پیش کئے تھے ان کے مقابلہ میں عیسائیوں کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کمزور اور ناقابل یقین تھے (بلکہ انسانی مسائل پر بحث کرنے کے کل روحانی طریقوں کی یہی کیفیت تھی) ان میں ضرورت سے زیادہ مصلحت آمیز دُعائیں ہوتی ہیں، بہت زیادہ حصّہ ایسا ہوتا ہے جس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ وہ مذہبی طریقہ کو مضبوط، یقینی اور ٹھوس

بنانا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں جو الفاظ اس نے مجھ سے کہے تھے یہ ہیں "مجھے ضرورت سے زیادہ اخلاق پرستانہ اخلاقی قوانین سے نفرت تھی جن میں میری پرورش ہوئی تھی اور میں کوئی ایسی چیز دریافت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو زیادہ حقیقی اور علمِ طبیعی سے زیادہ مشابہ ہو۔ زیادہ فنی الفاظ میں یوں سمجھیے کہ وہ مسئلہ جس پر میں کام کر رہا تھا اور اپنی زندگی بھر کرتا رہا ہوں یہ ہے کہ آیا کوئی ایسا طریقہ مل سکتا ہے جس کا اطلاق مادی اور انسانی علوم دونوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔"

ڈوی کے خیال میں یہ مسئلہ ہیگل کے "تصوری علم مابعد الطبیعیات" پر یقین کر لینے سے حل ہو جاتا تھا، اور وہ حل سیدھے سادے الفاظ میں یہ تھا کہ مادی علوم کو کم درجہ کا قرار دیا جائے یا انھیں انسانی علوم کے تحت لایا جائے اور اس غرض کے لئے "مادّیت" کو ایک دھوکا قرار دیا جائے۔ صحیح طور پر اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو تمام دُنیا ایک دماغ کی طرح کام کرتی ہوئی معلوم ہوگی۔ وہ پروفیسر موارس جس نے اس فلسفہ کی جانب اس کی رہنمائی کی ایک نادر الوجود اخلاقی کردار کا آدمی تھا۔ وہ اتنا ہی نیک تھا جتنی ڈوی کی ماں تھی اگر اتنا اخلاق پرست نہ بھی ہو، اور یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا۔ ڈوی کہتا ہے "میں نے اس سے زیادہ بے لاگ اور پُر مغز انسان کبھی نہیں دیکھا۔"

یہ امریکی فطانت کا مکمل ترین مظہر" اس وقت بائیس سال کی عمر میں جرمنی کے ایک نظام مابعد الطبیعیات میں پورے طور پر "مقیّد" ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے اور شاید ڈوی کا طویل المیعاد اندازہ

کرنے پر یہ ایسی ہی ثابت ہو، لیکن اس وقت کم از کم اس کے لئے یہ ایک تسکین بخش تجربہ تھا۔ اتنے ہی خوش آیند طور پر یہ اس کے دماغ کے لئے سکون بخش تھا جتنا کہ آئل سٹی میں اس کا پراسرار روحانی تجربہ اس کے دل کے لئے تھا۔ ساٹھ سال کے بعد بھی جب کہ یہ تمام واقعہ اسے ایک جذباتی جرمن خود فریبی معلوم ہو رہا تھا اس کے دل میں ہیگل کی پاک بازانہ محبت موجود رہتی اور وہ اس تمانیت کے اظہار کے لئے جو نظام کائنات کے اس پراسرار تصور نے اسے بخشی تھی الفاظ تلاش کر رہا تھا۔ کچھ "احساس جدائی" کچھ "انتشار" یا "احساس تنہائی" گویا دُنیا اس کی روح سے منقطع ہوگئی تھی یا وہ خود دنیا سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ اس کو تکلیف دے رہا تھا۔ وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ ہیگل کی مابعد الطبیعیات نے اس کے اندر اتحاد اور اشیا کے ساتھ ساتھ چلنے کا "احساس" بیدار کر دیا تھا۔

اگر ڈوی مطالعۂ باطن سے اتنا زیادہ بے پروانہ ہوتا تھا تو ہمیں اس کے اس فلسفی رومان کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل ہو جاتیں، یا اگر وہ بیمار ہو جاتا اور کسی ماہر تحلیل نفسی کے پاس جاتا تو ایسا ہو سکتا تھا، لیکن وہ بالکل تندرست رہا اور اس رومان کے متعلق اسے کچھ یاد نہ تھا۔

اس نے کہا "مجھ میں شرمیلا پن اور خود شعوری ضرورت سے زیادہ تھی اور میں دوسروں کے سامنے اپنی شخصیت کو ہمیشہ بڑا دکھانا چاہتا تھا، یا شاید انجیل کی اخلاقی تعلیم سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے باعث مجھ میں دُنیا سے علیحدگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ احساس اب مجھ میں پیدا نہیں ہو سکتا

اگر میں اسے حاصل کر سکتا تو عنفوان شباب پر میں کوئی ایسا مضمون لکھ سکتا تھا جو در اصل دلچسپ ہوتا۔"

وجہ کچھ بھی ہو لیکن وہ اثر دیر پا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں جب ڈوی کا جانس ہاپکنس کے یہاں پہلا سال تھا کہ ہیگل اسے اپنے ساتھ اُڑا کر لے گیا اور دس یا بارہ سال تک وہ ہیگل کا خاصا پیرو رہا اور اُنیسویں صدی کے آخری عشرہ کے شروع میں بالکل مناسب طریقہ پر شکاگو کے نواح میں وہ پھر زمین پر اُترا۔ ہیگل کے اثر سے پینتیس سال کی عمر میں نجات حاصل کرنا غیر معمولی چیز تھی۔ اگر کوئی ہیگل کے زیر اثر اتنے عرصہ تک رہے تو وہ عموماً بالائی کرۂ ہوا میں گم ہو جاتا ہے، اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ڈوی کو اس بالائی فضا سے نیچے لانے میں جو خاص اسباب کارفرما تھے ان میں ایک بشریت سے متعلق رومان بھی تھا یعنی ایک لڑکی کے ساتھ رومان جس نے اپنے قدم نہایت مضبوطی کے ساتھ زمین پر جما رکھے تھے۔

جب ڈوی نے جانس ہاپکنس کے یہاں کام کرنے کے زمانہ میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تو پریذیڈنٹ گلمین ( Gilman, ) نے اسے جرمنی جا کر تعلیم جاری رکھنے کے لئے قرضہ دینے کی پیش کش کی، ڈوی کو اس سے بڑی مسرت حاصل ہوئی لیکن اس نے گلمین سے کہا کہ وہ قرضہ لینا پسند نہیں کرتا اور امریکہ میں وہ بالکل مطمئن ہے۔ پریذیڈنٹ گلمین نے اسے کچھ نصیحت بھی کی، اس نے کہا "کتاب کا کیڑا زیادہ مت بنو اور اتنی تنہائی کی زندگی مت بسر کرو۔ باہر چل پھر کر لوگوں سے ملو جلو" اس پیش کش کو قبول

کرنے کی طرف ڈوی زیادہ مائل تھا۔ اگرچہ ٹھیک ٹھیک وہ یہ نہ جانتا تھا کہ ان نصائح پر کیونکر عمل کرے۔ سب سے پہلے جس چیز کی اسے ضرورت تھی وہ روزگار تھا لیکن روزگار ملنے سے قبل اسے برلنگٹن میں ایک اور موسمِ گرما فکر کی حالت میں گزارنا پڑا۔ یہ ملازمت مچیگن یونیورسٹی میں بحیثیت معلم فلسفہ کام کرنے کی تھی اور تنخواہ نوسو ڈالر تھی، اس کا دوست موریس بھی وہاں پڑھانے کا کام کرتا تھا۔

مچیگن میں ڈوی نے لوگوں سے ملنا شروع کیا اور جن لوگوں سے وہ اول ملا ان میں ایک مخلوطی ( Coed, ) طالبہ تھی جس کا نام ایلیس چیمپین تھا، وہ اسی بورڈنگ ہاؤس میں رہتی تھی جس میں ڈوی تھا۔ وہ نہایت قوی دماغ رکھتی تھی، انتہا پسند اور آزاد خیال خاندان میں پیدا ہوئی تھی عورتوں کو حق رائے دہندگی دیئے جانے کی پرجوش حامی تھی، گہری مذہبیت کی حامل تھی لیکن کسی چرچ (گرجے) سے تعلق نہ رکھتی تھی، اور فضول بحواس کی قطعی متحمل نہ تھی۔ وہ ڈوی سے قد میں چھوٹی تھی لیکن فربہ زیادہ تھی، خوبصورت نہ تھی اور لباس بھی اچھا نہ پہنتی تھی۔ خالص قدرتی جسمانی بناوٹ کے باعث اس کی پلکیں اس کی آنکھوں پر اتنی نیچے لٹکی ہوئی تھیں کہ ایک کمزور ہمائے کے شخص کو وہ بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن اس کا ناک نقشہ کافی اچھا تھا اور اس کا منہ نازک تھا۔ اس کا مشہور دادا قدیم امریکیوں کے چپوا قبیلہ کے ساتھ ہو گیا تھا اور اس نے ان کے حقوق کے لئے جنگ کی تھی۔ اس نے لنکن اور خانہ جنگی کی بھی مخالفت کی تھی۔ ایلیس کو اس کا مجاہدانہ جذبہ اور اخلاقی جرأت

ورثہ میں ملی تھی۔ تخیلات کی زندگی میں اسے پرجوش دلچسپی تھی۔ یہ خوش قسمتی تھی (یا سمجھداری) کہ جان ڈوی ایسی عورت کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ ایک محبت کرنے والی کمزور دماغ کی بیوی سے اگر اسے واسطہ پڑتا تو جتنی ترقی اس نے کی اس سے نصف ہی شاید کر سکتا۔ اس سے بہرحال یہ کہنا مقصود نہیں کہ ان کے تعلقات ناہموار تھے۔ ڈوی بھی تیز دماغ آدمی تھا۔ اپنے معتدل اور نرم انداز میں جس میں نہ باطنی کشمکش ہوتی تھی نہ ظاہری شور و شغف وہ اپنے طریقۂ عمل پر ایک خچر کے سے زور کے ساتھ قائم رہتا تھا سوائے اس صورت کے کہ جب معقول دلائل اس کے خلاف ہوں۔ اس کے علاوہ اسے اعلےٰ علم کا فائدہ حاصل تھا۔ ایلیس اس کی کلاسوں کی ایک طالب علم تھی مختصر یہ ہے کہ مکمل اخلاقی اور ذہنی قدردانی دونوں کے درمیان موجود تھی۔ ڈوی نے مجھے بتایا کہ کبھی دو افراد نے آپس میں ان سے زیادہ محبّت نہ کی ہو گی"۔

ان کی شادی چپوا کا پر ہیڈ کے مکان پر ۱۸۸۶ء میں ہوئی تھی۔ اسی سال ڈوی کو اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا گیا اور اس کا مشاہرہ سولہ سو ڈالر ہو گیا۔ اگلے سال ان کا پہلا بچہ فرد ( Fred, ) پیدا ہوا اور ڈوی نے اپنی پہلی کتاب شائع کی۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ یہ کتاب فلسفہ پر نہ تھی بلکہ علم نفسیات پر ایک درسی کتاب تھی۔ ڈوی یہ چاہتا تھا کہ علم نفسیات کو فلسفہ سے علیحدہ کر دیا جائے اور وہ علوم طبیعی میں شامل ہو جائے، یہ کتاب ڈوی کو اس مقصد کو حاصل کرنے والے رہنماؤں کے زمرہ میں جگہ دیتی ہے، لیکن کتاب کے آخر میں پھر بھی ایک جملہ آتا ہے جو ہیگل کی پُرا احترام یاد دلاتا ہے یعنی یہ کہ

آخری وجودِ حقیقی خدا ہے یہ جملہ اب سائنسی درسی کتاب میں بالکل عجیب معلوم ہوتا ہے۔

اگلے سال بغیر کسی قسم کی کوشش یا تدبیر کے ڈوی کو مینسوٹا یونیورسٹی میں پروفیسری کی جگہ مل گئی اور اب مشاہرہ پچیس سو ڈالر ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد اس کا دوست پروفیسر مورس فوت ہو گیا اور ڈوی اس کا جانشین بننے کے لئے مچیگن واپس آیا۔ اب وہ پروفیسر اور فلسفہ کے شعبہ کا صدر بن گیا اور اس کی تنخواہ تین ہزار ڈالر تھی۔ ڈوی کا اندازہ اناثی فلاسفروں کی ملازمتوں کے بارے میں صحیح ثابت ہوا۔ فلاسفروں کے لئے ہر جگہ ملازمتیں پیدا ہو رہی تھیں خصوصاً ان فلاسفروں کے لئے جو اب تک علم نفسیات کی درسی کتابوں میں خدا کا ذکر کر سکتے ہیں۔

لیکن جب وہ ۱۸۸۹ء میں میچیگن واپس آیا تو ڈوی ہیگل کی روحانی دنیا سے دلچسپی لینا ترک کر رہا تھا۔ مڈویسٹ کی معاشرتی فضا ان ایام میں جبکہ آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی مشکل سے اس بات کے لئے سازگار تھی کہ ان پُراسرار نظاموں پر یقین برقرار رکھا جائے جو حقیقی افلاک کو غیر حقیقی قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں جان اور ایلس دونوں ٹھوس انسانی مسائل سے جو ایک جمہوری ملک کی یونیورسٹی کے انوکھے ادارے سے متعلق ہوتے ہیں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ جیمس، بی، اینجل کے تحت جسے تمام لوگ جو وہاں تعلیم دینے کا کام کرتے تھے معیاری کالج پریزیڈنٹ سمجھتے تھے مچیگن کے عوامی اسکولوں کا نظام اسی یونیورسٹی کی پُرشوق سربراہی میں ہوتا تھا۔

ڈوی کے فرائض میں یونیورسٹی کے ایک شعبہ کا رکن ہونے کی حیثیت سے یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ ریاست کے ہائی اسکولوں کا معائنہ کرے۔ . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . اور یہ دیکھے کہ وہ یونیورسٹی میں طلبا کو بھیجنے کی کہاں تک اہلیت رکھتے ہیں۔ اس سے جمہوریت اور تعلیم کے عام مسئلہ پر پہلی مرتبہ اس کی توجہ مبذول ہوئی اور "جمہوریت اور تعلیم" اس کی اس بڑی کتاب کا عنوان بنا جو مذکورہ مسئلہ پر اس نے اس زمانہ میں لکھی۔ اس سے اس کا ذہن ہیگل کے فلسفۂ نظام کائنات سے ہٹ گیا۔ رسمی طور پر وہ اب بھی یہ یقین رکھتا تھا کہ ہیگل نے حقیقی وجود کی ساخت کو جس منطقی طور پر بیان کیا ہے اور جس طرح اسے عظیم ترین سمجھا ہے وہ صحیح ہے، لیکن اب وہ اس منطق میں جسے وہ "معاون منطق" کہتا تھا زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ معاون منطق کے ذریعہ وہ لوگ جو حقیقی وجود رکھتے ہیں لیکن عظیم ترین نہیں ہیں اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کے طریقے سوچتے ہیں۔ ۱۸۹۰ء میں جب ولیم جیمس کی مشہور کتاب سائیکلوجی، (Psychology,) شائع ہوئی تو ڈوی کا یہ رجحان اور زیادہ تیز ہو گیا۔ اس کتاب میں نظریۂ عملیت کی ایک جھلک تھی جسے اسی کتاب کے مصنف نے سترہ سال بعد منضبط کیا۔ ۱۸۹۱ء میں ڈوی نے ایک کتاب کا اعلان کیا جس کا نام "معاون منطق" Instrumental Logic, تھا، لیکن اس کا مطلب اس وقت یہ تھا کہ "جب منطق کو بطور ایک ذریعہ کے استعمال کیا جائے تو اس کی شکل کیا ہوتی ہے" اس نے یہ کتاب کبھی نہ لکھی اور صدی کے اختتام سے قبل ہی وہ یہ درس دینے لگا کہ منطق ایک ذریعہ ہے اور

اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہیگل کا نظریۂ نظام عالم جیسا کہ اس نے کہا علیحدہ ہو گیا تھا"

اس واقعہ سے پہلے ہی دینا میں ڈوی کا مقام بہت اونچا ہو گیا تھا۔ شکاگو کی یونیورسٹی کو جان ڈی راک فیلر نے ایک بڑا عطیہ دے کر قایم کرایا تھا اور اس کے پریزیڈنٹ ولیم رینے ہارپر کے دل میں فلسفۂ نفسیات اور تعلیم کے شعبوں کو باہم ملانے ایک نیا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں ڈوی کو شکاگو بلایا گیا اور پانچ ہزار ڈالر تنخواہ مقرر کی گئی اور اسے پورے منصوبہ کا سربراہ بنایا گیا یہ نادر قسم کی خوش نصیبی تھی کیونکہ ڈوی کا فلسفہ زیادہ تر "عمل تخیل کی نفسیات" کی شکل اختیار کر رہا تھا اور تعلیم میں اس کی دلچسپی اس کے فلسفہ کے شغف کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ علاوہ بریں ڈوی خاندان بڑھ رہا تھا اور اتنا بڑھنے والا تھا کہ ایک معمولی اتائی یا غیر پادری فلاسفر کی آمدنی اس کی کفالت نہ کر سکتی تھی۔ مسز ڈوی اگرچہ اس کے دادا دادی آزاد خیال لوگ تھے اپنی طبیعت میں کٹر مذہبی اخلاق کا کچھ شائبہ رکھتی تھی جس کا اثر یہ تھا کہ اس کے نزدیک یہ سوچنا کہ بچے کب اور کن حالات میں پیدا کیے جائیں ایک گناہ تھا۔ دوسرا بچہ ایولن ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا تھا اور تیسرا بچہ مورس (جس کا نام ڈوی کے محترم اُستاد کے نام پر رکھا گیا تھا) شروع ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوا۔ تین ہزار اور پانچ ہزار ڈالر کا فرق انھیں اہم نظر آنے لگا اور شکاگو سے جب خط آیا تو یہ ہر اعتبار سے مسرت انگیز خوش خبری تھی۔

انھوں نے یہ طے کیا کہ مسز ڈوی موسم گرما بچوں کے ساتھ یورپ میں

بسر کریں گی اور ڈوی پہلے ہی شکاگو چلا جائے گا اور موسم گرما کے اسکول میں کام کر کے کچھ مزید روپیہ حاصل کرے گا۔ ڈوی اپنے دو سال کے بچہ مورس کو الوداع کہنا پسند نہ کرتا تھا کیونکہ اسے پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ وہ بچہ درویش صفت اور اعلےٰ درجہ کا ذہین تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نے کیا علامتیں دیکھ کر یہ خیال قایم کیا تھا اور یہ محض پدرانہ محبت کی بنیاد پر بھی نہ تھا۔ ایک اجنبی شخص نے جو اس جہاز پر سفر کر رہا تھا یہ عجیب بات کہی "اگر یہ بچہ کافی عرصہ تک زندہ رہا تو ایک نیا مذہب معرضِ وجود میں آجائے گا"

مورس میلان ( Milan, ) میں خناق کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا اور پچاس برس بعد جب ڈوی نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو اس کے حلق میں کچھ گرفتگی محسوس ہوئی جو رنج کی مظہر تھی۔

تین دوسرے بچے لوسی، گورڈن اور جین شکاگو میں پیدا ہوئے اور اس طرح پانچ بچے اب بھی مکان میں لڑتے جھگڑتے پھرتے تھے جب کہ یہ اس فلاسفر کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ وہ اس کے غور و فکر میں ذرا بھی خلل انداز نہ ہوتے تھے۔ منطقی کی حیثیت سے ڈوی اس وقت اپنا بہترین نمونہ پیش کرتا تھا جب ایک بچہ اس کے پتلون سے ملبوس ٹانگ پر چڑھ رہا ہوتا تھا اور دوسرا اس کی دوات میں تنکے وغیرہ ڈالتا ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس میں پوری توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت تھی بلکہ اس کو دو کام ایک ساتھ کرنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر بعض اوقات پریشانی محسوس ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کے دوست سڑک پر اس کے پیچھے چلتے اور عمارتوں کے کئی کئی بلاک

طے کرتے تھے تاکہ وہ یہ دیکھ لیں کہ ڈوی چوراہوں کو خیریت سے عبور کر رہا ہے یا نہیں کیونکہ وہ اس طرف سے کہ اس کا جسم کہاں جا رہا ہے بے حد بے خبر ہوتا تھا۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ آیا یہ واقعہ بھی مذکورہ قسم کی خود رفتگی کے واقعات میں سے ایک ہے یا نہیں، لیکن ایک روشن سہ پہر کو جان ڈوی اور اس کے چار شرکائے کار مارننگ سائیڈ ہائیٹس ( Morningside Heights, ) پر نصف میل براڈوے سے نیچے کی طرف پیدل چلے تاکہ ایک کھلی فضا میں دکھائے جانے والے فلم کو دیکھ لیں۔ اس واقعہ کے متعلق طامس ریڈ پاول نے یہ بات کہی "وہاں پہونچنے تک ہم میں سے کسی کو یہ احساس نہ ہوا کہ فلموں کو تاریکی کی ضرورت ہوتی ہے جو دنیا کے اس حصّہ میں دن میں نہیں مل سکتی۔"

اپنے نیویارک کے کمرہ میں وہ غور و فکر کا شغل اس طرح کیا کرتا تھا کہ ٹیلیفون اس کے کان کے پاس موجود ہوتا تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ کھڑکیاں دھونے کے متعلق مالک مکان کی درخواست، مشورہ کے لیئے چینی سفیر کی درخواست، ثقافتی آزادی کی کمیٹی کی حکمت عملی کے متعلق سڈنی ہک کے سوالات پرانے باغی اینجلیکا بالا بنیاف ( Angelica Balabanoff, ) کے اعزاز میں منعقد ہونے والے ایک جلسہ میں جانے کی دعوت، کسی گم نام پناہ گزیں کے لئے ایک اخلاقی حلف نامہ تیار کرنے کے لیئے کچھ مشورہ، کیمبرج کی سائنسی عالمی کانگریس میں خطبہ دینے کے لیئے دعوت، یہ سب باتیں ایک منٹ میں طے ہو جاتی تھیں۔ ریسیور کو اوپر رکھ دینے کے ایک سیکنڈ بعد اس کا پرانا ٹائپ رائیٹر پھر

کام کرنے لگتا اور وہ اپنے خیال کو جس کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا مکمل کرنے میں مصروف ہو جاتا۔

ڈوی کبھی جسمانی ورزش کی فکر نہ کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دماغی کام سے کافی ورزش ہو جاتی ہے۔ اگر کافی مقدار میں کام کیا جائے۔ چنانچہ تفریح کے لئے وہ موٹر میں طویل فاصلے طے کرنے چلا جاتا تھا۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھ کر "کراس ورڈ" معمے حل کرتا جاتا تھا اور اپنے ہمراہیوں سے گفتگو کرتا جاتا تھا۔ یہ کسی قدر پریشان کرنے والی عادت تھی اور سفر کے اختتام پر یہ معلوم کر کے کہ بمقابلہ اس کے ساتھیوں کے اسے میدانی مناظر زیادہ صحت کے ساتھ یاد ہیں اس میں کچھ خوش گواری پیدا نہیں ہوتی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایسے دماغ کے لئے نصف درجن یا اس کے لگ بھگ بچے فلسفیانہ طور پر ایک قسم کی امداد ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن ڈوی کے بچے اس کے فلسفہ پر کچھ لکھنے میں ممد ہونے کے علاوہ ایک اور امداد بھی کرتے تھے جو تاریخ کے لئے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ وہ بچے اس کے دماغ میں فلسفہ کے مسائل کو تعلیم کے مسائل کے ساتھ مکمل طور پر مخلوط رکھتے تھے۔

یہ رواج ہو گیا ہے کہ ڈوی کے تعلیمی نظریات کو اس کے معاون فلسفے سے بطور نتیجہ ماخوذ خیال کیا جاتا ہے لیکن زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ وہ بطور نتیجہ اس کے بچوں سے ماخوذ کئے گئے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ ایک معاون فلاسفر بنے ڈوی کو تعلیم کی اصلاح میں دلچسپی تھی اور اس نے اس کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ کتاب "اطلاقی نفسیات" (Applied Rsychology,

کہلاتی ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ تعلیم کے بارے میں اس کا کیا نظریہ ہے۔ تعلیم خود زندگی ہے جب تک کہ زندہ چیز کی نشو ونما جاری رہتی ہے تعلیم موافق حالات کے اندر نشو ونما کا نام ہے، اسکول وہ جگہ ہے جہاں وہ حالات سائنسی انداز میں باقاعدہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ بات اسکول سے متعلق ہر شے پر اطلاق پذیر ہوتی ہے۔

اس اصول کے مطابق گھر کی اصلاح کی بھی کسی قدر ضرورت تھی، چنانچہ ڈوی کا اثر والدین اور ان کے بچوں کے باہمی تعلقات پر اتنا ہی زیادہ ہوا ہے جتنا کہ اسکول پر ہوا ہے۔ یہ وہ اصلاح تھی جو صورت حال کی نوعیت کے مطابق گھر ہی سے شروع ہوئی۔

ایک مرتبہ سابینو (Sabino,) یعنی وہ لڑکا جسے بعد میں اس نے متبنےٰ کر لیا تھا دیہات کے ایک بورڈنگ اسکول سے بھاگ گیا۔ پرنسپل نے اس کی رپورٹ بڑے دور مقام سے ڈوی کو بذریعہ ٹیلیفون کی اور آخر میں کہا "جُوں ہی وہ آپ کو ملے اسے فوراً واپس کر دیجئے اور ہم یہ انتظام کریں گے کہ ایسا دوبارہ نہ ہو۔"

ڈوی نے جواب دیا "میرا خیال یہ ہے کہ اگر سابینو نے اسکول کو چھوڑنا طے کر لیا ہے تو غالباً اس نے اپنی عقل استعمال کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اسی کا فیصلہ صحیح ہو۔"

اس کے مکان واقع این آربر (Ann Arbor,) میں ڈوی کا مطالعہ کا کمرہ بالکل غسل خانہ کے نیچے تھا۔ ایک دن وہ وہاں بیٹھا تھا اور

حساب کے ایک جدید اصول پر غور کرنے میں محو تھا کہ یکایک اس نے پانی
کی ایک دھار اپنی پیٹھ پر گرتی ہوئی محسوس کی۔ وہ اپنی کرسی سے کود کر اٹھا اور
دوڑ کر اوپر زینہ پر چڑھ کر گیا اور وہاں یہ دیکھا کہ غسل کے ٹب میں بادبانی کشتیوں
کا ایک بیڑا پڑا ہے اور پانی کناروں سے چھلک رہا ہے اور اس کا چھوٹا لڑکا
فریڈ دونوں ہاتھوں سے اسے بند کرنے میں مشغول ہے۔ جب اس نے دروازہ
کھولا تو بچہ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر سختی سے کہا "جان! بحث نہ کیجئے
جھاڑن لائیے"۔

آپ خیال کر سکتے ہیں کہ پانچ ایسے بچوں کے ایک خاندان میں جنکی
پرورش مذکورہ انداز میں ہوئی ہو دھا چوکڑی برپا رہتی ہوگی اور پراطمینان
زندگی شاذ ہی بسر ہوئی ہوگی، لیکن وہ جیساکہ بچّوں کا طریقہ ہے نمایاں طور
پر اچھے اخلاق رکھنے والے ہنگامہ خیز بچے تھے۔ بعض اوقات البتہ وہ ضرورت
سے زیادہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جین (Jane,) بارہ سال
کی عمر میں عصمت فروشی کے اسباب پر حیران کن سنجیدگی کے ساتھ بحث کرتی
تھی۔ اور ایولن نے اتنی کم عمر میں متوازن اور عاقلانہ انداز کی پُر ظرافت سمجھ بوجھ
اپنے اندر پیدا کر لی تھی کہ بعض اوقات آپ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اگر وہ ایک
منٹ کے لیۓ کسی قدر بے وقوفی کی باتیں کرتی تو بہتر ہوتا۔

بحیثیت فلاسفر نیز بحیثیت ماہر تعلیم شکاگو میں ڈوی اپنے نقطۂ عروج
کو پہونچ گیا۔ ایک کتاب میں جس کا نام "منطقی نظریہ کا مطالعہ"
(Studies in Logic Theory,) ہے اور جو ۱۹۰۳ء

میں شائع ہوئی ہے۔ ڈوی نے اس خاص امریکی فلسفہ کو مرتب کیا ہے جو ہیگل کے جرمن کائناتی اصولوں کے ترک کرنے کے بعد اس کے ذہن میں باقی رہا تھا اس میں درج ہے کہ تمام غور و خوض بشمول ان تصورات کے جو ہیگل کائنات کے متعلق رکھتا ہے۔ معاون منطق ہی ہے اور بنیادی طور پر انسانوں کو ان کے مقاصد تک پہنچانے کے متعلق ہے۔ ڈوی اس تصور میں اطمینان محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ اس خلیج کو جو اسے طبیعی اور اخلاقی علوم کے درمیان حائل شدہ محسوس ہوئی تھی ایسے انداز سے پُر کرتا ہے جس سے عام سمجھ بوجھ سے حاصل شدہ حقائق کو اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا ہیگل کے اصولوں سے پہونچتا ہے۔ مادی دُنیا اصل چیز ہے لیکن اس سے متعلق ہمارا علم وسیع تر معنی میں اخلاقی شے ہے۔ یہ عملی چیز ہے، یہ ایسے مسائل کو حل کرنے کے مترادف ہے جن کے زیر بحث لانے میں بھی انسانی ضرورتوں اور آرزوؤں کا بہت بڑا دخل ہے اور اس لئے ناگزیر طور پر ان مسائل کے حل کرنے میں بھی ان کا ایسا ہی دخل ہوگا۔

جب ولیم جیمس، ڈیوی کی کتاب "منطقی نظریہ کا مطالعہ" شائع ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد شکاگو آیا تو اس نے اس کتاب کا ذکر (کسی قدر ضرورت سے زیادہ انکسار کے ساتھ) کر کے کہا کہ "یہ کتاب نظریہ عملیت کی بنیاد ہے"۔ ڈوی جو اتنا ہی انکسار پسند تھا یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نظریہ عملیت کی بنیاد ڈال رہا ہے اور جب جیمس نے اس کا اس طرح خیر مقدم کیا تو اسے بہت تعجب ہوا۔ یہ "تمہارے بعد گیٹن!" والا معاملہ ہے جو عام طور پر فلاسفروں یا دوسرے

انسانوں کے درمیان نہیں پایا جاتا۔

جان ڈوی کی شخصیت کا دوسرا نصف حصّہ اپنے نقطۂ عروج کو اس وقت پہونچا جب اس نے شکاگو پہونچنے کے دو سال بعد ایک ابتدائی اسکول قائم کیا۔ اس اسکول کو وہ لغوی معنی میں فلسفہ کے شعبہ کی تجربہ گاہ سمجھتا تھا اور وہ اسے تجرباتی اسکول یا درسی تجربہ گاہ کہتا تھا لیکن تاریخ میں اسکا نام ڈوی اسکول ہے جو "ڈوای اسکول" یعنی "کرنے کا اسکول" لکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ "آموختن از کردن" اس کے خاص نعروں میں سے ہے۔ اس کا بانی یہ معصومانہ خیال رکھتا تھا کہ اس اسکول کو چلانے میں وہ اپنے معاون فلسفہ کی بذریعہ تجربہ جانچ کر رہا تھا۔

آج کل ڈوی کی تعلیمات کے خلاف جو بغاوت ہو رہی ہے وہ اس شور وغل کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے جو ۱۸۹۶ء میں ایک تجرباتی اسکول کے تصور نے پیدا کر دیا تھا۔ "ایک اسکول جہاں بچّوں کے ساتھ تجربے کیے جاتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے!" وہ اُنیسویں صدی کے آخری عشرہ کے لوگوں کو اس سے زیادہ حیرت زدہ نہ کر سکتا تھا اگر وہ یہ بھی کہہ دیتا کہ چھوٹے بچوں کے اسکولوں میں بچوں کی چیر پھاڑ بھی ہوتی ہے۔ بہت غور سے چھان بین کرنے پر بھی اس کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ بچوں کو جو کچھ وہ چاہیں کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور یہ بات اس وقت عام طور پر یہ کہنے کے مترادف سمجھی جاتی تھی کہ انھیں دوزخ میں جھونک دیا جائے۔ دراصل ڈوی اس بغاوت کے ضمن میں جو اس نے پُرانے زاہدانہ زبردستی علم ٹھونسنے والے طریقۂ تعلیم

کے خلاف کی تھی کسی قدر ضرورت سے زیادہ بلند تخیل رکھتا تھا۔ اس پرانے نظام کا خلاصہ اس کے ہم عصر مسٹر ڈولے نے اس جملہ میں پیش کیا ہے "اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ تم کیا پڑھتے ہو یعنی تمھارا نصاب تعلیم کیا ہے؟ صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ تمھاری پسند کے خلاف نہ ہو۔" لیکن وہ بچوں کے من موجی تخیلات کو مقدس قرار دینے کے نظریہ پر ہرگز یقین نہیں رکھتا تھا اور اس سے بہت ہی کم اس اصول پر کہ جو من موجی تخیلات قدرتی طور پر بچے رکھتے ہیں ان سے زیادہ رکھنے کی ترغیب دی جائے۔ اس میں سادہ سمجھ بوجھ بمقابلہ ان لوگوں کے زیادہ تھی جواب "ترقی پسند" اسکولوں کو اس کے نام سے چلا رہے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اسکول کے اندر ایسی زندگی بسر کرنے کا انتظام ہونا چاہیئے جیسی زندگی بسر کرنے کا اسکول کے باہر انتظام ہوتا ہے تاکہ بچے کے دماغ میں علم کا شوق ویسا ہی بیدار ہو جائے جیسا کہ قوم کے دماغ میں خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ اسکول میں مختلف قسم کی سرگرمیاں کافی مقدار میں مہیّا کر دیں، اور علم کا ذخیرہ وافر ہے، اور اگر استاد علم اور پُرشوق عمل کے قدرتی تعلق کو سمجھتا ہو تو بچّے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لطف بھی اُٹھائیں گے اور اسکول سے محبت کرنے لگیں گے۔ ڈوی کچھ اسی قسم کی بات کہتا تھا، اس کی وہ چھوٹی سی کتاب "اسکول اور معاشرہ" (School and Society, ) جس میں پہلی مرتبہ یہ بات کہی گئی تھی اتنی مقبول ہوئی کہ درجنوں زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، ان زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے جو اس کے وطن سے بہت دور رہیں مثلاً چینی اور جاپانی زبانیں۔

لیکن ڈوی کبھی ایک ڈوی اسکول قائم نہ کرتا اگر اس میں ایلس چیمین کا ہاتھ نہ ہوتا۔ ڈوی سوائے سوچنے کے کچھ نہ کرتا تھا (کم از کم ایلس کو اکثر ایسا ہی معلوم ہوتا تھا) تا وقتیکہ کوئی اسے پُرزور انداز میں کسی کام کے لئے آمادہ نہ کرے سوائے غور و خوض کے کوئی دوسری چیز اسے اہم نہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ مکمل طور پر خارج بین ( Extrovert. ) تھا، لیکن یہ خارج بینی اس کے دماغ کے اندر ہی رہتی تھی۔ تخیلات اس کے نزدیک اصل شے تھے اور تنہا یہی اشیا ولولہ انگیز انداز میں اس کے لئے جاذبِ توجہ تھیں۔ اگر اس کے دماغ میں کوئی نیا اہم خیال آجاتا تھا تو وہ چپ چاپ اسے مکان میں لئے پھرتا جیسے کہ ایک کُتا ہڈی لئے پھرتا ہے، اور ان انسانوں کو جن سے بچنا مشکل ہوتا تھا نیز ان کی آپس کی بات چیت کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا اور اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اسے کسی طرح پریشان نہ کریں۔ صرف ایسے ہی مزاج کا آدمی جس نے باوجود اس مزاج کے انسانی زندگیوں اور ان کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا دُنیا کو وہ عظیم امداد دے سکتا تھا جو ڈوی نے دی۔

مسز ڈوی اس کے خیالات کو سمجھ لیتی تھی (اور اس کو بھی گرفت میں لے لیتی تھی) اور اصرار کرتی تھی کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ وہ خود بڑا روشن اور تیز دماغ رکھتی تھی اور قدرت نے اسے ڈوی سے بہتر طرزِ ادا عطا کیا تھا اور وہ ایک پرجوش عورت تھی۔ اس کے دل میں لوگوں کی نیز ان کے خیالات کی اصلاح کے لئے بڑی تڑپ تھی۔

وہ ڈوی کی ذہانت کے لئے پرستارانہ حسن ظن رکھتی تھی لیکن کسی فیصلہ پر

پہونچنے کے لئے جب ڈوی تصوراتی پس و پیش کا ایک بھاری بوجھ اُٹھائے ہوئے معلوم ہوتا تھا تو بحیثیت ایک عورت کے وہ بہت بے صبری محسوس کرتی تھی۔ مسز ڈوی کے اپنے فیصلے نہایت تیز، راست اور سختی سے حقیقت پسندانہ ہوتے تھے (بعض اوقات ان کی اصل وجوہ سے اسے آگاہی نہ ہوتی تھی) وہ ڈوی سے کہا کرتی تھی "تم ہمیشہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے دور کا راستہ چلتے ہو"۔ اپنی بیوی کے اثر کے متعلق ڈوی کی رائے یہ ہے کہ وہ ان ذہنی فیصلوں میں جن پر وہ پہونچتا تھا زور پیدا کر دیتی تھی اور جس چیز کی ان میں کمی ہوتی تھی وہ بھی ان میں داخل کر دیتی تھی۔ اس نے یہ بات بھی یاد کی کہ انہیں نے اسے یہ سکھایا تھا کہ دوسروں کی باتوں میں اسے آسانی سے نہیں آنا چاہیئے۔

یہ الفاظ ڈوی نے استعمال نہیں کئے تھے۔ اس نے کہا تھا "مسز ڈوی نے بعض گہری اخلاقی نصائح سے جو "کسی پر اعتراض نہ کرو" کی قسم کی تھیں مجھے نجات دلادی اور مجھے یہ سکھایا کہ میں اپنے مخالفانہ وجدان کا بھی ویسا ہی احترام کروں جیسا کہ اپنے خوش آیند وجدان کا کرتا ہوں"۔ مختصر یہ ہے کہ وہ اسے اصل دُنیا کی طرف کھینچ کر لاتی رہی اور چونکہ خود اس کے فلسفہ کا یہ اصرار تھا کہ اصل جگہ یہی ہے جہاں انسان کو رہنا چاہیئے۔ اس لئے کم از کم اصولاً وہ ہمیشہ کھینچ کر یہاں آنے کو تیار رہتا تھا۔

مسز ڈوی اس وقت جیسا کہ قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ڈوی اسکول کی پرنسپل تھی۔ اس اسکول کے ٹھوس کام کرنے کی نیک نامی زیادہ تر مسز ڈوی اور ایلا فلاگ ینگ سے جو شکاگو کی مشہور ناظمہ مدارس تھی منسوب کی جاسکتی ہے

ڈوی ایلا فلاگ ینگ کو اس وقت کے رائج اسکولوں میں عاقل ترین شخص مجھتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا "میں اس کے پاس اپنے ان تجریدی خیالات کو لیکر جاتا تھا اور وہ مجھے بتا دیتی تھی کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ ایک دوسری خاتون جو اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل ہیں وہ مسز چارلس آر کرین ہیں جو غسلخانوں کی تنصیبات کا کام کرنے والے لکھپتی کی بیوی تھیں۔ انھوں نے سرمایہ کا ایک بڑا حصہ اسکول کے لئے دیا اور ڈوی خاندان کو باقی سرمایہ حاصل کرنے میں مدد دی ان کے علاوہ ایک مسز ایمنس بلین تھیں جو شان دار مصلحین کی اس مختصر جماعت کے جوش اور ولولہ میں حصہ لینے کے علاوہ میک کارمک ڈالروں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ ان ڈالروں نے ڈوی اسکول کے قایم کرنے میں بہت زیادہ مدد دی اور جب وہ ان ڈالروں کو دس لاکھ کی تعداد میں ایک ساتھ ہڑپ کر جانے پر مجبور ہوئے تو اس اسکول کا یکایک خاتمہ ہو گیا۔

یہ افسوس ناک قصہ جس نے ڈوی کی پوری زندگی کے رُخ اور کسی حد تک اس کا رنگ و روپ بدل دیا طویل مدت تک لوگوں کے علم میں نہ آیا۔ مسز ڈوی چاہتی تھی کہ ڈوی اسی وقت اس کے متعلق ایک بیان دے کر عوام کو اس سے آگاہ کر دے، لیکن ڈوی نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی ذہنی کوفت کو پی جائے اور کسی کو اس سے مطلع نہ کرے۔ چنانچہ ہر شخص تقریباً پینتیس سال تک اس قصہ کی تفصیلات جاننے کا منتظر ہی رہا۔ مختصراً یہ قصہ جیسا کہ ڈوی کے حافظہ میں اس وقت موجود تھا حسب ذیل ہے:۔

مسز بلین نے وہ دس لاکھ ڈالر کا عطیہ ابتداءً ایک دوسرے تعلیمی مصلح

کرنل پارکر کو دیا تھا جو تعلیمی معاملوں میں حیرت انگیز ذہانت کا حامل تھا اور جس نے اس رقم سے ایک اسکول جس کا نام شکاگو انسٹی ٹیوٹ تھا قایم کیا تھا۔ پارکر میں بچوں کو قابو میں رکھنے کی زیادہ اہلیت تھی لیکن لاکھوں ڈالروں سے نمٹنے کا وہ اتنا اہل نہ تھا اور اس کے علاوہ جلد ہی اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ پارکر کی رضامندی سے مسز بلین نے آخر کار پریذیڈنٹ ہارپر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ پارکر کے اسکول اور ڈوی کے اسکول کو متحد کر دیا جائے اور مذکورہ عطیہ شکاگو کی یونیورسٹی کو منتقل کر دیا جائے۔ اس وقت ڈوی اسکول ایک خوشحال ادارہ تھا۔ اس میں تیئس استاد اور ایک سو چالیس بچے تھے۔ شکاگو انسٹی ٹیوٹ جن مصائب میں مبتلا تھا وہ یہاں بالکل نہ تھے۔ اس کے نظری اصول اگرچہ پارکر اسکول کے اصولوں سے بہت مشابہ تھے لیکن بالکل وہی نہ تھے اور اسے دس لاکھ ڈالر کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجوزہ تبدیلی کی اسی بنا پر پرزور مخالفت کی گئی اور ایک سال تک وہ تجویز معرض التوا میں رہی۔ یہ مخالفت ڈوی اسکول کے بچوں کے والدین کی طرف سے تھی۔

لیکن ہارپر اس دس لاکھ ڈالر کی رقم کو یونیورسٹی کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اگلے سال جب کہ ڈوی مشرق کی طرف گیا ہوا تھا اور میدان خالی تھا اس نے مسز بلین کے ساتھ دوبارہ وہ بات چیت شروع کی۔ جب ڈوی واپس آیا تو الحاق تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ پریذیڈنٹ نے ڈوی کو اپنے دفتر میں بلایا اور نمائشی جذبہ کے ساتھ کہا کہ "آخر کار ہمارے خواب کی تعبیر نے عملی صورت اختیار کر لی۔" چونکہ ڈوی نے وہ خواب کبھی نہ دیکھا تھا بلکہ اس کی خواہش

اس کے بالکل خلاف تھی اور چونکہ ہارپر نے تجرباتی اسکول کے لئے کبھی کوئی رقم نہیں دی تھی اس نے یہ محسوس کیا کہ معاملہ کے اس مرحلہ تک پہونچنے سے پہلے اس سے مشورہ کیا جانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ وہ ملاقات باہمی کشیدگی کے انداز میں ہوئی اور جب پریزیڈنٹ ہارپر نے اس سے آخری بات چیت میں شریک ہونے کے لئے کہا تو ڈوی نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا "چونکہ آپ نے اس بات چیت کو میری غیر موجودگی میں شروع کرنا پسند کیا ہے۔ اس لیئے میری تجویز ہے کہ آپ خود ہی اسے ختم کر دیں۔ آپ جب شرائط طے کر لیں گے تب میں یہ فیصلہ کروں گا کہ آیا میں اس کام میں تعاون کر سکتا ہوں یا نہیں"۔ ہارپر نے کہا کہ "مجھے اس بات سے نفرت ہونی چاہیئے کہ میں یونیورسٹی کے ٹرسٹیوں کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ تمھاری ضد کی وجہ سے یونیورسٹی کو دس لاکھ ڈالر کا نقصان ہوگیا۔

ڈوی نے بتلایا کہ وہ ایک تعلیمی تجربہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ یونیورسٹی کو ایک عطیہ دلانے کا ذمہ دار نہ تھا۔ اس نے پریزیڈنٹ ہارپر کو یہ بھی بتایا کہ (اگرچہ مجھے یقین ہے کہ اس کے الفاظ یہ نہ تھے) کہ اگر وہ آخری بات چیت میں شریک ہو سکا تو وہ یہ توقع کرے گا کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور پانچ ہزار ڈالر سے سات ہزار ڈالر کیئے جائیں۔ پریزیڈنٹ ہارپر نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اتنی خطیر تنخواہ کے سوال پر اس کے شرکائے کار ڈوی سے ناراض ہوں گے لیکن ڈوی نے خیال کیا کہ وہ اس ناراضی کی پرواہ نہ کرے گا۔ ڈوی نے اس کے متعلق ان الفاظ میں رائے زنی کی۔ "ان زیادہ

تنخواہ کے مطالبہ سے مجھے بحیثیت ایک انسان کے اتنی زیادہ وقعت حاصل ہوئی جتنی میری زندگی کے کسی دیگر فعل سے نہ ہوئی تھی"۔

دوسری شرط ڈوی نے یہ رکھی کہ اس کا درس دینے والا عملہ بشمول ڈوی کے جو پرنسپل تھی نئے انتظام میں اپنا کام بدستور جاری رکھے گا۔ ہارپر نے ڈوی سے گفتگو کے دوران میں اس پر رضامندی ظاہر کی لیکن جب وہ مسز بلین سے گفتگو کر رہا تھا جو کرنل پارکر کے عملہ میں خاص دلچسپی لیتی تھی تو اس نے کہا کہ یہ انتظام صرف پہلے سال کے لئے ہے۔ اس نے مزید کہا کہ مسز ڈوی خاص طور پر یہ ارادہ رکھتی ہیں کہ جونہی اسکول چلنے لگے گا وہ استعفےٰ دے دیں گی۔ اس معاملہ نے اسے مشکل میں پھنسا دیا لیکن اسے ایک سال کا وقت مل گیا۔ جس کے دوران میں وہ اس سے نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے لئے اس وقت کا انتظار کیا جب ڈوی پھر مشرق چلا گیا، تب اس نے مسز ڈوی کو بلا کر کہا کہ پروفیسر ڈوی نے مجھ سے کہا تھا کہ مسز ڈوی استعفےٰ دینا چاہتی تھیں۔

چونکہ ڈوی نے اس سے یہ کبھی نہیں کہا تھا اور اس کے علاوہ ہی کی یہ عادت بھی نہ تھی کہ وہ مسز ڈوی سے کہے کہ یہ کام کرو یا نہ کرو۔ اس نے اس اطلاع کو ایسے سکون سے سُنا جس سے پریزیڈنٹ ہارپر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ جب ڈوی واپس آیا تو ہارپر نے اس سے کہا "مسز ڈوی غیر معمولی طور پر باوقار خاتون ہے"۔

لیکن اب ڈوی کا تنزل شروع ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسز ڈوی

میں بحیثیت ایک منتظمہ کے کچھ خامیاں تھیں جن کا سبب اس کی طبیعی نیکیاں تھیں۔ وہ ایک اچھی قسم کی ملنے جلنے والی خاتون نہ تھی۔ اسے قدرت نے یہ عجیب ملکہ دیا تھا کہ وہ حیلہ باز آدمیوں کو پہچان لیتی تھی اور پھر ان کا ایسا مذاق اُڑاتی تھی کہ جس سے وہ لوگ بھی ڈرنے لگتے تھے جو حیلہ باز یا کم از کم زیادہ دھوکے باز نہ تھے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک بوداپن تھا جو صاف ظاہر ہو جاتا تھا یعنی اسے خوف رہتا تھا کہ وہ متکبر نظر نہ آئے اور یہ چیز اس کی نمایاں برتری کے باعث بعض اوقات حقارت آمیز سرد مہری نظر آتی تھی۔ لیکن وہ ڈوی کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا تنہا ذریعہ تھی اور وہ ان خیالات کو عمل میں لانے کے لئے اپنے آپ کو اتنا پابند سمجھتی تھی کہ ڈوی اسکول سے اس کا ہٹنا اس کے لئے کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے علاوہ ڈوی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے دوسرے تربیت یافتہ مدرس بھی اسی طرح چالاکی سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ نام کے لئے وہ اسکول کا سربراہ ہوگا لیکن اس کا انتظام اس کے ہاتھ میں نہ ہوگا پریزیڈنٹ ہارپر سے اس کی وہ ملاقات جس میں گرما گرمی پیدا ہو گئی تھی اس طرح ختم ہوئی کہ ڈوی نے تعلیم کی پروفیسری سے استعفٰے دے دیا جب وہ کمرہ کے دروازہ سے باہر نکلا تو اسے احساس ہوا کہ ہارپر کے چہرہ پر اس کے استعفٰے دینے سے اطمینان کے آثار نظر آئے تھے۔ وہ گھر چلا گیا اور اس نے فلسفہ، نفسیات اور تعلیم تینوں شعبوں کی پروفیسری سے علیحدہ ہونے کے لئے استعفٰے لکھ کر بھیج دیا۔

اس طرح ڈوی اسکول کا خاتمہ ہو گیا جیسا کہ اس ایک مدّت تک

دبائی ہوئی کہانی سے ظاہر ہوتا ہے جو ڈوی کے دماغ میں اب تک گہرے طور پر نقش تھی۔ جب میں نے اس سے اس کہانی کو بیان کرنے کی اجازت مانگی تو اوّل اس نے یہ کہا:

"میں اب اس کا بیان کیا جانا پسند نہیں کرتا کیونکہ ہارپر فوت ہو چکا ہے۔" میں نے جواب میں کہا: "اگر وہ فوت ہو گیا ہے تو اسے اب اس کے بیان سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔" اس نے کہا: "اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ جواب دے سکتا تھا۔" میں نے بطور دلیل جواب دیا۔ "کوئی نہ کوئی اسے ضرور بیان کرے گا۔ اگر آپ اسے بیان کرنے میں جلدی نہ کریں گے تو پھر آپ بھی جواب نہ دے سکیں گے۔"

آخر کار اس نے کہا: "اچھا ٹھیک ہے۔ مسز ڈوی کی ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس پورے معاملہ کو اسی وقت جب یہ پیش آیا تھا شائع نہ کرانے میں میں نے غلطی کی تھی اس میں مجھ سے زیادہ دلیری اور جرأت ہے۔"

ڈوی اسکول کے ختم ہونے کے ساتھ ڈوی کی زندگی کا ایک پُرمسرّت اور نہایت خوشحالی کا دور ختم ہو گیا۔ مسز ڈوی کی تنخواہ اور جو آمدنی وہ کتابوں اور لیکچروں کے ذریعہ سے حاصل کر لیتا تھا یہ مل کر اس غیر بادری فلاسفر" کی یافت اتنی زیادہ ہو جاتی تھی کہ جارلٹ ورمانٹ میں کسی نے اتنی آمدنی کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ یہ خاندان دو ملحقہ حصّوں میں رہتا تھا، اور دو ملازم، ایک نرس اور ایک جزوی وقت کے لئے کپڑے دھونیوالی عورت ان کے یہاں کام کرتے تھے انھوں نے موسم گرما کے لئے ایک آرام دہ

مکان ایڈیرن ڈیکس میں تعمیر کرالیا تھا۔ مسز ڈوی کوئی نہایت صاف ستھری یا زیادہ ماہر خانہ داری نہ تھی، وہ منصوبے بنانے والی، زیادہ دانہ انداز رکھنے والی یا زیادہ محبت کرنے والی عورت بھی نہ تھی، تاہم وہ اتنی ذہین تھی کہ خاص ضروریات کے مہیا کرنے میں کوئی کمی نہ رہتی تھی مثلاً اچھا کھانا، اچھے قالین اور فرنیچر اور اچھے ساتھی۔ باوجود اس کے اس بنیادی عزم کے کہ موقع ملنے پر اصلاحی کام سے گریز نہ کیا جائے وہ بحیثیت مجموعی خوش مزاج تھی اور اس سے تعلقات نباہنا دشوار نہ تھا، لیکن اسکے شوہر کے اعلیٰ خیالات کے ساتھ جو یہ بھدی اور افسوسناک ناانصافی ہوئی نیز اس کے شدید محنت کے کام کی جو ان خیلات کو بروئے کار لانے کیلئے اس نے کیا تھا (جس کے بارے میں وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے معاشرتی زندگی کی بنیادوں کو تبدیل کردے گا)، جو ناقدری ہوئی اس نے اسکے سینہ میں ایسا غم و غصہ پیدا کردیا جو قطعی طور پر کبھی ختم نہ ہوا۔

ڈوی بے شک زیادہ عرصہ تک بے روزگار نہ رہا۔ فلسفہ اور تعلیم میں اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کے علاوہ اس نے امریکن سائیکلوجیکل ایسوسی ایشن (امریکی انجمن علمِ نفسیات") پریزیڈنٹ کی حیثیت سے حال میں ایک ٹرم (مقررّہ مدت) کو پورا کیا تھا۔ فلسفہ۔ نفسیات یا تعلیم کی پروفیسری کی جگہ تقریباً ملک کی ہر یونیورسٹی میں اسے مل سکتی تھی۔ فی الحقیقت سب سے پہلے اسے ایک ماہر نفسیات جے میک کین نے کولمبیا میں فلسفہ کی پروفیسری پر بلایا اور اس کے معاہدہ میں یہ مد بھی رکھی گئی کہ وہ اپنے تعلیم سے متعلق

خیالات کو مدرسین کے کالج میں بیان کیا کرے۔

ڈوی اور مسز ڈوی دونوں اسی ضرب کے اثر سے جوان کی زندگی کے اہم ترین کام کو پہونچی تھی استقلال سے کام لے کر نجات حاصل کر سکتے تھے۔ اگر بدقسمتی سے ان پر ایک دوسری مصیبت ایسے ذاتی نقصان کی شکل میں نہ پڑتی جیسا وہ اس سے قبل ایک مرتبہ بھگت چکے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قسمت نے جان بوجھ کر اس نقصان کو دُہرانے کے لئے اس خاص وقت کو منتخب کیا تھا۔ یورپ کے ایک سفر میں اس زمانہ میں جب کہ ڈوی کو دوسری ملازمت نہ ملی تھی ان کا نہایت لائق اور ہونہار بیٹا گارڈن آئرلینڈ میں ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ ہم صرف اس کے بچہ مورس کی اعلےٰ خوبیوں کے بارے میں ڈوی کے الفاظ کی شہادت رکھتے ہیں لیکن گارڈن نے اپنے آس پاس کے لوگوں کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اس کی یاد میں شکاگو کے ہل ہاؤس میں سروس (خاص مراسم عبادت) منعقد کی گئی، اور جین ایڈمس نے ایک تقریر کی جو اس کی ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ جو کچھ اس نے اس "اپنے وقت کے چھوٹے ہیرو"، اخبارات کے انتھک پڑھنے والے، ایک نفیس اور دلیر طبیعت کے حامل، وسیع اور متحمل عقل اور زندگی کے مزاح اور لطف کی سمجھ بوجھ رکھنے والے کے بارے میں کہا ہے اسے پڑھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ صرف آٹھ سال کا بچہ تھا۔ اس بنا پر باوجود اس غیر سائنسی نمی کے جو ڈوی کی آنکھوں میں اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ ان بچوں کا ذکر کرتا ہے ان کے غیر معمولی اوصاف کے متعلق خود اس کی اپنی رائے محض

بظاہر معقول معلوم ہوتی ہے۔

اٹلی میں ڈوی اور مسز ڈوی نے ایک یتیم لڑکے کو جس کا نام سابینو تھا متبنیٰ بنا لیا اور اس طرح انھوں نے عام سمجھ بوجھ کے مطابق اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی جو ان کے دل میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن ڈوی اپنی زندگی کے پسندیدہ کام اور اپنے سب سے پیارے بیٹے کے دُہرے نقصان کی تکلیف سے کبھی پورے طور پر نجات حاصل نہ کر سکا۔ پریزیڈنٹ ہارپر کی کارروائی اسکے دل میں اتنی شدت سے کھٹکتی رہی کہ پینتیس سال بعد جب اس نے اس شخص کی بھونڈی قسم کی چالاکی پر اپنے آپ کو ہنستا ہوا پایا تو اس نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔

اس معاملہ میں میرا خیال ہے کہ وہ مسز ڈوی سے متاثر ہوا تھا جسکے دل میں اس افسوسناک واقعہ کا زخم زیادہ گہرا تھا۔ مسز ڈوی میں رہنما بننے کی حقیقی استعداد تھی اور اس کی وہ پرجوش آرزومند بھی تھی لیکن وہ اس آرزو کے بر آنے کے مواقع سے محروم ہو گئی نیز اسی وقت اسے بحیثیت ماں کے مذکورہ صدمہ اُٹھانا پڑا لہٰذا اس دُہرے رنج کے اثر سے وہ رفتہ رفتہ غصّہ کرنے کی عادی ہو گئی۔ پرشوق باتیں کرنے کے بجائے اب وہ طعن آمیز باتیں کرنے لگی۔ اور مبصرانہ تنقید کے بجائے بیجا نکتہ چینی کی عادی ہو گئی۔ اس کی صحت گرنے لگی۔ اس نے اب تک جتنا کام کیا تھا اور جتنے بچوں کی ماں بنی تھی وہ اس کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے زیادہ تھا۔ تاوقتیکہ اسے خوشی اور مسرت کا سہارا نہ ملتا۔ جتنا کم کام وہ خود کر سکتی تھی اتنا ہی اس کا یہ

عقیدہ بڑھتا جاتا تھا کہ ہر کام بالکل مکمل طور پر ہونا چاہیئے۔ وہ اس پر مصر رہتی تھی کہ ہر شخص حتی المقدور بہترین کام کرے اور بالکل ٹھیک کرے اور یہ اصرار اس برائی میں تبدیل ہو گیا جسے طنز آمیز اعتراض کرنے کی عادت کہنا چاہیئے۔ اس کے شوہر کا یہ انداز کہ وہ بے فکری سے اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا اور سوائے سوچنے کے کسی بات کی فکر نہ ہوتی تھی جب کہ وہ خود ہمیشہ کام کرنے کی آرزومند رہتی تھی اسے شاق گزرنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے یہ مسلسل اعتراض کرنے کی عادت اس کی طبیعت ثانی ہو گئی اور اس نے اسکی ظرافت آمیز دل فریبی میں تلخی پیدا کر دی یہاں تک کہ ۱۹۲۷ء میں شریانوں کے سخت ہو جانے کے مرض سے اس کی موت واقع ہوئی۔

اس کیفیتِ مزاج کی ناہمواری کے باوجود جس کے ساتھ ڈوی نے اپنا مقامِ رہائش تبدیل کیا مشرق کی جانب اس کا جانا جب کہ اس کی عمر چالیس سال کی تھی ذہنی اعتبار سے اس کے لیے اچھا ثابت ہوا۔ کولمبیا میں اس کو ایسے لوگوں کی ایک جماعت ملی جو ہیجان انگیز طبائع کے مالک تھے جارج ایچ، میڈ کے ساتھ اس کی جو دوستی تھی (جو حیاتیات کے فلسفیانہ مفاہیم کی ترقی و توسیع میں اس کا ساتھی رہا تھا) اس کے بدلے میں فریڈرک جے، ای وڈبرج کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی جس میں منطقیانہ مباحث کی اور زیادہ گنجائش تھی۔ پروفیسر وُڈبرج مستند معیاری قسم کا فلسفی تھا۔ ڈوی کا بیان ہے کہ "میں نے پروفیسر وُڈبرج سے بہت کچھ سیکھا لیکن جس چیز کی وہ تعلیم دیتا تھا اسے میں نے نہیں سیکھا۔" اس نے جیمس ہاروے رابنسن سے بھی بہت کچھ

سیکھا۔ یہ شخص "مغربی یورپ کی عقلی تاریخ" کے کورس کو اس جملے سے شروع کرتا کیا تھا "جبکہ میں خدا کا ذکر کرتا ہوں تو میں چاہتا ہوں کہ کلاس ذرا آرام کرے" چارلس بیارڈ سے جو امریکن تاریخ کا درس دیتا تھا اور اس کا انداز بھی بانیانِ مذہب کی نسبت ویسا ہی بے ادبانہ تھا، اور ویسلے میچل سے بھی جو "کفایت شعار شخص" کے خلاف اسی قسم کی بغاوت کا رہنما بنا ہوا تھا اس نے بہت کچھ سیکھا۔

عام طور پر ان دنوں کولمبیا کی خشت وگل سے نئے اسالیبِ فکر پھوٹ رہے تھے اور ڈوی کو وہاں ذہنی مسرت حاصل تھی نیز نیویارک میں رہنے کی صورت میں اسے قومی سطح پر بلدیاتی تحریکات میں حصہ لینا اور قوم کی سیاسی زندگی کا ایک جزو بننا آسان معلوم ہوتا تھا، اور یہ ایک ایسے فلاسفر کے لئے قطعی مناسب بھی تھا جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ کسی اسلوبِ فکر کی سچائی کی کسوٹی اس کی عملی اثراندازی ہے۔ اس نے ایک کمرہ براڈوے اور ۵۶ اسٹریٹ کے موڑ پر لے لیا۔ یہ کمرہ چوتھی منزل پر تھا اور دونوں گلیاں اس کے سامنے تھیں۔ اس طرح اس نے اس امر کا انتظام کیا کہ کافی شوروغل میں رہ کر وہ کچھ غوروخوض کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ علمی تجرید سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ حقیقی چیزوں کے متعلق غور کرنا چاہتا تھا اور براڈوے اسٹریٹ کی گاڑیاں ایسی ہی حقیقی چیزیں تھیں جیسی کوئی دیگر چیز ہوسکتی ہو۔ ایسے شخص کے لیئے جس کے کان کے ڈھول حساس ہوں وہ جگہ قطعی دوزخ تھی۔

بعدازاں وہ لانگ آئی لینڈ منتقل ہوگیا اور اس نے حقیقت سے اپنا

تعلق رکھنے کے لئے انڈے اور ترکاریوں کے پیدا کرنے اور انھیں پڑوسیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کا انتظام کیا۔ اپنی مخصوص قوتِ عمل کے ذریعے اس نے زراعت کے متعلق سب کچھ سیکھ لیا اور ایک سال کے دوران میں اس نے اپنی گذر اوقات کے لئے واقعی کافی روپیہ پیدا کر لیا۔ والٹ وہٹمین کی جائے پیدائش سے اس کا فارم اتنی دور تھا کہ تھوڑی دیر میں آدمی وہاں پہونچ جاتا تھا اور وہاں اب بھی ہلکے بنفشئی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے، والٹ وہٹمین کی طرح وہ بھی حقیر زمین کی ہمنشینی کو محبوب رکھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مسکین لوگوں سے بالکل متشابہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ خوش ہوا۔ جب ایک دن ایک امیر ہمسایہ کے یہاں سے ایک درجن انڈوں کے لئے فوری مانگ آئی۔ چونکہ بچّے اسکول میں تھے وہ خود ایک ڈبا میں انڈے رکھکر لے گیا۔ اپنی عادت کے تحت وہ سامنے کے دروازے پر لئے جاتے ہیں۔ وہ فرمان برداری کے ساتھ دوڑتا ہوا پچھلے دروازہ پر گیا۔ اس طرح وہ مزا لے رہا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ پڑوس کے ایک زنانہ کلب میں تقریر کر رہا تھا اور اس کا وہی امیر گاہک اس کے تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہونے پر دھیمی آواز میں چلّایا: "یہ تو بالکل ہمارے انڈے والے سے مشابہ معلوم ہوتا ہے"۔

ڈوی اس وقت ایک نوجوان شخص معلوم ہوتا تھا جو اپنا پیشہ شروع کر رہا ہو۔ وہ رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی شبیہ نظر آتا تھا، ویسے ہی سپاٹ بال اور سیاہ مونچھیں اور ویسی ہی چمک دار آنکھیں۔ ڈوی کی آنکھیں

تقریباً سیاہ تھیں اور محبت آمیز اور ذہانت پاش روشنی کا سرچشمہ تھیں ایسی روشنی جو بمقابلہ ایک منطق کے پروفیسر کی آنکھوں کے ایک سینٹ فرنسس کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم کا باقی حصّہ خوشنما تھا لیکن بہت زیادہ دلنشین نہ تھا۔

وہ اکثر منطقی نظریات کی کلاس میں اس ہیئت میں آتا تھا کہ اس کی ٹائی اس کے کالر سے ہٹی ہوتی تھی، اس کے ٹخنے پر ایک موزہ پڑا ہوتا تھا یا اس کی ایک ٹانگ کی پینٹ کہیں اس کے گیٹس میں پھنسی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ پورے ایک ہفتہ تک اس طرح آتا رہا کہ اس کے کوٹ کی آستین میں ایک بڑا شگاف ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کے کندھے کے قریب ایک کپڑے کا ٹکڑا ایک ننّھے فرشتے کے پَر کی طرح لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بال ہمیشہ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا انھیں تولیہ سے درست کیا گیا ہے۔ اور اگر اس میں مانگ ہوتی تھی تو درمیان میں اس کی وجہ سے اس کا چہرہ کسی قدر بھیڑ جیسا معلوم ہوتا تھا یہ چیز بمقابلہ تیز فہمی کے ان حیرت انگیز آنکھوں میں نرمی کی پُرزور نشان دہی کرتی تھی۔ وہ ایک بغلی دروازہ سے آیا کرتا تھا۔ بڑی مستعدی سے اور تیز قدم اُٹھاتا ہوا، یہ تیزی اس وقت تک قایم رہتی تھی جب تک کہ وہ اپنی کرسی پر نہ بیٹھ جاتا تھا۔ پھر وہ ستاتا تھا۔ اپنی کہنی ڈیسک پر رکھ کر وہ اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر ملتا تھا، اپنے کچھ لٹکے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف کرتا تھا اور اپنا مُنہ سکیڑنے اور طلبا کے سروں اور کھڑکیوں کے اوپر بے پروائی سے دیکھنے لگتا تھا گویا اس کے خیال میں اوپر کی طرف دیوار اور چھت کے درمیان کے دروازہ پر

کوئی تصوّر مل جائے گا۔ ہمیشہ اسے کوئی نہ کوئی تصوّر مل جاتا تھا اور تب وہ بولنا شروع کرتا تھا بہت آہستہ آہستہ اور بغیر کسی چیز پر زور دیئے ہوئے اور کافی دیر تک ٹھہر ٹھہر کے اور اکثر اوپر کی طرف بھی نظر ڈالتا تھا گویا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا وہ صحیح سمت میں جارہا ہے۔

وہ بمقابلہ تقریر کرنے کے سوچتا ہوا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی نظام فلسفہ کو فی البدیہہ مرتب کررہا ہے اور اس میں حسب ضرورت وقت صرف کررہا ہے۔ یہ طریقۂ عمل غیر شخصی اور کسی حد تک اس کے طلبہ سے علاقہ نہ رکھنے والا معلوم ہوتا تھا یہاں تک کہ ان میں سے کوئی طالب علم کوئی سوال کرنا شروع کردیتا، تب وہ چمکدار آنکھیں چھت سے اُترتیں اور اس طالب علم پر چمکنے لگتیں اور وہ اس کے اندر سے اور اس کے معمولی سوال سے ایسے عقلی عجائبات پیدا کرتا تھا جن کے بارے میں وہ طالب علم یہ تصوّر بھی نہ کرسکتا تھا کہ ان کا تخم اس کے اپنے دماغ یا دل میں موجود تھا۔

ڈوی کے طریقۂ تعلیم کی رو سے تعلیم کے معنی اخذ کرنے نہیں ہیں، لیکن اخذ کرنے کا عمل اس کی کلاس میں جتنی اچھی طرح کیا جاتا تھا اس سے اچھا کبھی نہ کیا گیا ہوگا۔ جان ڈوی کا یہ انداز کہ وہ ہر ایک شخص کی خواہ وہ کیسا ہی غبی اور کم درجہ کا ہو ہر بات کا جبلی طور پر اور پُر زور انداز میں احترام کرتا اور اس پر غیر مشروط توجہ مبذول کرتا تھا نادر الوجود اوصاف یا بنوع کے کمالات میں سے ایک وصف یا کمال تھا۔ اس کا معاشرتی انداز جمہوریت کی خوبیوں کا ویسا ہی مجسمہ تھا جیسا کہ والٹ وہیٹمین کی ایک کتاب میں

نظر آتا ہے۔

جان ڈوی کی ایک دوسری خصوصیت جو کلاس میں بہت پُر اثر ثابت ہوتی تھی (اور میرا خیال ہے کہ اور کے پیرے میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے) اس کا ذاتی وقار تھا۔ اگرچہ اس کے لباس سے بے پروائی کا اظہار ہوتا تھا لیکن وہ کبھی باطن کے اعتبار سے بھدّا نہ معلوم ہوتا تھا جیسے کہ بہت سے سنکی پروفیسر ہوتے ہیں۔ آپ اس کی اخلاقی قوّت کو ضرور محسوس کرتے اور اس کے خمیدہ اور بوجھل انداز کے باوجود اس کے سخت ضبط نفس کی طاقت کو محسوس کرتے۔ آپ کو یہ بھی محسوس ہوتا یا جلد یہ معلوم ہو جاتا کہ باوجود بدعتوں سے اس قدر دل چسپی رکھنے کے جان ڈوی اپنے کام کو خوب جانتا تھا۔ وہ ایک ماہر فلسفی تھا۔ اس نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن پر اس کے علمی روایات کے شرکائے کار بہت چراغ پا ہوئے لیکن اس نے کبھی کوئی بات اناڑیوں کی طرح ناقص نہیں لکھی جیساکہ جیمس اور شیلر دونوں نے کیا ہے۔ جو نظریہ عملیت کو فروغ دینے میں اس کے ہم پلہ رہنما تھے۔ اس کا حال حیرت انگیز تھا۔ وہ ایک عالم فاضل بھی تھا اور کبھی بھولنے والا دوست بھی۔

لیکن ایک علمی کام ایسا تھا جو ڈوی نے کبھی انجام نہیں دیا اور اس کی یہ بے پروائی بہت قابل افسوس ہے۔ اس نے کبھی (کم از کم اپنی زندگی کے آخری حصّے تک) کارل مارکس کے فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا نوجوانوں کی دو پشتوں تک وہ انقلابی جمہوریت کے رہنما کے مرتبہ پر فائز رہا

اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مارکس ازم (                ) ان کی جنگ بلند اکثریت کو جمہوریت کے مخالف یا نام نہاد اعلیٰ جمہوریت کے حامی گروہ کی جانب بہائے لئے جا رہا تھا، لیکن وہ ہمیشہ اس موضوع پر یہ کہنے پر قناعت کرتا رہا کہ "میں نے کبھی مارکس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ میں اس موضوع پر وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اسے مارکس کا مطالعہ کرنا چاہیئے تھا اور اس موضوع پر صرف وثوق کے ساتھ ہی نہیں بلکہ جوش و خروش کے ساتھ بولنا چاہیئے تھا مارکس اس کا خاص دشمن تھا۔ بائیں بازو پر وہ تنہا دوسرا شخص تھا جو ایک نظام فلسفہ سے ایک سیاسی پروگرام کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ جب سڈنی ہک اور میں جو اس کے جو خود رائے شاگرد تھے ایک نازیبا سی جنگ اس سوال پر کر رہے تھے کہ آیا مارکس نظریۂ عملیت کا سائنسی طریق پر حامی تھا۔ میں نے ڈوی کو یہ معلوم کرنے کیلئے ایک خط لکھا کہ آیا وہ اس مباحثہ کی صدارت کے لئے جو ہمارے درمیان مذکور موضوع پر ہو رہا ہے آ جائے گا۔ اس جواب سے جو اس نے دیا ظاہر ہوتا ہے کہ اسے خود اس کا احساس تھا کہ وہ ایک فرض کو پس پشت ڈال رہا تھا۔ خط کا مضمون یہ ہے :۔

تمہارا خیال سلیقہ مندانہ اور مسحور کن ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے مارکس کے متعلق کافی علم نہیں ہے جس کی بنیاد پر میں اس کارروائی میں حصہ لے سکوں اور مجھے اس کا ذرا بھی امکان نظر نہیں آتا کہ میں ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے وقت نکال سکوں۔ جب میں تم سے بات کرتا ہوں تو میں خیال

کرنے لگتا ہوں کہ تم جو کہتے ہو ضرور صحیح ہے اور اس کے خلاف جب میں سِڈنی سے بات کرتا ہوں تو بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔ یہ بلاشبہ قابلِ افسوس اقبالِ عجز ہے لیکن یہ مجھے کرنا پڑتا ہے۔

پُرخلوص اگرچہ قصوروار
"جان ڈوی"

اس قصورواری نے جان ڈوی اور اس کے زیادہ ضدی شاگردوں کے درمیان اس اختلاف کو جو امریکہ کی پہلی عالمی جنگ میں شریک ہونے کے مسئلہ پر تھا اور زیادہ سخت بنا دیا۔ ان لوگوں کو زیادہ تر مارکس ہی کی تائید حاصل تھی جو امریکہ کی اس جنگ میں شرکت کے مخالف تھے اور ڈوی جنگ میں شرکت کے حق میں تھا لیکن مارکس کی تردید نہ کرتا تھا۔ یہ مسائل اب بے وقعت معلوم ہوتے ہیں جب کہ تاریخ نے مارکس کو غلط ٹھہرا دیا ہے۔ اور جب کہ ڈوی کا مرکزی موضوع "جمہوریت اور تعلیم"، تقریباً تیسری عالمی جنگ کا نعرہ بن سکتا ہے۔ لیکن ان ایام میں اس کے بعض نہایت معتقد شاگردوں کے دل میں اس کے لئے تلخی اور تحقیر آمیز خیالات تھے۔ ان میں سب سے نمایاں خداداد قابلیت رکھنے والا انجارین ڈولف پورنے ( ) تھا۔ ڈوی اور اس کے مخالفوں کی تاریخ میں یہ بحران بہت اہم تھا۔ وہ نہ صرف ان لوگوں سے برگشتہ ہو گیا تھا بلکہ میرے خیال میں جرمنی کے خلاف جنگ کی تائید کر کے وہ خود اپنی ذات سے بھی کسی قدر برگشتہ ہو گیا تھا۔ اس کا احساس نہ اس وقت یہ تھا اور نہ

بعد کو یہ ہوا کہ اس نے قطعی غلط انتخاب کیا تھا، لیکن اس کے فلسفہ کی رُو سے ایسا انتخاب نہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ واقعات جن کی بنا پر اس نے یہ انتخاب کیا اس کی توقع سے زیادہ وحشیانہ نکلے۔ اس نے ایک کتاب جرمن فلسفے اور سیاست پر لکھی جو ہمیں کم از کم اس وقت جنگ کے پروپیگنڈے کیلئے ایک تصنیف معلوم ہوتی تھی نہ کہ فکر و تخیل کی تاریخ پر کوئی تصنیف اور نتیجۃً وہ ایسی کشمکش میں مبتلا ہوگیا جو اکثر انسانوں کے لیئے بیماری بن جاتی ہے۔"

اس ناگہانی ضرورت میں اس نے ایک نہایت غیر رسمی قسم کے ڈاکٹر متھاس الیگزینڈر سے رجوع کیا جس نے اس کی زندگی میں ایک نیا باب کھول دیا۔ ڈاکٹر الیگزینڈر آسٹریلیا کا باشندہ تھا۔ اس میں تخلیقی قوت کافی تھی لیکن اس کا دماغ تربیت یافتہ نہ تھا۔ پیشۂ طبابت کے لوگ عموماً اس کی مذمت کرتے تھے لیکن ڈوی کی رائے میں وہ جسمانی انداز اور عضلاتی نظم و ضبط کے متعلق صحیح نظریات رکھتا تھا، اور جسمانی تہذیب و تربیت کا طریق کار جانتا تھا جس سے انسانوں کے جسم کی وہ صحیح حالت پھر نمودار ہو جاتی تھی جو حیوانوں میں قدرتی طور پر موجود ہے۔ ڈاکٹر الیگزینڈر کو لوگ ایسا ہی صاحب دماغ کہتے تھے جیسا برنارڈ شاہ اور الڈوس ہکسلے کو اس کے طریقۂ علاج نے ڈوی کے معاملہ میں واقعی کام کیا۔ ڈوی نے کہا ہے "میں خمیدہ ہو جاتا تھا اور بار بار پہلو بدلتا تھا۔ اب میں سیدھا بیٹھتا ہوں۔" اس کے دوستوں میں سے ہر ایک اس دعوے کی تصدیق کرتا تھا اور جب وہ یہ کہتا تھا کہ آدمی بوڑھا اس وجہ سے ہو جاتا ہے کہ وہ جھکا رہتا

ہے۔" تو اس کے خلاف اس کے ساتھ بحث کرنا مشکل ہوتا تھا کیونکہ وہ بوڑھا نہ ہونے کے فن میں ماہر تھا۔ جب ان کو آپ سنہ ۱۹۴۰ء میں دیکھتے تو یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ ۱۸۵۹ء سے دنیا میں زندگی گذار رہا ہے۔ ڈوی کے نزدیک اس صفت کے حصول میں ۹۰ فی صد ڈاکٹر الیگزینڈر کی کارگذاری کو دخل تھا اور ۱۰ فی صدی ایک دوسرے باقاعدہ ڈاکٹر کو تھا جس نے اسے یہ سکھایا تھا کہ معدی نالی کے کام کو کیسے جاری رکھا جا سکتا ہے۔

زمانۂ بعد از جنگ میں ڈوی کو یہ موقع ملا کہ وہ اپنے انقلاب پسند معترضین پر یہ ظاہر کرے کہ وہ ایک رجعت پسند بورژوا ( ) نہیں بن گیا تھا اور اس نے یہ بات ثابت کر دی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو یہ دیکھا گیا کہ وہ بہت سے لبرل پارٹی کے جنگ پسند اراکین کے برخلاف بائیں بازو کی طرف زمانۂ قبل از جنگ کے مقابلہ میں اب زیادہ جھکا ہوا تھا۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ اپنی سابقہ آرا میں سے ان پر جما ہوا پایا گیا جو زیادہ سے زیادہ انقلاب پسندانہ تھیں، کیونکہ مدتوں پہلے یعنی ۱۸۸۷ء میں (جب کہ ایک کالج کے پروفیسر کی زبان پر ایسی بات کا آنا اگر جرم نہیں تو ایک حیرت انگیز بات ضرور تھی) جان ڈوی نے کہا تھا "جمہوریت اس وقت تک اصل جمہوریت نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے شہری اور سیاسی ہونے کے ساتھ صنعتی بھی نہ بنایا جائے۔"

چنانچہ امریکی حریت پسندوں ( ) میں ڈوی ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے سب سے پہلے سوویٹ روس کا سفر کیا۔ اس وقت

سفر پر وہ رُکاوٹیں عائد نہیں کی گئی تھیں جو بعد میں اسٹیلن کے تحت اجتماعی ریاست کی "تشدد پسند حکومت نے عائد کردی تھیں) اور جب وہ واپس آیا تو اس کی زبان پر لینن اور ٹراٹسکی کے عہد کی کارگذاریوں کے لئے خصوصاً تعلیمی تحریکوں کے لیئے نہایت زوردار ستائش کے الفاظ تھے اس کے اس عمل کی بدولت اسکا شمار اگر انقلاب پسندوں میں نہیں تو کم از کم امریکہ کے حریت پسندوں کے انتہائی بائیں بازو کے لوگوں میں ہونے لگا تھا اور اسے دوبارہ بین الاقوامی رہنما ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اسے ترکی کی انقلابی حکومت نے انقرہ بُلایا اور اسکولوں کی تنظیم کے لئے ایک منصوبہ تیار کرنے کو کہا اور یہ کام اس نے کر دیا۔ اسے سن یاٹ سن ( ) کے چینی معتقدین نے پیکنگ یونیورسٹی میں لکچر دینے کے لئے دعوت دی اور یہ کام بھی اس نے کر دیا، اور مزید برآں اس نے جاپان کی شاہی حکومت کے پیش کردہ "طلوع آفتاب" ( ) کے اعزازی سلسلہ کے تمغہ کو لینے سے جمہوری خیالات کے تحت انکار کر کے ایک بڑا امتیاز حاصل کیا۔

زمانہ بعد از جنگ میں ڈیوی نے اپنے خیالات کو فنون کی طرف بھی لگایا موسیقی کے لئے وہ کوئی ذوق نہ رکھتا تھا لیکن مصوری کی وہ مبصرانہ قدردانی کرسکتا تھا۔ اس کے مکانات بڑی خوش ذوقی کے ساتھ آراستہ کیئے گئے تھے اور آپ کو ایک یا دو نادر تصویریں اس کے مکان کی دیواروں پر ہمیشہ ملتی تھیں۔ جب وہ ۱۹۲۶ء میں پیرس میں تھا تو اس نے بمقام لوور کے ( ) ایک مصوری کی کلاس میں جسے البرٹ سی بارنیز چلا رہا تھا شرکت کی۔ بارنیز نے

ڈوی کے حلقۂ درس میں بمقام کولمبیا حاضری دی تھی۔ وہ اس کی کتاب "جمہوریت اور تعلیم" کو پڑھ کر اس طرف متوجہ ہوا تھا اور اس کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا کہ وہ کتاب اس کی بائیبل ہے۔ ڈوی بھی بارنیز کے بارے میں یہ رائے رکھتا تھا کہ وہ نفیس ترین دماغ رکھنے والے اشخاص میں سے تھا اور جمالیات سے متعلق نہایت عاقلانہ نظریہ کا موجد تھا۔ ان کی دوستی دونوں کیلئے پہلے باقاعدہ طور پر اور بعد کو غیر رسمی طور پر بارنیز فاؤنڈیشن کا تعلیمی مشیر رہا۔ یہ دو اشخاص مزاج میں ایک دوسرے سے اتنے زیادہ مختلف تھے کہ ہر ایک کے دوست بعض اوقات یہ دریافت کرنے لگتے تھے کہ یکجا جمع ہونے سے وہ کیا تفریح حاصل کرتے ہیں۔ ڈوی یہ بات بڑی خوشی کے ساتھ بیان کرتا تھا کہ بارنیز نے ایک مرتبہ ایسے ایک سوال پر یہ جواب دیا "ڈوی میرے شوفر کی طرح چلا آتا ہے اور میں اس سے اسی طرح بات کر سکتا ہوں جیسے ایک بار کیپ (شراب خانہ کے محافظ) سے کر سکتا ہوں"۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ڈوی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دوسرے لوگوں کو تعلیم دینے میں صرف کیا تھا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ ان کی حماقتوں کے لئے حیرت انگیز تحمل رکھتا تھا۔ اپنی نجی زندگی میں وہ کافی زاہدانہ طرز اختیار کئے ہوئے تھا لیکن دوسروں کے ساتھ اس کا رویہ فلسفیانہ رواداری پر مبنی تھا۔ اس کی محبوب کہانی اس شخص کے بارے میں تھی جس نے ایک استعمال کردہ سوٹ دو ڈالر میں خریدا اور اس میں جب لمبے پھٹے نظر آئے تو وہ غصہ کی حالت میں اسے لے کر پھر تاجر کے پاس گیا۔ تاجر نے کہا "تم دو ڈالروں میں اس سے زیادہ

کیا توقع کر سکتے ہو، کیا گانے والی چڑیوں کی ؟ لیکن یہ رواداری بعض اوقات انسانی حقوق کے حصول کے لئے ایک شدید جذبہ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے ڈوی کے کولمبیا آنے کے تھوڑے عرصہ بعد شہر نیویارک ایک شرمناک واقعہ کے باعث ایک ہنگامہ میں مبتلا ہو گیا یہ واقعہ میکزم گورکی (ایک عظیم روسی مصنف) کی آمد سے متعلق تھا۔ گورکی روس کے انقلاب کے لئے امداد کی درخواست کرنے آیا تھا اور اپنی شریک حیات یا قانونی بیوی میڈم این ڈریوا کو بھی جو ایک ایکٹرس تھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ زار روس کے افسروں کے اشارے سے پورا شہر ان کے خلاف ہو گیا۔ گورکی کو بڑی بڑی سُرخیوں میں آوارہ عاشق مزاج کہا گیا اور اس کی مذمت کی گئی۔ ہوٹل اور نجی مہمان خانے اس کے لئے بند ہو گئے اور اس کو فی الواقع سڑکوں پر پڑے رہنے کے لئے مجبور کر دیا گیا۔ مارک ٹوئین (نے بھی پبلک کے جنون کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا) اگرچہ اس سے ادب کے نام پر اپیل کی گئی تھی۔ دوسروں کی طرح اس نے بھی پیٹھ دکھا دی۔ جان ڈوی نے اس پریشان حال روسی کو اپنے گھر، اور اپنے ذاتی وقار کی پشت پناہی کی پیش کش کی۔ ڈوی پر اس فیاضی کے باعث سخت حملے کئے گئے، اتنے سخت حملے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے اس کی ملازمت ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مسز ڈوی اس کی حمایت میں ایک چٹان کی طرح جمی رہی۔ اس نے بڑے جذبہ سے دانت پیس کر کہا " بمقابلہ اس کے کہ میں جان کے اصولوں کو قربان ہوتے دوں میں فاقہ کرنا اور اپنے بچوں کو فاقہ کرتے ہوئے دیکھنا

پسند کروں گی۔"

ماسکو میں لیون ٹراٹسکی پر غداری کے الزامات لگائے گئے تھے۔ ڈوی نے اس امر کی حمایت کی کہ اس پر مقدمہ منصفانہ طریقہ پر چلایا جائے لیکن اس مرتبہ ڈوی کو اپنے گھر میں اس کام میں مذکورہ بالا قسم کی امداد نہیں ملی۔ اس کے بیٹے اور بہو نے جو اس کی بیٹی ایولن کی شادی کے بعد اس کے ساتھ رہنے لگے تھے اسے تحقیقاتی کمیشن کی صدارت قبول کرنے سے باز رکھنے کی حتی المقدور بڑی کوشش کی۔ ان کے دلائل یہ تھے۔ وہ اتنا عمر رسیدہ ہو گیا تھا کہ میکسیکو کا سفر کرنا اس کے لئے مناسب نہ تھا، وہ بے آرامی اور کھانے کی تبدیلی کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، ممکن ہے کہ اسے گولی مار دی جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ ڈوی ان سب تشویشناک باتوں پر مسکرا دیا اور اس نے کہا "میں اس سفر سے لطف اٹھاؤں گا۔"

جب بعد ازاں ٹراٹسکی سے پوچھا گیا کہ جان ڈوی کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں تو اس نے کہا "نہایت اچھے، کمیشن میں وہ تنہا شخص تھا جو بیمار نہیں پڑا!"

ڈوی اس کمیشن میں محض کٹ پتلی نہ تھا۔ وہ سکریٹری سوزانے لافولیٹ کے علاوہ ایسا شخص تھا جس نے کام کا بڑا حصہ انجام دیا اور اس کے کام میں روس کے سیاسی حالات کی تاریخ کی تکمیل کا گہرا مطالعہ شامل تھا۔ اس نے اس کے اصولی پس منظر پر بھی نظر ڈالی اور آخر کار اس قابل ہو گیا کہ مارکس ازم کے فلسفہ پر ایک مستند رائے دے سکے، اور یہ رائے اس فتوے سے جو لیون ٹراٹسکی کے

مقدمہ میں اس کے بے گناہ ہونے کے متعلق ڈوی نے دیا تھا زیادہ اہم تھی "کٹر مارکس ازم میں کٹر مذہبیت اور کٹر تصوریت کی طرح یہ عقیدہ موجود ہے کہ انسانی مقاصد زندگی کے تار و پود اور ساخت کے ساتھ گوندھے ہوئے ہیں۔ یہ ایسا تصور ہے جو غالباً ہیگل کے تصور سے ورثہ میں ملا ہے۔"

ڈیلی ورکر (                ) نے بلاشبہ اس کے رویہ کو پیرانہ سالی سے متاثر بیان کیا ہے۔ نیوماسیز (                ) نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ ایک عظیم فلاسفر نے اپنے آپ کو اپنے آفتاب زندگی کے غروب" کے مرحلہ پر بیوقوفی میں پھنسا دیا۔ اس جملہ پر ڈوی کا تبصرہ یہ تھا "ایسے موقع پر شفق، عمومی محاورہ ہے۔" اپنے شرکائے کار کی رائے میں جو اس کمیشن میں تھے ڈوی نے اپنا وقار کمیشن کے اندر ایک جج کی طرح قایم رکھا اور ایک ورمانٹ کے تاجر اسپان کی طرح ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ اپنے خلاف تنقید کرنے والوں کا جواب اس مضمون میں لکھ چکا تھا جو اب سے چالیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس نے لکھا ہے "فلسفی کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے زندہ معاملات اور تنازعات میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے کی غلطی کرے بمقابلہ اس کے کہ وہ ایک بے ضرر خانقاہی معصومیت میں مبتلا رہے۔" اس نے دوبارہ ان کو جواب نہیں دیا۔

جب اس نے ڈوی کمیشن کی ۸۰۰ صفحات کی رپورٹ کے تقریباً ساتھ ساتھ اپنی ۵۴۶ صفحات کی کتاب "منطق، اصول تحقیقات" جو تاریخ میں غالباً اس کی بڑی کتاب سمجھی جائے گی شائع کی تو کہن سالی کا جو الزام اس پر لگایا جارہا

تھا احمقانہ معلوم ہونے لگا۔ اس نے اس کا بڑا حصہ اپنے کی ویسٹ (
فلوریڈا) کے موسم سرما کے مکان کے پچھلے صحن میں دھوپ
میں بیٹھ کر لکھا تھا جب کہ وہ کمر تک ننگا اور شاہ بلوط کے پھل کی طرح بھورا ہوتا
تھا۔ اگر آپ وہاں جاتے اور اس سے پوچھتے کہ اس کی آنکھیں کاغذ پر پڑتی
ہوئی سفید چمک کو کیسے برداشت کرتی ہیں؟ تو وہ یہ جواب دیتا تھا "میری
آنکھیں ہمیشہ کمزور رہی ہیں۔ اب میں ان کو اس چمک کا عادی بنانا چاہتا ہوں"۔

اچھی صحت کے علاوہ اس اآئی فلاسفر کو اس کے انحطاط کے زمانہ میں
نادر کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ اپنے موزے پانچ اور دس (
ہی پر خریدتا رہا لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اس کی تنخواہ
کولمبیا میں سات ہزار ڈالر اس کے وہاں پہونچنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی
کر دی گئی تھی اور ۱۹۲۰ء کے بعد اس کی گرم بازاری کے زمانہ میں بارہ ہزار
ڈالر کر دی گئی۔ جب ۱۹۳۰ء کے بعد وہ ملازمت سے علیحدہ ہوا تو پریزیڈنٹ
بٹلر نے اس کو "مقیم اعزازی پروفیسر"
) کہا اور اسے بارہ ہزار ڈالر ماہانہ دیتا رہا۔ ۱۹۴۰ء میں
کولمبیا نے تخفیف کا فیصلہ کیا اور ڈوی کو اپنی کارنیگی پنشن پر گزر اوقات کرنی
پڑی۔ وہ اپنی عادت کے موافق اطمینان کے ساتھ اسی پر گزر کر رہا تھا اور اپنے
آپ کو اس کا عادی بنا رہا تھا۔ اس وقت فلاڈلفیا کے بارنیز فاؤنڈیشن سے
اسے ایک خط ملا جس میں یہ درج تھا کہ اگر وہ ناپسند نہ کرے تو وہ لوگ اسے
پانچ ہزار ڈالر سالانہ پنشن حین حیات ادا کریں گے۔ اس خبر نے اسے نہایت

حیرت زدہ کر دیا یہاں تک کہ وہ روز تک وہ مضحکہ خیز باتیں کرتا رہا اور اپنے خاندان کو یہ نہ بتایا کہ اس کے اس طرزِ عمل کا سبب کیا تھا، لیکن تھوڑے عرصہ بعد اس نے اپنے آپ کو اس کے مطابق بنا لیا۔

کی ویسٹ ایک قسم کا سرمائی قصبہ تھا یہ سمندری سفر کرنے والے سنجیدہ قسم کے شہریوں اور ان کی تصویریں تیار کرنے والے عارضی فنکاروں کے ملنے کی جگہ تھی اور بحری اسٹیشن سے رات کو ملاح لوگ بھی وہاں آکر اس کی رونق بڑھاتے تھے اور شاہراہوں اور گلیوں میں غازہ ملے ہوئے آوارہ عورتیں بھی یہاں ملتی تھیں۔ جان ڈوی بھوری سینڈل، سفید موٹے نیلا جانگیا اور نیلی قمیص جو گردن پر کھلی ہوئی ہوتی تھی پہنے ہوئے اس ماحول کے بالکل مطابق معلوم ہوتا تھا گویا کہ وہ ہمیشہ سے اسی جگہ کا رہنے والا تھا فن کار لوگ اسے "جان" کے نام سے پکارتے تھے۔ سنجیدہ شہری بھی اسے چاہتے تھے دونوں قسم کے لوگ اسے اپنی شراب کی دعوتوں میں مدعو کرتے تھے اور وہ وہاں پہونچ جاتا تھا عموماً کسی قدر دیر سے، اس وقت بھی وہ نیلا نیکر پہنے ہوتا تھا اور اس بات کی ذرا بھی پروا نہ کرتا تھا کہ وہ مجلس کس طرح سجائی گئی ہے اور وہ اسکول کے ایک لڑکے کی مانند نظر آتا تھا۔ اگر جلسہ میں کسی طرح کی بناوٹ ہوتی تھی تو وہ اس کے لیئے پریشانی کا باعث ہوتی تھی لیکن ڈوی ہمیشہ وہی عمل کرتا تھا جو اسے پسند ہوتا تھا (یہی سبب اس کے اس قدر کم عمر نظر آنے کا معلوم ہوتا ہے) اور وہ اسے ایک صاحب اختیار آقا جیسی بے پروائی کے ساتھ کرتا رہتا تھا۔ ایک ملاح نے جو "سلوپی جو" سے آیا تھا اسے

ایک صبح تڑکے ایک گلی میں ٹھہرایا اور کہا" دوست! یہ بتاؤ کہ بھوری چھت والا مکان کہاں ہے؟" ڈوی نے پوچھا" بھوری چھت والے مکان سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" ملاح نے کہا" میرا مطلب یہ ہے کہ دیر ہو گئی ہے اور مجھے جہاز پر واپس جانا ہے۔ اس لئے مجھے ایک قحبہ خانے کی جلد ضرورت ہے۔"

ڈوی نے کہا:" اوہ! درحقیقت مجھے علم نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ غالباً ایسی چیزوں سے دلچسپی لینے کی میری عمر نہیں ہے۔ میں زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔" ملاّح نے اس کی پیٹھ پر ایک بڑی تھپکی دی اور کہا" ارے بالکل غلط۔ تم تو ابھی بچے ہی ہو۔"

ڈوی کی طبیعت میں اطمینان کا مادہ اصلاً اتنا زیادہ تھا کہ اس کے خیالات میں کبھی اشتعال پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ صفت اس کے اندر اکثر لوگوں سے بہت زیادہ تھی اور اس کے خیالات عرصہ تک باقی رہنے والے بھی تھے۔ اس لئے مذکورہ جملہ صحیح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے حیرت انگیز حد تک طاقتور دل کی حرکت بند ہونے کے بعد بھی یہ قول صحیح معلوم ہوتا تھا۔

حال میں جان ڈوی کے خلاف ایک انتہا پسندانہ اور غیر معتدل تاثر پیدا ہوا ہے۔ میرے خیال میں اس کا سبب زیادہ تر وہ حماقتیں ہیں جو اس کے بعض بے لوچ اور بے وقوف لیکن متلون مزاج پیرؤں سے "ترقی پذیر تعلیم" کے نام پر سرزد ہوئی ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ڈوی کتنے زور کے ساتھ اس خیال کا اظہار کرتا رہا ہے کہ اس کے نظریات تجربہ اور آزمائش کے محتاج تھے اس غضب ناک ردِ عمل کے پرجوش حامیوں نے نہ صرف اس کے تعلیمی نظریات پر

بلکہ اس کے معاون فلسفہ پر بھی حملہ کیا ہے۔ ایک ممتاز مدیر نے اس غرض سے کہ تمام نظریوں پر ایک ساتھ حملہ کیا جا سکے "ڈوی ازم" کی اصلاح ایجاد کی ہے اور یہ ایک ہی لفظ ڈوی کی تعلیم کے تمام معنی اور منشا کی تردید کرتا ہے۔ "قدامت پسند حامیِ آزادی" گروہ کے بعض زیادہ باریک بین لوگوں نے اس معتدل فلسفی کو نہ صرف تیرہ سے اُنیس سال کی عمر کے بچّوں کی بے راہ روی اور روح کو تباہ کرنے والی مادہ پرستی کا سرچشمہ سمجھا ہے بلکہ فلاحی ریاست کے آہستہ آہستہ ٹھنے والے نظریۂ اجتماعیت کا بھی منبع قرار دیا ہے۔

بری زندگی میں ڈوی نے ایک ضدی لیکن کسی قدر پدرانہ شفقت لئے ہوئے مخالف کی حیثیت سے اس وقت نفع بخش کام انجام دیا جب نوجوانی کے ہیجان کے تحت میں اجتماعیت کے خیالات اختیار کرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔

وہ کہا کرتا تھا "معاشرہ دو قطعی علیٰحدہ علیٰحدہ طبقات میں منقسم نہیں ہے جیسا کہ اجتماعیت پسند دعویٰ کرتے ہیں۔"

میں جواب دیتا تھا "ہاں۔ لیکن اس مفروضہ پر عمل کرتے ہوئے کہ وہ منقسم ہے ہم معاشرہ کو دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک کارآمد مفروضہ ہے یعنی کوئی چیز جس پر عمل کیا جائے بجائے اس کے کہ ہم حالات کو بہتر بنانے کے متعلق بہت سے مبہم تصورات رکھیں۔"

وہ ایسے درخشاں لیکن غیر محتاط خیالات کا جواب دینے میں جلدی نہیں کرتا تھا۔ وہ بڑے لطف سے مسکراتا اور اپنی ٹھوڑی کو ملتا تھا اور کچھ نہ کہتا تھا لیکن میں قیاس سے معلوم کر لیتا تھا کہ اس کا خیال کیا ہے۔ میں منطق کا درس

اسٹینلے جیونس کی مشہور کتاب "سائنس کے اصول" میں سے دیتا تھا اور میں طبیعی سائنس کے تصوراتی سازوسامان کو معاشرتی اور نفسیاتی مسائل پر چسپاں کرتے ہیں بے دھڑک لسانی سے کام لیتا تھا، حالانکہ ان کا موضوع سائنس کے مقابلہ میں بہت زیادہ مخلوط اور غیر متعین ہے۔ ڈوی کی کمزوری مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے اس کے برعکس تھی وہ حقائق کی مسلسل تبدیلی کا اتنی دوراندیشی سے خیال رکھتا تھا کہ اس کے خیالات میں تیزی نہ رہتی تھی اور اس کی نثر دھندلے خیالات کا مجموعہ ہو جاتی تھی جس کا یاد رکھنا مشکل ہوتا تھا۔

بہرحال بحیثیت استاد کے اس نے میرے انقلابی جوش کو اپنے اثر سے بہت کچھ ٹھنڈا کیا۔ بیسویں صدی کے تیسرے عشرہ کے آخری سالوں میں یعنی سُرخ عشرہ میں جب کہ میں مخالف نتیجہ پر پہونچ رہا تھا ڈوی نے "اشتراکی معیشت" کی اور منظم اشتراکی تسلط" کی حمایت" آزادیٔ افراد" کی حمایت کے ذریعہ کے طور پر کی۔ وہ اس وقت اٹھتر سال کا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کی پوری زندگی کا اثر بحیثیت مجموعی اس سے قطعی مخالف سمت میں تھا۔ اس کی خاص توجہ افراد کی آزادی کے بارے میں تھی اور اس جمہوریت کے بارے میں جو ایسے اصول پرست امریکیوں کے تصور کے مطابق ہو جن پر مارکس کی دُھندلی تعلیمات کا ذرا بھی اثر نہ ہوا ہو۔

ایک دوسری غلطی جو ڈوی کے بہت سے قدامت پسند معترضین نے کی ہے وہ ان کا یہ تصور ہے کہ اس کا نظریہ علیت یا معاون فلسفہ جیسا کہ وہ اسے کہنا پسند کرتا تھا۔ امریکہ کی اس متشدد عملیت کو عظمت دیتا ہے جسے ان لطیف

اقدار کے خلاف کہا جا سکتا ہے جنہیں روحانی اقدار کہتے ہیں اور جو دیگر فلسفوں میں مرکزِ فکر و توجہ رہتی ہیں۔ نظریۂ عملیت یقیناً یہ کہتا ہے کہ تمام صحیح علم کے حصول کے طریقوں میں سائنسی طریقہ بہترین ہے اور اگر کسی کی قدامت پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ سائنس کی سند کو مسترد کر دیا جائے تو اس کے ساتھ ڈوی کے فلسفہ کا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے معاون فلسفہ کی کارگزاری بعض کٹر سائنسیت کے حامیوں کی متشدّد یا تنگ عملیت کو عظمت دینا نہیں ہے بلکہ اس کی سختی کو کم کرنا ہے (سب سے زیادہ مادہ پرستی کی سختی کو) نظریۂ عملیت انسان کی ضرورتوں اور آرزوؤں کی تعمیر علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں کرتا ہے خواہ وہ علم کتنا ہی واقعی یا سائنسی ہو۔

کسی تصوّر کے معنی نظریۂ عملیت کے مطابق اس کا وہ نتیجہ ہوتا ہے جو عملاً ظہور پذیر ہو۔ صحیح تصوّر وہ تصوّر سمجھا جاتا ہے کہ جس پر جب عمل کیا جائے تو وہی نتیجہ برآمد ہو جو اس کے معنی سے ظاہر ہوتا ہے۔ ولیم جیمس نے نظریۂ عملیت پر جو مشہور لیکچر دیئے ہیں (جن میں خوش قسمتی سے مجھے شریک ہونے کا موقع ملا تھا) ان میں اپنے مخصوص بھولے پن سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس نظریہ کی رو سے خدا پر یقین کرنا حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ اگر حقیقت وہی ہے جس کا عملی نتیجہ نکلتا ہے، اور خدا کے وجود پر یقین کرنے سے عملی نتیجہ نکلتا ہے تو یہ صحیح ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ ڈوی اس آسان تخیل سے میلوں دور تھا۔ علاوہ بریں اصلاً وہ مذہب کے بجائے اخلاقیات کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کی اصل نیت مادی سائنس کے اقدار کو عظمت دینے

کی نہ تھی بلکہ وہ اخلاقی فیصلوں کو اقتدار کو ایسی عظمت دینا چاہتا تھا۔ اگر ایک مرتبہ اور جیمس کے ایجاد کردہ بصیرت افروز الفاظ استعمال کیئے جائیں تو کہا جائیگا کہ اس کی نیت "نرم مزاجی" کی جانب۔ کافی وسیع نظر سے ترجمانی کرنے کی صورت میں معلوم ہوگا کہ اس کے تمام فلسفیانہ خیالات کی تہہ میں یہ نیت کارفرما ہے اور اس کا مرتکز اظہار، اگر ڈوی کی تحریروں میں سے کسی کو مرتکز کہا جاسکتا ہے، اس مقالے میں ملے گا جو اس نے "اخلاقیات کی سائنسی تشریحات کی منطقی شرائط" پر لکھا ہے اور جو شکاگو یونیورسٹی کی ۱۹۰۳ء کی مطبوعات میں ملے گا۔

میں خود حقیقت کی اس تعریف پر جو نظریۂ عملیت کے حامیوں نے کی ہے یقین نہیں رکھتا، نہ مذکورہ تعریف کی اس مکمل اور مدلل شکل پر جس میں ڈوی نے اسے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور نہ اس معصومانہ انداز پر جس میں ولیم جیمس نے قطعی بے پروائی سے اسے اپنایا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نام نہاد داہنے بازو کے وہ لوگ جو اس کی مذمت کرتے ہیں قطعی غلطی پر ہیں اگر وہ نظریۂ عملیت کو ان اقدار پر جو "روحانی" کہلاتی ہیں ایک فلسفیانہ حملہ سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا اگر چہ الفاظ فنی نہیں ہیں "کہ نظریۂ عملیت اپنی تمام شکلوں میں روحانیت کو سائنس کے درجہ پر پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔

میرا خیال ہے کہ فلسفہ کی طرح تعلیم کے مضمون پر بھی جان ڈوی کے نظریات کے خلاف ردِ عمل معقول سے تجاوز کر گیا ہے۔ بلاشبہ "ترقی پسندانہ تعلیم" کی بدولت گستاخ اور بے ادب نوجوانوں کی ایک پود پیدا ہو گئی ہے جن کیلئے

خوش اطواری کی سختی کے ساتھ تربیت، پڑھنے لکھنے اور حساب کے کورس کی سخت تعلیم اور حسب ضرورت کبھی کبھی جسمانی سزا خالص رحمت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی غلطی یا کوئی غلط مفروضہ جو سکوت کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ ڈوی کے تعلیمی نظریات کی تہہ میں موجود ہے اور وہی اس صورتِ حال کا کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کا یہ اصرار کہ بچے جو کچھ اسکول میں کرتے ہیں وہ ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ اس میں دلچسپی لے سکیں یا لیں اور یہ کہ نظم و ضبط کے معنی یہ ہونے چاہئیں کہ جو کچھ انھوں نے کرنے کے لئے خود مقرر کر لیا ہے اس کو دیانت داری سے کرنے کا ان سے مطالبہ کیا جائے نہ کہ ان سے اس چیز کے کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔

جو کسی غیر متعلق دیو سیرت شخص نے جسے مدرس کہتے ہیں ان کے لئے مقرر کی ہو تہذیب و تمدّن کے لئے بہت زیادہ نفع بخش تھا۔

ڈوی نے "جمہوریت اور تعلیم" میں تحریر کیا ہے "جس شخص کو اپنے افعال پر غور کرنے اور انھیں سوچ سمجھ کر اختیار کرنے کی تربیت دی گئی ہے وہ تو اس حد تک نظم و ضبط سیکھ ہی جاتا ہے۔ اس اہلیت پر ہوشیاری سے منتخب کئے ہوئے کورس کو خلل اندازی اُلجھن اور مشکلات کے مقابلہ میں جاری رکھنے کی قوت کا اضافہ کرو تو تم نظم و ضبط کے اصل جوہر کے مالک ہو جاؤ گے۔"

زمانۂ سابق کے اس مروجہ نظریہ کے برخلاف کہ بعض مضامین کو جو فی نفسہ "تادیبی" ہوتے ہیں بچوّں کے دماغوں میں ان کے اپنے حوصلہ اور مہم جوئی کے جذبہ کو نقصان پہونچا کر ٹھونس دینا چاہیئے ڈوی کا نظریہ ایک بغاوت تھا اور

اس حیثیت سے یہ ایک بڑا شاندار واقعہ تھا۔ درحقیقت ڈوی تمام دنیا کے بچوں کو آزادی دلانے والا تھا اور جیساکہ مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے ان کو آزادی دلانے کے یہ معنی نہیں تھے کہ انھیں وحشی بننے کی اجازت دے دی جائے یہاں بھی جیساکہ دوسرے موقعوں پر تھا اسے اخلاقِ حسنہ سے گہری دلچسپی تھی۔ جس طرح اپنے فلسفہ میں سائنس کے اقتدار کے ساتھ وہ اخلاق کے اقدار کی آمیزش چاہتا تھا۔ اسی طرح تعلیم کے میدان میں وہ اخلاق واعمالِ حسنہ کو افراد کی آزادیِ انتخاب سے مربوط وہم آہنگ بنانا چاہتا تھا۔

اس کے نظریات کی تہہ میں میرے نزدیک غلط مفروضہ یہ ہے کہ انسانی بچے کی خود رو دلچسپیوں کو زیادہ تر قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔ ان کو تعلیم کے آغاز کا ابتدائی نقطہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ان دلچسپیوں کی تربیت اور انھیں نظم وضبط میں لانا پہلی چیز ہے جو بچہ کے لئے کرنی ہوتی ہے لیکن جب بچہ ڈوی کے کسی اسکول میں جاتا ہے تو یہ اصول پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ جدید علمِ حیات نے ہمیں ایک بات یہ سکھائی ہے کہ ہمارے امتیازی شائستہ اوصاف میں سے کوئی بھی خواہ وہ ارادی ہو یا عقلی ہمارے بچّوں کو ورثہ میں منتقل نہیں ہوتا۔ ایک خاص قسم کی انتخابی نسل اس وقت وجود میں ضرور آتی ہے جب لوگ مہذّب ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ کوئی شخص اس کی سمت کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ آج کے پیدا شدہ بچے بڑی حد تک ان بچوں سے مختلف نہیں ہیں جو ہزاروں سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ فطرت جدید ترقیات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ ایک مہذب انسان ایک صنعتی شاہکار ہے۔ ان چھوٹے وحشیوں میں سے جو پیدائش کے وقت

انسان ہوتے ہیں ایک مہذب انسان تیار کرنے کے لئے ہمیں رُجحانوں اور اُمنگوں کو سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ ان کوششوں کو جو ہم ان رُجحانوں کو پورا کرنے کے لئے کرتے ہیں سانچے میں ڈھالنا ہرگز کافی نہیں ہے۔ غالباً ڈوی نے اس مسئلہ پر کہیں بحث کی ہے جس پر میری نظر نہیں پڑی لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جتنے پُر زور طور پر اس بات کو بیان کرنے کی ضرورت تھی اتنے زور کے ساتھ بیان کرنے سے وہ قاصر رہا ہے۔ اس کے فلسفہ نے انسانی مقاصد پر نہ صرف علم کی ترقی و توسیع کے میدان میں بلکہ حقیقت کی نوعیت سے متعلق تصورات پر بھی اثر ڈالا ہے اور ان اثرات ہی نے اسے بہکا دیا تھا۔ شکاگو میں ڈوِلی سکول کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ "ان دنوں میں اتنا بے وقوف تھا کہ اسکول کو میں اپنے فلسفہ کی ایک تجرباتی جانچ خیال کرنے لگا تھا۔ اس حیرت انگیز جملہ کو یاد کرکے میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ کیا میں اس سے زیادہ بے وقوف بنے بغیر ان زیادتیوں کو جن میں اس اسکول کی بدولت ہم پڑ گئے ہیں اس کے فلسفہ کے اندر پوشیدہ غلطی کا تجرباتی مظاہرہ خیال نہیں کرسکتا۔ وہ دونوں (فلسفہ اور اسکول) انسان کے جس میں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے حیوانیت ضرورت سے زیادہ ہے۔ سرد مہرانہ ارادوں پر حد سے زیادہ بلند اور رہبرانہ کام کا بار ڈالتے ہیں۔

مجھے بھروسہ ہے کہ مذکورہ قول مجھے ان رجعت پسند سخت معترضین میں شامل نہ کریگا جو تعلیم کی اس تعریف ہی کو ترک کرنا چاہتے ہیں کہ وہ موافق حالات کے تحت نشوونما کا نام ہے جو دُنیا کو خوش کرنے والی اس ایجاد پر چین بجبیں

ہیں کہ بچے اسکول جانے میں لطف حاصل کر سکتے ہیں (اس نے پورے خاندان کو دادا سے لے کر بچے تک تازہ زندگی بخش دی ہے)، یا جو اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ جان ڈوی نے نوع انسانی کے غیر فانی محسنوں کے درمیان ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اکثر جرأت مند مخترعین کی طرح وہ بھی انتہائی حدود تک پہونچ گیا ہے۔ ردعمل کا ایک وقت آنا اور اس کی عالمگیر شہرت کا کسی قدر دُھندلا پڑ جانا ناگزیر تھا، لیکن وہ اس سے صاف نکل جائے گا اور اس اثنا میں وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک وحشی انتہا پسند کے جنازہ پر ناچ رہے ہیں۔ اگر ڈوی کی لکھی ہوئی کوئی کتاب کھولیں گے اور اس کی لکھی ہوئی چند سطریں پڑھیں گے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ کتنا اعتدال پسند اور کتنا محتاط اور ایک آزاد معاشرہ میں لطیف ترین اقدار کو برقرار رکھنے اور ان میں اضافہ کرنے کے لئے کتنا تُلا ہوا تھا۔

# میرا سب سے پہلا رفیق

وہ ایک عیسائی قسیسہ تھی۔ وہ پہلی خاتون تھی جس کو ریاست نیویارک کے گرجے کی جماعت اساقفہ نے اس مذہبی عہدہ پر فائز کیا تھا۔ پھر وہ اس ریاست کے بڑے اور مشہور گرجاؤں میں سے ایک کی پیسٹر (PASTOR) ہوگئی۔ اس کا قد متوسط تھا۔ اس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے اور آنکھیں سبزی مائل نیلگوں تھیں۔ اس کے چہرہ اور جسم کی ساخت سے لطیف حسن نمودار تھا۔ وہ منبر پر ایک سادہ سیاہ پوشاک اپنی پسند کی پہنا کرتی تھی جس کو وہ چغہ کہتی تھی۔ اس کے سامنے کے حصے میں چُنٹین پڑی ہوتی تھیں اور گلے کے قریب جو کھلا ہوا حصہ تھا اس میں ایک سیاہ فیتہ لگا دینے سے اس کی وضع زنانہ ہوگئی تھی۔ منبر پر اس کے اطوار بھی اس کے لباس کی طرح سادہ ہوتے تھے۔ ہاتھ اور جسم سے وہ بہت ہی کم اشارے کرتی تھی اپنی فطری سادگی کے خلاف اس سے کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔ دو صفتیں جو ایک خطیب کے لئے ناگزیر ہیں قدرت نے اسے عطا کی تھیں، ایک تو خود اعتمادی اور دوسری ہیجان خیز آواز جب وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑی ہوتی تو ناظرین کو ایسا معلوم

ہونے لگتا تھا کہ گویا وہ مجمع پر پورے طور سے حاوی ہو چکی ہے اور ہر شخص اطمینان محسوس کرتا تھا۔ چونکہ اس کے انداز و اطوار میں مردانہ اطوار کی ذرّہ برابر بھی آمیزش نہیں پائی جاتی تھی اس لئے کسی کو یہ خیال کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرنی پڑتی تھی کہ وہ مرد ہے یا عورت، اور جب وہ سلسلۂ تقریر کا آغاز کرتی تھی تو پہلے تو اس کی آواز کی ہم آہنگی سننے والوں کو مسحور کر دیتی تھی پھر اس کی بے لاگ، ہوشمندانہ، طرب انگیز اور اکثر ظرافت آمیز باتیں مجمع کو گرویدہ کر لیتی تھیں۔

وہ مسرّت و انبساط کی قائل تھی اور برلین میں جب وہ نئی نئی پہنچی تو اس نے ایک مضمون لکھا جس میں اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ خدا بھی عین مسرّت ہے۔ ایک وسیع دریائے مسرّت جو ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ترقی پذیری میں بھی اس کا اعتقاد تھا۔ پر مسرت زندگی کا اصلی راز اس کے اصول کے مطابق یہ تھا کہ زندگی کا آغاز خواہ کسی بھی نقطہ سے کیا جائے لیکن اس میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہنی چاہیئے۔ یہ دو اعتقادات یا جبلی رجحانات اس کی تعلیم کے خاص جوہر ہیں۔ کم از کم انہی دو خصوصیات کی وجہ سے اس کی تعلیم ان لوگوں کے پیغامات سے ممتاز ہو جاتی ہے جو اپنے پیشہ کی علامت کے طور پر سیاہ پوشاک زیب تن کئے رکھتے ہیں۔ جس چیز نے اس کو ناقابل فراموش بنا دیا وہ اس کی لاثانی دلیرانہ جرأت تھی جس سے وہ اپنے اعتقادات کو اپنی زندگی کا معمول بنا لیتی تھی۔

اس کا باپ جارج فورڈ جو ایک شخص ہنری فورڈ کا پوتا تھا ہیوریا علاقہ

الینوائے میں بندوق سازی کا کام کرتا تھا اور اپنے علاقہ میں بڑا آدمی شمار ہوتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ عورت کے لئے خاص مقام اس کا گھر ہے اس عقیدہ کا عملی ثبوت وہ اکثر اس طرح دیتا تھا کہ شراب کے نشہ میں مست ہو کر وہ اپنے گھر کو نمونۂ جہنم بنا دیتا تھا۔ اسی وجہ سے شاید ترقی عمر کے ساتھ اس کا یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ عورت کو کوئی نہ کوئی کام سیکھنا چاہیئے۔ ۱۸۷۰ء میں جب وہ ابھی ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھی اس نے یہ فیصلہ کر لیا۔ (حالانکہ اس عمر میں ایسے فیصلے شاذ و نادر ہی کیئے جاتے ہیں) کہ اقتصادی حیثیت سے میں کسی کی دست نگر نہیں رہوں گی۔ سوسان۔ بی انتھونی جب ہیوریا میں تقریر کرنے کے لئے آئی تو اس حوصلہ مند ہائی اسکول کی طالبہ نے اس کا تعارف ایسے پر جوش انداز میں کرایا کہ اخبار کے ایک تراشہ کے مطابق جو اس وقت بھی میرے پاس ہے اس کی تقریر تمام شہر میں موضوع گفتگو رہی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جارج فورڈ نے اس تقریر کی تیاری میں اپنی بیٹی کی کس حد تک مدد کی تھی۔

اوبرلن میں جہاں وہ فن تدریس سیکھنے کے لئے گئی تھی اس کو ایک الٰہیات کے طالب علم سے جو اپنی تعلیم کی تکمیل کے قریب پہونچ چکا تھا محبت ہو گئی، اور تحریک نسواں کی حامی بہت سی خواتین کی طرح اس کا ولولۂ محبت اس قدر بڑھا کہ کالج میں ایک ہی سال گزارنے کے بعد اپنا مشغلۂ حیات چھوڑ کر اس نے شادی کر لی۔ دونوں زن و شوہر نے نیویارک کے ضلع راچسٹر کے متصل کینن ڈیگوا کے پیرش (کلیسائی حلقہ) میں اقامت اختیار کر لی۔

وہ امور خانہ داری کا انصرام کرتی تھی! اور اس کے چار بچے ہوئے۔ وہ شوہر کو خطبات تیار کر کے دیتی تھی۔ اس کا یہ کارنامہ تقریباً جادوگری معلوم ہوتا تھا کیونکہ روانی اور سرعت سے لکھنے میں اس کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔

اس کو بیوی کی امداد کی ضرورت بھی تھی کیونکہ وہ امریکی خانہ جنگی میں بحیثیت سپاہی کے شریک ہوا تھا اور اس میں اپنا ایک پھیپھڑا ضائع کر کے واپس آیا تھا۔ آخری بچہ ابھی شیر خوار ہی تھا کہ یہ پھیپھڑا بیکار ہونے لگا۔ وہ وعظ کے بعد یا جلسہ میں شرکت کر کے جب واپس ہوتا تھا تو تکان کی وجہ سے اس کی حالت غیر ہوتی تھی یہاں تک کہ اس کے پاؤں بھی صحیح طور پر کام نہیں دیتے تھے۔ جب اس نے سبک دوش ہونے کا تہیہ کر لیا تو اس کے ضعف کا یہ حال تھا کہ اس کا استعفا بھی اس کی بیوی نے لکھ کر دیا۔ اب پانچ نفوس اس کی بیوی کے زیر کفالت تھے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔

لیکن یہ اس کا پختہ یقین تھا کہ عورتوں کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ زوجہ اور ماں کے سوا ان کو کچھ اور بھی ہونا چاہیئے۔ اب مقدر پکار پکار کر اس سے کہہ رہا تھا "ہم دیکھتے ہیں کہ تم کس طرح اپنے نصب العین سے عہدہ برآ ہوتی ہو۔"

اتھاکا کے قریب بروکٹن کے موضع میں ایک غیر آباد سا گرجا تھا جس کا منارہ پرعظمت تھا لیکن اس کی چھت شکستہ ہونے کے باعث ٹپکتی تھی متولیوں کو آمادہ کر کے اس نے ایک اتوار کو اس گرجا کے دروازے کھول دیئے اور لوگوں کو عبادت کرنے کے لئے بُلایا۔ سارا قصبہ اس عجیب و غریب تماشا کا لطف اُٹھانے کے لئے ٹوٹ پڑا، لیکن اس کے بعد وہ ہر اتوار کو زیادہ دل نشین مقصد کے ساتھ

آنے لگے۔ ایک مہینے کے اندر چھت کی مرمت ہو گئی اور ہفتہ و یکشنبہ کی خدمات کے عوض اب اس کو گرجا سے بارہ ڈالر ہفتہ وار ملنے لگے چند روز بعد اسے ویسٹ بلوم فیلڈ کے ایک بڑے گرجے سے بُلاوا آگیا۔ یہاں اس کو رہنے کے لئے ایک کشادہ مکان مل گیا اور آٹھ سو ڈالر سالانہ تنخواہ ملنے لگی۔

اِس عرصہ میں اس کی فصاحت کی شہرت سارے مغربی نیویارک میں پھیل گئی اور تقریروں کے ذریعے اور نکاح خوانی و مراسم تجہیز و تکفین کی ادائگی سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ اگرچہ دینیات میں اس کا مبلغِ علم صرف اتنا تھا جو اس نے اپنے شوہر کو اس کے خطبات کی تیاری میں مدد دینے کے سلسلہ میں ضمناً سیکھ لیا تھا لیکن ۱۸۹۳ء تک اپنے کام میں اس کی شہرت اس حد تک قایم ہو چکی تھی کہ شکاگو میں مذاہبِ عالم کی موتمر میں تقریر کرنے کے لئے اس کو اس چھوٹے سے قصباتی گرجا سے مدعو کیا گیا تھا۔

یہ عظیم الشان کامیابی اس طرح حاصل کی گئی کہ اس میں خود نمائی کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ اپنے مواعظ کو وہ اس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سامعین کے قلوب میں اُتار دیتی تھی کہ ان کو کسی تصنع کا قطعی شبہ نہ ہوتا تھا اور یہ سب اس کے ضبطِ نفس کا کمال معلوم ہوتا تھا۔

یومِ اطفال کے سلسلے میں جب اس نے ایک وعظ دیا تو شروع میں اس نے اجتماع کو یہ بتایا کہ موضوع خطبہ کی تلاش میں اس کو بڑی سرگردانی کرنی پڑی مکان کے ماحول میں یا باغ میں یا شہر کے حالات و واقعات میں ذرا سا بھی مواد وعظ کے لئے نہیں مل سکا۔ آخر کار وہ پریشانی کی حالت میں دیہات میں پہونچی

اور جنگل میں ایک پرانی سڑک کو طے کر کے وعظ کے موضوع کی جستجو میں گھومنا شروع کیا۔

میں بہت تیزی سے چل رہی تھی اور میری آنکھوں کے تار بڑی گہرائی کے ساتھ مصروف تلاش تھے کہ یکایک ایک آواز میرے کان میں پڑی۔ یہ بہت نرم آواز تھی اور آہستہ آہستہ الفاظ ادا کر رہی تھی "تم خوش خرامی کیوں نہیں کرتی ہو؟ یہ پرانی سڑک خود بول رہی تھی۔

میں نے جواب دیا "میں ایک کام کرنے والی عورت ہوں، میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے، میں نے سڑک کو وہ قول سنایا جو ایک چھوٹی سی پلیٹ پر جس میں بچپن کے زمانہ میں کھانا کھایا کرتی تھی لکھا ہوا تھا "کیا تجھے زندگی پسند ہے؟ اگر ہے تو اپنا وقت ضائع مت کر۔ آرام تو قبر میں بہت مل جائے گا" سڑک زور سے ہنسی اور اس نے کہا "تم شاید یہ خیال کرتی ہو کہ سڑک میں سوائے اسکے اختتام کے اور کوئی چیز کارآمد نہیں ہے! تم اور بہت سے ایسے لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں احمق ہیں۔ میری اس بات کو مانو کہ کسی سڑک کا کوئی اختتام نہیں ہے جسے تم اس کا خاتمہ کہتے ہو وہ صرف ایک دوسرا آغاز ہوتا ہے۔"

سڑک نے مزید کہا "تمھارے گرجے میں بہت سے لوگ بہشت میں باریابی حاصل کرنے کے شوق میں اتنے منہمک ہیں کہ ان کو راستہ میں نیکی کے کام کرنے کے لئے وقت نہیں ملتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب وہ وہاں پہونچیں گے تو انکو باہر نکال دیا جائیگا کیونکہ وہ شادی کے لباس میں ملبوس نہیں ہوں گے۔

یہیں راستے میں لباس عروسی حاصل کرنا چاہیئے یعنی حیات ابدی، اگر تم بہشت کی سمت جا رہے ہو۔ اگر راستہ میں تم کو محبت، مسرت اور سکون میسر نہ آئے تو سمجھ لو کہ اختتام شاہراہ پر یہ چیزیں تمھاری منتظر نہ ہوں گی۔"

اس طریقہ پر وہ وعظ کہتی تھی۔

پھر اس نے کہا "مجھے یہ ماننا پڑا کہ سڑک کی گفتگو معقولیت لئے ہوئے تھی اور فی الحقیقت تم بھی ایسے شخص کا احترام کرنے سے باز نہیں رہ سکتے جو بائبل کی آیات صحت کے ساتھ پیش کر سکتا ہو۔

اس کا قیام بروکلن ہی میں تھا کہ پادریوں کی مجلس نے جس کا سربراہ ٹامس بیکر ہنری وارڈ کے خاندان کا ایک انتہا پسند رکن تھا جس نے نیویارک میں المیرا کے مقام پر ایک غیر فرقہ وارانہ گرجا قایم کیا تھا اس کو دینی عہدہ تفویض کر دیا۔ مسٹر بیکر بے دینی کی طرف اتنا مائل تھا کہ اس نے دینی تعلیم کے متعلق اس کی آزاد خیال آفرینی پر مخالفانہ تنقید کرنے کے بجائے اس کو بہت سراہا۔ اس نے متعدد بار یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسے شاندار خطبے میں نے کہیں نہیں سُنے۔ اسے اس کے ساتھ اُنس تھا اور پدرانہ فخر کے ساتھ اس کی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اس کی صحت وقوت جواب دینے لگی تو اس نے مجلس دینی کے پُرشوق اصرار پر اس کو بُلوا کر یہ خواہش کی کہ المیرا کے گرجا کے پادری کی حیثیت سے وہ اس کے فرائض کی انجام دہی میں ہاتھ بٹائے۔ یہ پیش کش اس نے اس شرط کے ساتھ قبول کر لی کہ اس کے مریض شوہر کو اس کلیسائی حلقہ کے کام میں مدد کرنے کے لئے شریک کر لیا جائے۔ (اس نے (شوہر نے) زیادہ سے زیادہ اس

کام میں مددودی یہاں تک کہ وہ وعظ کے کام میں بھی حصہ لینے لگا۔ جب ۱۸۹۹ء میں مسٹر بیکر کا انتقال ہو گیا تو وہ اور اس کا شوہر دونوں پارک گرجا کا کام سنبھالنے کے لئے بالاتفاق رائے منتخب کر لیئے گئے۔

یہ تھی اس کی خدمت عوام کی زندگی کی روداد

اس کی زندگی کی شہرت اتنی وسیع ہو گئی کہ تذکرہ مشاہیر امریکہ (WHOSinAMERICA) میں اس کا نام بھی شامل کر لیا گیا۔ میرا رشتہ اس کے ساتھ خصوصی نوعیت کا تھا۔ میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ ۶ سے ۹ سال کی عمر تک میں ایسی ماں کا بیٹا تھا جو ہر سنیچر کو گھر سے غائب ہو جاتی تھی اور ۲ دون خطیبہ اور پادری کے فرائض انجام دینے کے بعد جب وہ دوشنبہ کو گھر واپس آتی تھی تو میں بالخصوص شفقتِ مادرانہ سے نوازا جاتا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ انتظام بالکل مناسب اور صحیح معلوم ہوتا تھا۔ جب پروس میں کوئی لڑکا یہ کہتا کہ میں پادری ہونے والا ہوں تو میں فوراً جواب دیتا تھا۔ "تم نہیں ہو سکتے کیونکہ تم لڑکے ہو!"

میرا گمان ہے کہ افراد خاندان اگر زیادہ مستقل طور پر ساتھ نہ رہیں تو بہت سے خاندانوں کی مسرتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے آپس میں انس و محبت کرنے میں جو لطف آتا ہے اس کا نصف حصہ اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ لوگ کچھ مدت تک گھر سے دور رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ میری ماں غیر معمولی قوت عمل رکھتی تھی۔ میں اس کو ایک کُلیہ کے طور پر بیان نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے عوامی

مشغلہ سے ہماری زندگی پر کسی خرابی کا اثر پڑنے کے بجائے وہ بہتر ہی بنی۔ مجھے تو شفقت مادری یا کپڑے درست کرنے یا خانہ داری کے کسی کام کے فقدان کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔ کوئی ایسا گھر نظر نہیں آیا جس کو دیکھ کر مجھے رشک ہوا ہو۔ بقول میری ہمشیرہ کے "وہ ایسی ماں تھی جو بچوں کو گھر میں لیجاکر کہانی سناتی ہے اور گھسیٹ کر ان کو دندان ساز کی دوکان پر لے جاتی ہے اور وہاں ان کے دانتوں کو ٹھیک کراتی ہے"۔ ہفتہ کے آخر میں اس کا گھر سے غائب ہو جانا ہماری اہلیت و استعداد کو بروئے کار لانے میں معین ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح موجودہ زمانہ میں اکثر اسکولوں میں عمل کیا جاتا ہے۔ گھر سے روانہ ہونے سے قبل ہر ہفتہ وہ ہمیں سب کو اکٹھا کر کے یہ بتاتی تھی کہ کوئی غیر متوقع اور خلاف معمولی صورت حال پیش آجائے تو اس سے کس طرح عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ میں (مصنف) ان حالات کے مقابلہ کے لئے ایک انجینیر جیسے تخیل کے ساتھ کام کرتا تھا۔

میں پوچھتا تھا کہ "اگر بچہ کی ولادت پیش آگئی تو ہم کیا کریں گے؟"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس طرح کی باتوں سے بچّوں میں امتیازی شان پیدا کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، ایک پادری کی اولاد ہونا بُرا ہے چہ جائیکہ ماں اور باپ دونوں گرجے کے پادری ہوں، لیکن زندگی کے اُس پر اُمنگ دَور میں جب کہ بچہ ہر شخص سے برابری کی کوشش کرتا ہے مجھ میں جو خامی (ماں سے جدا رکھنے کی وجہ سے) رہی اس کی تلافی ماں کی ان دانشمندانہ پند و نصائح سے ہوگئی جو میری زندگی کے داقعی ولولہ انگیز دور میں انھوں نے

مجھے دیں۔

جب میں گھر سے دور ایک اسکول میں پڑھتا تھا تو اس نے مجھے تحریر کیا "خوددار انسان بنو۔ اگر تم نے خودی کو کھو دیا تو دُنیا میں جو کچھ بھی حاصل کرو گے اس سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ جہاں تک اصول یا نصب العین کی قربانی کا سوال نہ پیدا ہو عوام سے مطابقت کرنا بے شک ایک حسین فعل ہو لیکن دوسری صورت میں یہ فعل بہت قبیح ہے۔" "دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں دلچسپی لو اور اس پر غور کرنے کی تربیت حاصل کرو۔ یہ بہتر ہے کہ تمھارے خیالات خواہ وہ غلط ہی ہوں لیکن تمھارے اپنے ہوں بہ نسبت اس کے کہ تم دوسروں کے خیالات کی تکرار کرتے رہو۔" زندگی کا مقابلہ کیا جائے تو یہ اتنی دُشوار نہیں ہوتی جتنی کہ اس سے فرار کی حالت میں ہو جاتی ہے۔ اپنی جسمانی حالت ٹھیک رکھو گے تو ذہن اور روح خود بخود سنبھل جائیں گے، یا یہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے؟ بعض اوقات میں اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتی!"

اپنا سر بلند رکھو اس وقت بھی جب دل اُداس ہو اور ہر ایک سے آنکھ ملا کر بات کرو۔" یہ بات تمھارے لئے بہت اہم ہے کہ تم خوددار بنو بہ مقابلہ اس کے کہ تم میں لاطینی سمجھنے کی قابلیت ہو۔" میری بہن کرسٹل کم جو اس نے ایک خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اصول زندگی اور اس کی سیرت کس نہج کے تھے۔

"سنیچر کی شام انگیٹھی کے پاس تنہا۔ میں ساڑھے چار بجے گھر پہونچی۔ دودھ کی چند روٹیاں پکائیں۔ ڈیڈی اور میں نے بڑے مزے سے ان کو

کھایا۔ گرم گرم روٹیوں پر خوب مکھن ملنے سے یہ بہت ذائقہ دار ہو گئیں
کھانے میں اوٹ میل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے کچھ سیب بھی تل لئے جس سے کل کا کھانا بھی تیار ہو گیا۔ میں نے کچھ کپڑے وغیرہ درست کئے ہیں اور ڈیڈی کسی سے ملنے گئے ہیں، ہاں میں نے تمھارے کمونا کے لئے فلالین بھی خرید لی ہے۔ یہ اسکاٹ لینڈ کی فلالین ہے بہت نرم ہے اور کہتے ہیں کہ دھلنے میں اچھی ہے۔ ممکن ہے جولی اور میں اس کو تیار کر لیں ..... " بروز اتوار ۲ بجے کے قریب میں نے وعظ کہا اور عشائے ربانی کی دعا کے کام میں بھی مدد کی۔ اور میں بہت دیر تک لیٹی رہی۔ اب شوربا اور سلاد اور پکے ہوئے سیب تیار ہیں صرف ڈیڈی کے آنے کا انتظار ہے۔ راگ کے سُر بہت لمبے اور زیادہ تھے! ایک زائد بھی تھا۔ میں نے کہا اگر وصولیِ چندہ کو حذف کر دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ مجھے جلد جانا ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے میرے شروع کرنے سے قبل ہمارا فربہ اندام مطرب مسٹر میک ناٹن کھڑا ہوا اور بعض فرشتوں سے جو ہمیشہ خوبرو اور پُر ضیا نظر آتے ہیں چیخ چیخ کر دعا مانگی کہ اس کو اپنی حفاظت کے سایہ میں رکھیں۔ وہ بار بار چیخا لیکن جہاں تک میں نے اندازہ کیا انھوں نے اس کی دعاؤں کا کچھ اثر نہیں لیا۔ ملایک سے استمداد کرنے کا خیال مجھ پر بھی اثر انداز ہو گیا اور جب میرے وعظ کہنے کی نوبت آئی تو مجھے کچھ شرارت سوجھی، لیکن میں نے اپنا فرض بخوبی ادا کر دیا اور حاضرین مطمئن نظر آتے تھے۔"

میری ماں موجودہ تعلیمی درسگاہوں سے زیادہ ہوشمند تھی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ آزادی کی عام غذا میں تنظیم کی ایک مناسب خوراک دوا کو کس طرح تحلیل کر دیا جائے۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک ایجاد یہ کی کہ بچوں کے اجتماعی طعام کا انتظام کیا اور یہ التزام رکھا کہ ان موقعوں پر جو بالغ شریک ہوں وہ گفتگو میں حصہ نہ لیں۔ اسی طرح بالغوں کے طعام کو رواج دیا گیا اور یہ دونوں منصوبے پورے سرگرمی کے ساتھ زیر عمل آگئے۔ بے شک بچوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملنا ضروری ہے اور ان کے والدین کو بھی، لیکن ان میں سے کوئی بھی خود پرستی کی ہمت نہ بڑھنے پائے۔ علاوہ ازیں ہمارے گھر کا انصرام نسوانی اصولوں پر ہو رہا تھا۔ ویسٹ بلوم فیلڈ میں میری بہن اپنی باری پر باغیچہ کو بھی کھودتی تھی اور ایک ضعیف العمر گھوڑی کے اصطبل کو بھی صاف کرتی تھی اس گھوڑی پر جو کسی زمانہ میں گھوڑ دوڑ میں حصہ لیا کرتی تھی میری والدہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں مختلف گرجاؤں میں جایا کرتی تھی۔ میں اور میرا بھائی باری باری سے بستر کرنے اور رکابیاں دھونے کی خدمت انجام دیا کرتے تھے مختصر یہ کہ اگرچہ میری شخصیت کا واجبی احترام کیا جاتا تھا لیکن ابتداء عمر ہی سے یہ بتا دیا گیا تھا کہ زندگی کے لوازمات میں ان کاموں کی انجام دہی بھی شامل ہے جو ہمارے مرغوب طبع نہیں ہیں۔ اس غیر معمولی خوش بختی کے لئے میں اپنی والدہ کا بہت زیادہ ممنون احسان ہوں۔

آپ کو یہ بھی باور کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ میرے والد درویش صفت انسان تھے۔ ملک کے شہری، ایک شوہر، باپ اور دینی حاکم ہونے کی حیثیت سے نکے

ذمہ جو فرائض تھے ان کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ بہت زیادہ نیک بھی تھے، لیکن عیسائیت کے نصب العین کا (اگر آپ اس میں اعتقاد رکھتے ہیں) تقاضا زندگی کے تقاضہ سے زیادہ شدید ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ خود زندگی اور اسکا اندازِ عمل بہت اعلےٰ ہوگا اور بالکل تبدیل ہو جائے گا۔ یہ نصب العین ناقابلِ عمل ہے اور کم از کم اخلاقی حیثیت سے انقلابی ہے۔ عیسائیت کے پرجوش حامی مثلاً سینٹ فرانسس، جارج فاکس اور ٹالسٹائی وغیرہ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ یہ بزرگ عیسائیت پر اعتقاد میں اس قدر غلو کرتے تھے کہ ان کو مذہب کی موجودہ ہیئت کو خیرباد کہنے میں بھی دریغ نہیں ہوا۔ میری ماں نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ اپنے سادہ اور غیر متکبرانہ طریقہ سے اور بغیر جوش و خروش کے (کیونکہ اس کی خوش طبعی کے باعث اس کی ضرورت نہ تھی) لیکن دائمی اندرونی کشمکش کے ساتھ اس نے ایسی زندگی شروع کی جس کا اصلی مغز متواتر عمل تھا اور محض نیکی کے ساتھ زندہ رہنا ہی نہ تھا۔ اس نے ہمارے کافی بڑے اور معمولی حیثیت کے خاندان میں کئی لاوارث بچوں کو یکے بعد دیگرے رکھا۔ ان کی پرورش کی، تربیت کی اور محنت اٹھا کر ان کو تعلیم دی۔ مجھے ایسا کوئی زمانہ یاد نہیں ہے جب کوئی نہ کوئی بچہ یا بچی ہمارے گھر میں نہ رہتی ہو کیونکہ ان کے لئے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

یہ تو اس کی فیض رسانی کے بڑے بڑے اجزا تھے۔ وہ خفیہ طریقہ پر بھی ہمیشہ ایثار و فیاضی کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ گرجا کے انتظام کی نگرانی کے علاوہ دن میں تین مرتبہ

گھر کا کھانا پکاتی تھی اور بچوں کو کھانا بھی کھلاتی تھی۔ ایک تنہا رہنے والی ضعیف خاتون جو پانچ میل سے سواری میں چل کر والدہ کا خطبہ سُننے کیلئے گرجا میں آیا کرتی تھی فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر بصارت سے محروم ہو گئی۔ میری والدہ نے سڑک پہ سے ایک کار کرائے پر لی اور اس کو دیکھنے کے لیئے گئی۔ واپس آکر اس نے مجھ سے کہا کہ ملبس! مسز ایل نے مجھ سے کہا کہ صرف میرے خطبات نے اسے زندہ رہنے کی ہمّت بخشی ہے۔ اس کے پاس بالکل کوئی اندوختہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میں ہر ہفتہ اس کے پاس آکر خطبہ سُنایا کروں گی میں اس کو ایک ناول بھی پڑھ کر سناؤں گی، اس سے اس کو بہت فائدہ ہو گا۔" میں اتنا ہاشور تھا کہ یہ سُن کر بالکل سہم گیا اور بہ اصرار کہا گیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ خطبہ کسی اور کے ذریعہ بھیج دیں اور کوئی دوسرا شخص اس کو پڑھ کر سُنا دے۔ ماں نے جواب دیا "تم جانتے ہو اسکی یہ خواہش نہیں ہے۔"

جب تک وہ خاتون زندہ رہی میری ماں کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر ہر جمعرات کو سہ پہر کے وقت جاتی اور دیہات کا تکلیف دہ سفر کر کے اسکو خطبہ سُنایا کرتی تھی۔ کوئی پریشانی یا تھکاوٹ اس کو اس من موجی پرہیزگارانہ مہربانی سے نہ روک سکی اور اس سلسلہ میں کبھی کوئی شکایت یا فخر کا لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلا، بلکہ وہ اس کو ایک نہایت حقیر روشن قطرہ سمجھتی تھی جس کو وہ انسانوں کے باہمی برتاؤ کے بھیانک اور تاریک سمندر میں شامل کر رہی تھی۔ ایک صحیح عقیدت مند اور حقیقت شناس عیسائی کی طرح وہ کارہائے

خیر کے ذریعے اس بحرِ ظلمات کی کثافت کو دور کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

کسی ایسے شخص کی ذات میں جو پرہیزگاری کا لبادہ پہنے ہو یہ نیک طینتی شاید ایسی خوش آیند معلوم نہ ہو، لیکن میری والدہ کی طبیعت رنگینی اور ظرافت سے لبریز تھی جو ہر موقع پر ظاہر ہوتی تھی۔ اس کے کلیسائی حلقہ کے ایک شخص نے جو روحانیت کا قایل تھا۔ اس کو ایک میڈیم (معمول) کو دیکھنے کے لئے آمادہ کیا۔ ایک لمبی مسافت طے کر کے جب وہ حاضرات کے کمرے میں پہنچے تو میری والدہ نہایت بے تابی سے ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئی وہ میڈیم گھبرا کر چوکنا ہو گئی اور کہا۔

اوہ تم اس کرسی پر مت بیٹھو۔ اس پر تو جارج بیٹھا ہوا ہے!" والدہ نے جواب دیا۔ "آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ اس کرسی کو چھوڑ دے۔ میں بہت تھک گئی ہوں!"

جمہوریت پسند معاشرہ میں دولت کی بنیاد پر جو امتیازات پائے جاتے ہیں اور اس میں دینی پیشوا کی جو مخصوص حیثیت ہے ان کے متعلق اس کے محسوسات بہت عجیب تھے۔ ایک مرتبہ اس نے لیکچر کی فیس میں سے پانچ ڈالر لیئے اور افراد خاندان کے سامنے بہت زور دے کر کہا کہ کچھ بھی ہو وہ ایک ریشمی چھتری ضرور خریدے گی۔ اس نے کہا "گلیوں میں گھومتے پھرتے وقت عورت کو دُنیا کی کسی چیز سے اتنی جمعیت خاطر حاصل نہیں ہوتی جتنی اس خیال سے ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں ایک ریشمی چھتری ہے۔"

اس چھتری کو خریدے ہوئے ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ ایک وزیر نے

وہ چھتری مانگ لی اور جب رات کو میں گھر واپس آیا تو چھتری میرے پاس نہیں تھی۔ میں اُلٹے پاؤں واپس گیا اور چھتری کی تلاش میں کونہ کونہ چھانکر ناکام واپس آگیا اور آخرکار والدہ کو یہ افسوسناک خبر سنائی کہ چھتری گم ہوگئی ہے۔ جواب میں اس نے کہا: "میکس! میرے پاس ایک ہی چیز تھی جس کی بنیاد پر میں ذاتی احترام کا دعویٰ کرسکتی تھی، اس کو تم نے ضائع کردیا۔ بایں ہمہ میں یہ جانتی تھی کہ یہ دعویٰ غلط تھا، میں اس ریشمی چھتری کی اہل کبھی نہیں ہوئی۔"

جو لوگ ہمدردی کے حدود بڑھانے میں منہمک رہتے ہیں ان میں بہت کم ایسے باہمّت لوگ ہوتے ہیں جو "علم" کی وسعتوں کو بھی ترقی دیں۔ لیکن میری والدہ میں یہ خاص خوبی بھی تھی۔ وہ اس بات کو علانیہ عوام کے روبرو بیان کردیتی جو مطالعہ اور مراقبہ سے اس پر منکشف اور متحقق ہوتی تھی اور اس کا یہ اعادہ جو بلا کسی رعایت یا شرط کے ہوتا تھا مجھے نہایت جرات مندانہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ مسرّت و انبساط میں اصنام پرستوں کا سا اعتقاد رکھتی تھی اور یہ بھی مانتی تھی کہ ہر ایک کو ان کی کیفیات سے بہرہ اندوز ہونے کا حق ہے۔ اس کے گرجا میں شریک عبادت ہونے والے بہت سے اشخاص کو اس کا یہ اعتقاد تکلیف دہ تھا لیکن اس نے کبھی اپنے دینی شغف کو بڑھا چڑھا کر ظاہر نہیں کیا۔ ایک شخص نے عبادت کے اجتماع میں حاضری بہت کم ہونے کی شکایت کی تو فی الفور جواب دیا:

"میں بھی اگر قسیسہ نہ ہوتی تو جماعت میں شریک نہ ہوتی!"

ارتقا میں اس کی دلچسپی لازوال تھی (اس کا یہ تصوّر تھا کہ خدا کا یہ منشا اور فرمان ہے کہ انسان ترقی کرتا رہے) اس نظریہ پر مبنی اس کے بعض اقوال سے آزاد گرجا کے جہاں وہ وعظ کہتی تھی بعض عمر رسیدہ ارکان بھی خائف ہو گئے۔ یہ پارک گرجا سارے ملک میں غیر فرقہ وارانہ ہونے کے علاوہ پہلا اجتماعی قسم کا گرجا تھا۔ حقیقتاً یہ پہلا معبدِ الٰہی تھا جس میں بلیرڈ کھیلنے کی میزیں اور ایک تھیٹر بھی تھا۔ لیکن اس کا تعلق اسی قدیم مسلک سے وابستہ تھا جو جوناتھن ایڈورڈس کے زمانہ سے چلا آ رہا تھا۔

میری ماں چونکہ عیسائیت کے انتہائی ترقی یافتہ اصولوں سے آگاہ تھی اس لئے اس نے اس روایتی مسلک سے دامن کھینچ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے تکلیف دہ جزئیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین کے منافی ہیں جس کا عین مقصد عبادت گذاروں کی زندگی اور کارہائے خیر میں اتصال پیدا کرنا تھا۔ اس کے نزدیک مذہب کا حقیقی مقصد یہی تھا۔ وہ اس تبدیلی کو اپنے سینہ میں مخفی نہیں رکھ سکتی تھی۔ خواہ کچھ بھی خطرہ پیش آئے وہ جماعت کے سامنے اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی تھی۔ اس کی حکمت عملی اور قوّت کا یہ شاہکار لائق صد آفریں ہے کہ اس نے اس قدیمی اور بڑے گرجا کو جو ایلمیرا کا سب سے عظیم گرجا تھا تثلیث پرستی سے توحید پرستی میں تبدیل کر دیا اور کسی ایک فرد نے بھی جماعت کو ترک نہیں کیا۔ اس کی حکمتِ عملی کی وجہ سے لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ ان کے خاوند کا پیدا کردہ تصور ہے۔

اگرچہ میری ماں نے بہت سی تجہیز و تکفین کی عبادات کی رہنمائی کی تھی لیکن (یا شاید اسی وجہ سے) اس کو ان عبادتوں پر اعتقاد نہیں تھا؛ اور اس کی خواہش تھی کہ اس کے جنازہ پر یہ عبادات نہ کی جائیں اس کی وفات کے بعد پہلے اتوار کو گرجا میں ایک جلسہ تعزیت منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ میں اور لوگوں کے علاوہ زیڈ۔ آر۔ بروک وے نے بھی جو برسوں المیرا کے دارالاصلاح کا سربراہ رہ چکا تھا اور موجودہ علم تفتیش جرائم کے بانیوں میں سے تھا تقریر کی۔ ماں کی تعریف میں بیٹا اگر کچھ کہے تو لوگ اس پر یقین نہیں کرتے اس لئے میں بروک وے کے الفاظ دہرا دینا چاہتا ہوں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہ میرے تمام مذہبی معلمین میں وہ سب سے زیادہ میرے خیالات سے ہم آہنگ تھی۔ اس نے کہا

"مسز لنس فورڈ اسٹیمین دلیر تھی یقین کلی سے جو دلیری پیدا ہوتی ہے وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی، لیکن یہ دلیری نیک مزاجی اور لطیف تواضع اور التفات کے ساتھ اس طرح مربوط اور نمود و نمائش سے اتنی دور تھی کہ وہ بظاہر نظر نہ آتی تھی۔ ایسے باطل دلائل کی قطعی متحمل نہ تھی جو دکھاوٹ اور جھوٹی تسلی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دیانتدارانہ اختلاف سے بے حد رواداری برتتی تھی۔ اس سب کے باوجود وہ غیر معمولی طور پر موقع شناس تھی اور اس کی موقع شناسی محض چالاکی اور مکر و فن سے کہیں زیادہ بالاتر تھی۔" اور میں اس پر الفاظ ذیل کا اضافہ کروں گا جو پارک سے آئے ہوئے اصطباغی پادری نے اس کے لئے کہے:۔

"میں یہاں بھی وہ بات کہنا چاہتا ہوں جو میں نے گزشتہ اتوار کو اپنے منبر پر کہی تھی کہ میرے علم میں وہ تنہا ایسی خاتون تھی جس نے عوام میں تقریر کرنا شروع کیا اور اس کام کے نتیجہ میں اس نے اپنی حسین نسوانیت کے اعلےٰ اوصاف میں جو ہمارے لئے دلکش ہوتے ہیں کچھ بھی ضائع نہ کیا میرا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اپنے اقوال وافعال میں وہ بے تکلف، پُرخلوص اور بے تصنع تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات میں وہ خدائے تعالےٰ کی فطرت اور کائنات کی خوش آہنگیوں کے مطابق تھی۔ اس کے دینیاتی خیالات سے جیسے کہ وہ میرے علم میں آئے ہیں مجھے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ مسز ایسٹمین خدائے تعالیٰ کے برگزیدہ انسانوں میں سے تھی۔"

جب میں وہاں بیٹھا ہوا تھا حرماں زدہ لیکن اس کی باعثِ فخر محبت دل میں لیئے ہوئے تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس کی سب سے نایاب صفت وہ تھی جس کو وہ اپنے وعظوں میں سب سے زیادہ فصاحت کے ساتھ بیان کرتی تھی یعنی ترقی کرتے رہنے کی صفت۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے شباب کی ہر صبح مجھے بلند کیا جاتا تھا۔ اور کسی نئی سوچی ہوئی واضح اسکیم کے ذریعہ مجھے کسی شاندار مہم کے لیئے تیار کیا جاتا تھا، ایسی اسکیم جسے وہ زندگی میں عظمت پیدا کرنے کے لیئے پیش کرتی تھی۔ اس کی اس صفت میں عمر کے زیادہ ہوتے جانے کے باعث بھی ذرہ بھر کمی نہ آئی۔

ہماری خط وکتابت پر نظر ڈالنے سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری بارہ مہینوں کے دوران میں اس نے چار ایسے کام کیئے جن سے پتہ

چلتا ہے کہ انہیں نوجوانوں جیسی دلیری اور لچک موجود تھی۔ اس نے مسودہ کی مدد کے بغیر وعظ کہنا سیکھ لیا، اس نے تیرنا سیکھا، اس نے تحلیل نفسی کے ایک ماہر سے مشورہ کیا اور اس نے پادری کا کام چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ تا کہ اس تحریک کو جو اسے برنارڈ کالج کا ڈین (منتظم) بنانے کے لئے شروع کی گئی تھی تقویت پہونچے۔ ڈاکٹر اے۔ اے۔ برل اس ملک میں سب سے پہلا ماہر تحلیل نفسی تھا اور وہ سب سے پہلی مریضہ تھی جس نے اس سے مشورہ کیا۔ وہ ڈاکٹر کے لئے اسی طرح ناقابل فراموش تھی جس طرح میرے لئے بلکہ ان سب کے لئے۔

## نوٹ مصنف :- متعلق صفحہ (۷۷)

۱ھ ہیمنگوے کو صحافت سے ادبی میدان میں منتقل ہونے کے دوران جو مشکلات پیش آئیں اُن کا ذکر چارلس اے فینٹن نے اپنی کتاب "ارنسٹ ہیمنگوے کا عہدِ تربیت" میں کیا ہے۔ چونکہ اخبار نویسی کے پنجسالہ عہد کے بعد ہیمنگوے ایک نہایت اعلا ادبی طرزِ نگارش اختیار کر چکا تھا اس لئے فینٹن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صحافتی دَور میں ہیمنگوے کو ادبی کامرانیوں کو پرورش کرنے کا موقع ملا۔ لیکن میں اس کے برعکس یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں اُس میں چند ایسی قبیح عادتیں جڑ پکڑ گئیں جن سے وہ کلیتاً رستگاری حاصل نہ کر سکا۔

۲ھ متعلق صفحہ (۹۳)

جب میں نے "بُل انڈی آفٹرنون" کو اپنے مجموعہ مضامین کے ساتھ دوبارہ شائع کیا تو میں نے "پورا قد آور انسان" کے الفاظ جملہ میں سے نکال کر "آہنی ساخت کا انسان" لکھدیے۔ مجھے یہ توقع تھی کہ اگرچہ عبارت کا سیاق اس سے مجروح ہوگا لیکن اس شبہ کا کہ میں جنسی معاملہ کا ذکر کر رہا ہوں بالکل ازالہ ہو جائے گا۔

۳ھ متعلق صفحہ (۱۳۱)

ازرا پاؤنڈ کے مبلغ علم کے متعلق ناظرین اگر "رابرٹ گریوز" کے مضمون "اوا سرائیل! کیا یہ تیرے خداوند مجازی ہیں؟" کا مطالعہ کریں تو اُن کو بڑی مسرت ہوگی۔ میری نظر میں اس خوشامدی عہد میں صرف گریوز ہی ایک ایسا شخص ہے جس نے شاعری کی تنقید میں بڑی جرأت سے کام لیکر اور تملق و چاپلوسی سے بالاتر ہو کر اس شخصیت پرستی کے زمانہ میں حقیقی تنقید کے تقاضوں کو پورا کیا!

۵۴ متعلق صفحہ (۱۳۱)

شعری محاورات کے متعلق فریڈرک پاٹل کی کتاب "محاورات شعر" کے مطالعہ سے وہ تمام

چیزیں ظاہر ہو جائیں گی جو میرے ذہن میں ہیں۔

۵۵ متعلق صفحہ (۲۹۱) (تو وہ برٹرینڈ رسل سے ہی رجوع کرتے ہیں)

ان خیالات و آراء کے لئے میں سی۔ کے۔ اوگڈن کا ممنون ہوں کہ جس نے سٹرڈے

ریویو آف لٹریچر مورخہ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۶ء میں زیر عنوان "دی نیو برطانیکا" میں

اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۵۶ متعلق صفحہ (۳۲۲)

کتاب "یادداشتی خاکے" صفحہ ۳۸

۵۷ متعلق صفحہ (۳۲۲)

یہ ثابت کرنے کی غرض سے کہ اس قسم کے تعیشات یکطرفہ نہیں ہوا کرتے تھے میں چارلی

کے حالات سفر یورپ (۱۹۲۱ء) کے فرانسیسی ترجمہ سے حسب ذیل اقتباس

پیش کرتا ہوں:۔

"آج میں نے اپنے عزیز دوست میکس ایسٹمین کے ہمراہ دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس نے

مجھ سے اپنے گھر پر عصرانہ میں شرکت کے لئے کہا، میں نے بڑی مسرت سے اس کی

دعوت کو قبول کر لیا۔ ..... یہ عصرانہ کس قدر پُر مسرت تھا! میں خود اپنی ذات کو بھول

ہوا تھا میرے جذبات قہقہوں کی حد سے گزر کر اشکباری تک پہونچ رہے تھے اور ان میں

تصنع یا ریا کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ میں اسی غرض سے لاس اینجلیز سے چلا تھا۔

# نوٹ مترجم

(متعلق صفحہ ۱۲۴)

ایڈنا سینٹ ونسینٹ ملے ۲۲ر فروری ۱۸۹۲ء کو راک لینڈ (میامی) میں پیدا ہوئی اس کی والدہ نرس تھی اور غربت کی حالت میں تین بچوں کی پرورش کا بار اُس کے کاندھے پر تھا۔ کم سن ملے اپنی والدہ کی شریک کار تھی۔ اس کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۱۴ سال کی عمر میں ایک نظم لکھنے پر طلائی تمغہ بطور انعام ملا اور کچھ عرصہ بعد شاعری کے موضوعوں پر مضمون لکھ کر اول انعام حاصل کیا۔ ۲۰ سال کی عمر میں مشہور طویل نظم: "رینائے سینس" لکھی۔ ۱۹۱۷ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اب وہ نیویارک پہونچ گئی وہاں تھیئٹر میں حصہ لیا۔ اور تھیئٹر کے لئے ڈرامے بھی لکھے جن میں سے بعض ندرت شگفتگی اور زورِ بیان کی وجہ سے آج تک مشہور ہیں۔

ملے نے بعض بڑی اچھوتی اور فکر انگیز نظمیں لکھی ہیں جن میں سے چند ایک کا شمار موجودہ دور کی نظموں اور غزلوں میں کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ملے کی شادی ہوئی لیکن اسکی شاعرانہ سرگرمی اور سماجی کاموں کی رغبت میں کوئی کمی نہ آئی۔ نثر میں بھی اکثر مضامین لکھے ہیں اس کی مشہور تخلیقات کا ذکر مضمون میں آچکا ہے اس لئے ان کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

(متعلق صفحہ ۱۶۳)

سنتیانا۔ جارج سنتیانا مشہور فلسفی اور ادیب میڈرڈ میں ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوا۔ نو سال کی عمر میں امریکہ چلا گیا وہاں ۲۲ سال کی مدت ہارورڈ یونیورسٹی میں بحیثیت معلم گذاری۔ ۱۹۱۲ء میں یورپ واپس آگیا اور فلسفہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔

اس کی تصنیفات کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اپنے حالات زندگی بھی قلمبند کئے ہیں اسکے علاوہ بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ گرجا میں راہبانہ زندگی گذارنے کے باوجود مذہبی خیالات اور دینی معتقدات میں پختگی اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ جس کی وجہ سے الحاد کی طرف طبیعت رجوع ہے۔

**لیون ٹراٹسکی** ۱۸۷۹ء سے ۱۹۴۰ء: یہ یہودی نژاد تھا اور یوکرین میں پیدا ہوا لیکن اس (متعلق صفحہ ۲۲۵) روسی انقلاب پسند قائد کی طویل عمر کا زیادہ تر حصہ جلا وطنی میں گذرا۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ یہ زیادہ تر بے وطن رہا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں انقلابی سرگرمیوں میں شرکت کی پاداش میں اس کو سائبیریا بھیجا گیا وہاں سے وہ کسی تدبیر سے یورپ بھاگ نکلا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں روس واپس آیا۔ لیکن پھر جلا وطن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ٹراٹسکی کو پھر وطن واپس آنے کا موقع مل گیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں ٹراٹسکی نیویارک پہنچ گیا اور وہاں سے ایک اشتراکی رسالہ اپنی ادارت میں جاری کیا۔ اس عرصہ میں روسی انقلاب نے زار کی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا اور اقتدار کی باگ بالشویکوں کے ہاتھ میں آگئی۔ ٹراٹسکی تو ایسے موقعے کا منتظر ہی تھا فوراً وطن کو مراجعت کی اور بالشویکی سرغنا لینن کے ساتھ مل کر انقلاب کے استحکام اور کامیابی کے لئے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے وزارتِ خارجہ کا کام سنبھالا۔ پھر وزارتِ دفاع کا چارج لیا۔ ٹراٹسکی کا سب سے بڑا کارنامہ جس سے اس کی غیر معمولی تنظیمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سرخ افواج کی تنظیم ہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں لینن کی وفات نے اس کے کام میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اب ٹراٹسکی اور اسٹالن کی رقابت اور اقتدار کے لئے رسہ کشی کھل کر سامنے آگئی۔ ٹراٹسکی کو میدان چھوڑنا پڑا اور سنہ ۱۹۲۹ء میں وہ وطن کو بھی خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا لیکن اس غریب الوطنی کی حالت میں بھی وہ زبانی شررافشانی اور قلم کی جولانی سے ہمیشہ اسٹالن کے اقتدار کے خلاف مصروف جہاد رہا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں اس نے امریکہ کی ریاست میکسیکو میں پناہ لی اور یہیں سنہ ۱۹۴۰ء میں اپنے ایک ساتھی

کے ہاتھ سے قتل کیا گیا۔ اُس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کے انگریزی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان میں تاریخ انقلاب فرانس اور انقلاب سے غداری بہت مشہور ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں اُس نے اسٹالن کے خلاف بہت سے پوشیدہ رازوں کا انکشاف کیا ہے اور پوست کندہ حالات لکھے ہیں۔

## ہیمنگوے

متعلق صلہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۶۱ء

امریکہ کا مشہور ناول نگار جو ایک زمانے میں متعدد صحافی اور امریکہ کے موقر روزناموں کا نامہ نگار بھی رہ چکا تھا۔ ابتدا میں اس کی دماغی تخلیقات کچھ زیادہ نظر قبولیت سے نہیں دیکھی گئیں۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں جب اس ناول "سورج بھی طلوع ہوتا ہے" اُفق ادب پر نمودار ہوا تو اس کی چمک دمک نے امریکہ کے ادبی حلقوں کو خیرہ چشم کر دیا اور ہیمنگوے کی شہرت نصف النہار کو پہونچ گئی۔ یہ ناول اُس کی بہترین ادبی تخلیق شمار ہوتا ہے۔

اسپین کی خون آشام تفریح "سانڈوں کی لڑائی" سے ہیمنگوے کو بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر یہ تماشا دیکھنے کے لئے اسپین پہونچ جاتا تھا اور کئی کتابیں بھی اس کے متعلق لکھ ڈالیں۔ "سہ پہر میں موت" ناول ایسے ہی ایک جان لیوا مقابلے کی کیفیات اور عوام کے جوش و خروش کے اظہار کے متعلق لکھا گیا ہے۔

ہیمنگوے کی زندگی اُس کے ادبی ذوق و شوق اور انہماک کے باوجود بڑی مہم جویانہ اور خطرات سے پُر رہی۔ لڑائیوں میں اس نے شرکت کی اور زخم کھائے۔ اتفاقی حادثات سے بھی اُس کو دوچار ہونا پڑا۔ پُر خطر شکاروں کی تلاش میں افریقہ کے جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔

میکس ایسٹ مین مصنف کتا ہے اُس کے ذاتی تعلقات خوش گوار نہیں تھے جس کی بنا پر اُس نے ہیمنگوے کا ملاقاتی خاکہ صحیح خد و خال کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے لیکن اُس کی دماغی شہ زوری اور ادبی تنومندی کا اعتراف کرنے میں ایسٹ مین نے بھی پس و پیش نہیں کیا۔

۵ــ متعلق صفحہ (۳۶۵)

جان ڈیوی ۱۸۵۹ء سے ۱۹۵۲ء امریکی فلسفی ماہر نفسیات اور بیسویں صدی کا مشہور ماہر تعلیم اپنے نظریۂ تعلیم کی وجہ سے جس کو عملی شکل دی شہرت دوام حاصل کی۔ وظائفی نفسیات کی ایجاد کرکے بھی بہت شہرت حاصل کی۔ ابتدا میں بچوں کے اسکول سے متعلق رہے لیکن ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۴ء تک شکاگو یونیورسٹی میں اور ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۰ء تک کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ طریقۂ تعلیم اور فلسفۂ تعلیم پر ان کی بیش بہا تحقیقات ہمیشہ یادگار رہیں۔ ہر حصۂ ملک کی تعلیم ان سے متاثر ہوئی ہے۔

۱۵ ــ سگمنڈ (سائیمنڈ فرائڈ) ۱۸۵۶ء سے ۱۹۳۹ء۔ آسٹریہ ہنگری کا باشندہ ماہر نفسیات ذہنی امراض کا معالج اور تحلیل نفسی کا موجد۔ یہ ویانا میں طبابت کیا کرتا تھا اور پڑھاتا بھی تھا۔ ۱۹۳۸ء میں جرمن نازیوں کے مظالم سے تنگ آکر آسٹریا سے ترک وطن کیا اور انگلستان میں سکونت اختیار کرلی۔ ایک سال بعد ہی انتقال ہوگیا۔ اسکی متعدد تصانیف ہیں اور بعض عجیب وغریب نظریات کی وجہ سے مشہور ہے۔

(متعلق صفحہ ۳۸۰)

ولیم آرتھر برٹرینڈ رسل ۱۸۷۲ء — شہرۂ آفاق انگریز فلسفی جو طبقۂ امراء سے تعلق رکھتا ہے ٹری نیٹی کالج آکسفورڈ میں پروفیسر رہا ہے شاندار علمی خدمات کے صلہ میں نوبل پرائز حاصل کیا۔ اس کی تحریرات میں حد درجہ سادگی اور موضوع کی دلکش وضاحت پائی جاتی ہے۔ اس کے نظام فلسفہ کی بنیاد تشکیک اور عدم ایقان پر ہے۔ ادب۔ فلسفہ۔ ریاضی اور مابعد الطبیعات جیسے ادق مضامین

پر اس کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ سیاسی و سماجی مصلح۔ مخالف جنگ اور عالمگیر انسانی ہمدردی کے مناد خاص کی حیثیت سے اُس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے اور پیرانہ سالی نیز حکومت کی مخالفت کے علی الرغم اپنے اصولوں پر عملی طریقہ سے کاربند ہونے میں اُس نے ذرا سی بھی جھجک نہیں ظاہر کی۔

اُس کا عقیدہ ہے کہ فلسفی کا کام مبحث کو واضح کرنا ہے۔ نظری خیال آرائیوں کے گورکھ دھندے میں لوگوں کو پھنسانا اُس کے مسلک کے منافی ہے۔

## نوٹ مترجم متعلق صفحہ ۷۲

لہ جینوآ کانفرنس (دس اپریل ۱۹۲۲ء سے ۱۹ مئی ۱۹۲۲ء تک۔ یہ اطالیہ کا خاص بندرگاہ ہے اور اسی نام کے ایک صوبہ کا صدر مقام ہے۔ یہاں ایک مشہور پرانی یونیورسٹی ہے۔ عالمگیر جنگ اول کے اختتام پر بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے، اور پائدار امن کے قیام کی تدابیر سوچنے کی غرض سے جو مشاورتی اجلاس سرکاری و نیم سرکاری سطح پر منعقد ہوئے اُس سلسلے کی ایک کڑی یہ کانفرنس بھی ہے۔ اس میں برطانیہ اور اُس کے نوآبادیات۔ ۲۹ یورپی حکومتوں کے جن میں فاتحین جنگ۔ غیر جانب داران اور ہزیمت یافتہ مخاصمین کے نمائندے شامل کیے گئے تھے محض ترکی کو یہ اعزاز نہیں بخشا گیا تھا کیونکہ اُس وقت تک اس کا شمار یورپی ممالک میں نہیں تھا۔ بالشویک روس کے نمائندوں کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اس لیے کہ اس کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس ملک کو بین الاقوامی برادری میں از سرنو شامل کر لیا جائے۔ کانفرنس کی کارروائی کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ جرمنی اور روس نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کر لیا۔ اس غیر متوقع انکشاف نے اُن تمام منصوبوں کے جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ اور ایم، پوائن کارے وزیر اعظم فرانس نے یورپ کی تعمیر نو کے سلسلے میں بڑی

جاں کاہی اور بے نظیر سیاسی سمجھ بوجھ سے تیار کئے تھے تار و پود بکھیر دئے۔ اب اس کانفرنس کا کوئی مفید مقصد باقی نہیں رہا۔ اس لئے اس کو برخاست کر دیا گیا۔

۷۵ ڈیوڈ لائڈ جارج۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۹۴۵ء تک۔ مشہور انگریز سیاست داں اور جنگ عظیم اول میں انگریزوں کی کامیابی کا خاص معمار ۱۸۹۰ء میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوا اپنی خداداد قابلیت بے نظیر جوش خطابت اور سیاسی بصیرت کی مدد سے جلد جلد شہرت اور بلند مقام حاصل کرنا شروع کیا۔ جنگ عظیم اول کے دوران جب متواتر شکستوں اور سامان حرب کی کمی اور عدم تنظیم کی وجہ سے سارے ملک میں مایوسی اور پژمردگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لائڈ جارج کی حیرت انگیز ہمت و دوا دوانتھک کوشش و عمل نے قوم کے مردہ تن میں ہمت اور جرات کی ایک نئی روح پھونک دی اور قوم ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو گئی۔ انگلستان کو اس جنگ عظیم میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس میں لائڈ جارج کی قابلیت سیاسی فکر اور بین الاقوامی جوڑ توڑ کو بڑا دخل ہے۔ مسٹر ایسکوئتھ کی وزارت ٹوٹنے پر قلمدان وزارت ۱۹۱۵ء میں لائڈ جارج کے سپرد ہوا۔ جنگ اختتام پر جو اہم مسائل اور پیچیدگیاں سامنے آئیں ان کا حل تلاش کرنے کے لئے لائڈ جارج نے تمام اخلاقی اقدار، اصول انسانیت اور مستحکم عہد و پیمان بالائے طاق رکھ کر صرف اپنے ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ ۱۹۲۲ء کے عام انتخاب میں اس کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا ۱۹۴۴ء میں اس کو زمرۂ امراء میں شامل کر لیا گیا۔ لائڈ جارج نے جنگ اول کے تذکرے کی ۶ جلدیں شائع کیں۔

# فہرست کتب مطبوعہ

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات | از مولانا اعجاز الحق قدوسی تعارف از ڈاکٹر اینی میری شمیل پروفیسر بون یونیورسٹی۔ | قیمت ۱۰ دس روپئے |
| ۲۔ علمائے سلف و نابینا علماء | تصنیف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ تعلیقات و حواشی مفتی انتظام اللہ شہابی و ثناء الحق صدیقی۔ | ۹ نو روپئے |
| ۳۔ اُردو زبان اور اسالیب | تصنیف سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی۔ مقدمہ جناب ممتاز حسن صاحب | ۹ نو روپئے |
| ۴۔ حکیم عمر خیّام | تالیف ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی صاحب مقدمہ سید الطاف علی بریلوی | ۲ دو روپئے |
| ۵۔ ذکر و فکر | مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مقدمہ جناب انعام عظیم برنی ایم اے | قیمت ۷۵ پیسے |

| | | |
|---|---|---|
| ۶- خط وخطاطی | مصنفہ شیخ ممتاز حسین جون پوری و محمد ایوب قادری ایم۔اے۔ مقدمہ جناب ڈاکٹر زبید احمد ایم، اے۔پی، ایچ۔ڈی۔ | ایک روپیہ |
| ۷- پاکستان کا معاشی پس منظر | مصنفہ سید انیس فاطمہ بریلوی۔ پیش لفظ ڈاکٹر سید ظہیر الدالدین۔ ایم اے۔ ڈی لٹ۔ | تین روپے پچاس پیسے |
| ۸- چند عظیم علمائے جراثیم | (انگریزی تصنیف مائکروب ہنٹرز کا اردو ترجمہ) از پروفیسر عبدالمجید قریشی۔ | دس روپے |
| ۹- تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ | از پروفیسر وحید الحق صدیقی سابق پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ و سید منیر الدین ایڈوکیٹ۔ | چار روپے |
| ۱۰- علم وعمل (جلد اول) | فارسی تصنیف وقائع عبدالقادر خانی کا اردو ترجمہ از مولوی معین الدین افضل گڑھی ترتیب و حواشی از محمد ایوب قادری ایم۔اے۔ تعارف نواب صدر یار جنگ و مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ | قیمت آٹھ روپے |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۱- علم و عمل (جلد دوم) | " " " " | |
| ۱۲- جان ڈوی کا فلسفۂ تعلیم | ڈاکٹر روتھ اسپنسر آرنٹ کی تالیف جان ڈیویز فلاسفی آف ایجوکیشن کا اُردو ترجمہ از سید عین الدین علوی ایم۔اے۔ | ۲ دو روپے پچاس پیسے |
| ۱۳- مقدر انسانی | لی کامت ڈونوائے کی تصنیف "ہیومن ڈسٹنی" کا اُردو ترجمہ از پروفیسر عبدالمجید قریشی۔ ایم۔اے | ۸ آٹھ روپے |
| ۱۴- رومن رسم الخط اور پاکستان۔ | مصنّفہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی۔ | ۵۰ پچاس پیسے |
| ۱۵- "قدیم شہنشاہیاں"۔ | مصنّفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) | تین روپے |
| ۱۶- اصول و اساس تعلیم | سر پرسی نن کی عالمانہ تصنیف ایجوکیشن اِٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس کا (اردو ترجمہ) از انعام عظیم برنی، اخلاص حسین ایم۔اے محمد حسین خاں زبیری ایم۔اے۔ سید بدر الحسن اور سید اظہر حسین رضوی ایم۔اے۔ | ۵ پانچ روپے |

| | | قیمت |
|---|---|---|
| ۱۷- اصول تدریس | زایئرن اور فوچ کی کتاب (پرنسپلس آف ٹیچرس کا اردو ترجمہ) از اخلاص حسین۔ ایم، اے۔ | ۵ پانچ روپے |
| ۱۸- حیات مابعد | مصنفہ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی | تین روپے پچاس پیسے |
| ۱۹- مکاشفات کشفی۔ | مصنفہ خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی | ۳ تین روپے |
| ۲۰- تجدد امثال | مصنفہ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی۔ | ۲ دو روپے |
| ۲۱- طالب علم کی ڈائری | مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ) | تین روپے |
| ۲۲- مقاصد تعلیم | اے۔ این وہائٹ ہیڈ کی تصنیف ایمس آف ایجوکیشن کا اردو ترجمہ) از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی۔ | پانچ روپے |
| ۲۳- ارتقائے انسانی | (جدید سائنس کی روشنی میں) مولفہ مولانا سید طفیل احمد احمد منگلوری (علیگ) | ۲ دو روپے |
| ۲۴- جمہوریت اور تعلیم (حصہ اول) | جان ڈیوی کی تصنیف ڈیماکریسی اینڈ ایجوکیشن کا اردو ترجمہ۔ از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی۔ | پانچ روپے |
| ۲۵- جمہوریت اور تعلیم (حصہ دوم) | " " " " | " |

| | | قیمت |
|---|---|---|
| ۲۶۔ پُراسرار کائنات، | (سر جیمس جینس کی کتاب میٹرلیس یونیورس کا اردو ترجمہ) از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی | چھ ۶ روپئے |
| ۲۷۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریئے، | مؤلفہ محمد حسین خاں زبیری ایم۔اے (علیگ) | چار ۴ روپئے |
| ۲۸۔ مادری زبان کی تعلیم۔ | مصنفہ پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ایم۔اے۔ | تین روپئے |
| ۲۹۔ ثقافت و انتشار۔ | (میتھو آرنلڈ کی شہرۂ آفاق کتاب کلچر اینڈ انارکی کا اُردو ترجمہ) انعام عظیم برنی۔ ایم۔اے۔ و اخلاص حسین ایم۔اے۔ | چھ ۶ روپئے |
| ۳۰۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ | مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی۔ | دو روپئے پچاس پیسے |
| " " " " " | (انگریزی ترجمہ) از مرزا عاشق حسین ایم۔اے و ڈاکٹر زبید احمد۔ ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی۔ | سات ۷ روپئے |
| " " " " " | (بنگالی ترجمہ) از مولانا غلام محی الدین ایڈیٹر، آزاد، ڈھاکہ۔ | تین ۳ روپئے |

| | | قیمت |
|---|---|---|
| ۳۱۔ علمائے نفسیات اور ان کے افادات۔ | اُردو ترجمہ گریٹ سائیکالوجسٹس، مصنفہ ایس سارجنٹ پی، ایچ۔ ڈی مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی۔ | بارہ روپے |
| ۳۲۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ | مؤلفہ مولوی محمد امین زبیری مرحوم۔ | دو ۲ روپے |
| ۳۳۔ اسلامی نظام تعلیم | مؤلفہ پروفیسر سید احمد رفیق ایم۔ اے۔ | تین روپے |
| ۳۴۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب۔ | مصنفہ۔ ڈاکٹر احسان محمد خاں ایم۔ اے۔ پی، ایچ، ڈی۔ | تین روپے |
| ۳۵۔ گلشنِ بے خار | مصنفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مترجمہ معہ حواشی وتعلیقات از احسان الحق فاروقی۔ ایم۔ اے۔ | بارہ روپے |
| ۳۶۔ خان بہادر خاں شہید | مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام۔ | ایک روپیہ آٹھ آنے |
| ۳۷۔ حیات حافظ رحمت خاں۔ | مؤلفہ سید الطاف علی بریلوی۔ بی، اے۔ (علیگ) | |

# کتب زیر طبع

| | |
|---|---|
| حیات حافظ رحمت خاں | انگریزی ترجمہ حیات حافظ رحمت خاں مؤلفہ سیّد الطاف علی بریلوی - مترجمہ پروفیسر محمد حامد الدین خاں - ایم - اے - |
| ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن | پانچ پانچ سو صفحات کی چار جلدیں (بزبان انگریزی) |

ملنے کا پتہ

سعیدہ منزل، متصل سرسید گرلس کالج

بی روڈ - ناظم آباد - کراچی

# العلم

## آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا
## سہ ماہی رسالہ

زیر ادارت

مشہور ماہر تعلیم اور مصنف و ادیب مولوی سیّد
الطاف علی صاحب بریلوی - بی - اے (علیگ)

---

اس رسالہ میں مملکت پاکستانی کی تعلیمی ترقی اور ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے علمی اور تاریخی مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی علمی و ادبی جدوجہد کے متعلق معلومات درج ہوتی ہیں۔ اور عوام کی واقفیت کو وسیع تر کرنے کے لئے دلچسپ خبریں اور تبصرے ہوتے ہیں۔ چندہ آٹھ روپئے سالانہ۔ کانفرنس کو کم از کم دس روپئے سالانہ چندہ ممبری دینے والے حضرات کی خدمت میں رسالہ مفت پیش کیا جاتا ہے۔